

## مکمل ناول

سب کچھ ویسا ہی تھا، کہیں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ ہرچیز اسی طرح اپنی جگہ پر موجود تھی۔ جو کچھ جب تھا، وہی سب کچھ اب بھی تھا۔ لیکن پھر بھی وہاں سب کچھ ویسا نہیں تھا۔ وہاں ایک کمی تھی۔ بہت بڑی کمی۔ سب سے بڑی کمی۔ وہ اپنے قدموں کو گھسیٹتے ہوئے لاؤنج سے نکل کر ڈائننگ روم میں آئی تو پیچھے لاؤنج سے ایک آواز آئی۔

”کبھی کبھی مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔ محبت کے کھو جانے کا ڈر۔ اس کے چھن جانے کا ڈر۔ پتا نہیں محبت اتنی وہمی کیوں ہوتی ہے۔“ اس نے مڑ کر لاؤنج میں رکھے صوفے کی طرف دیکھا۔

”اوپر اوپر سے غصہ دکھا رہی ہو۔ اندر سے تو خوش

پھر اس نے اس گھر میں قدم رکھا، جس میں وہ زندگی میں دوبارہ کبھی آنا نہیں چاہتی تھی۔ پھولوں سے بھرا وہ خوب صورت لان بہت سونا اور خاموش لگا تھا اسے۔

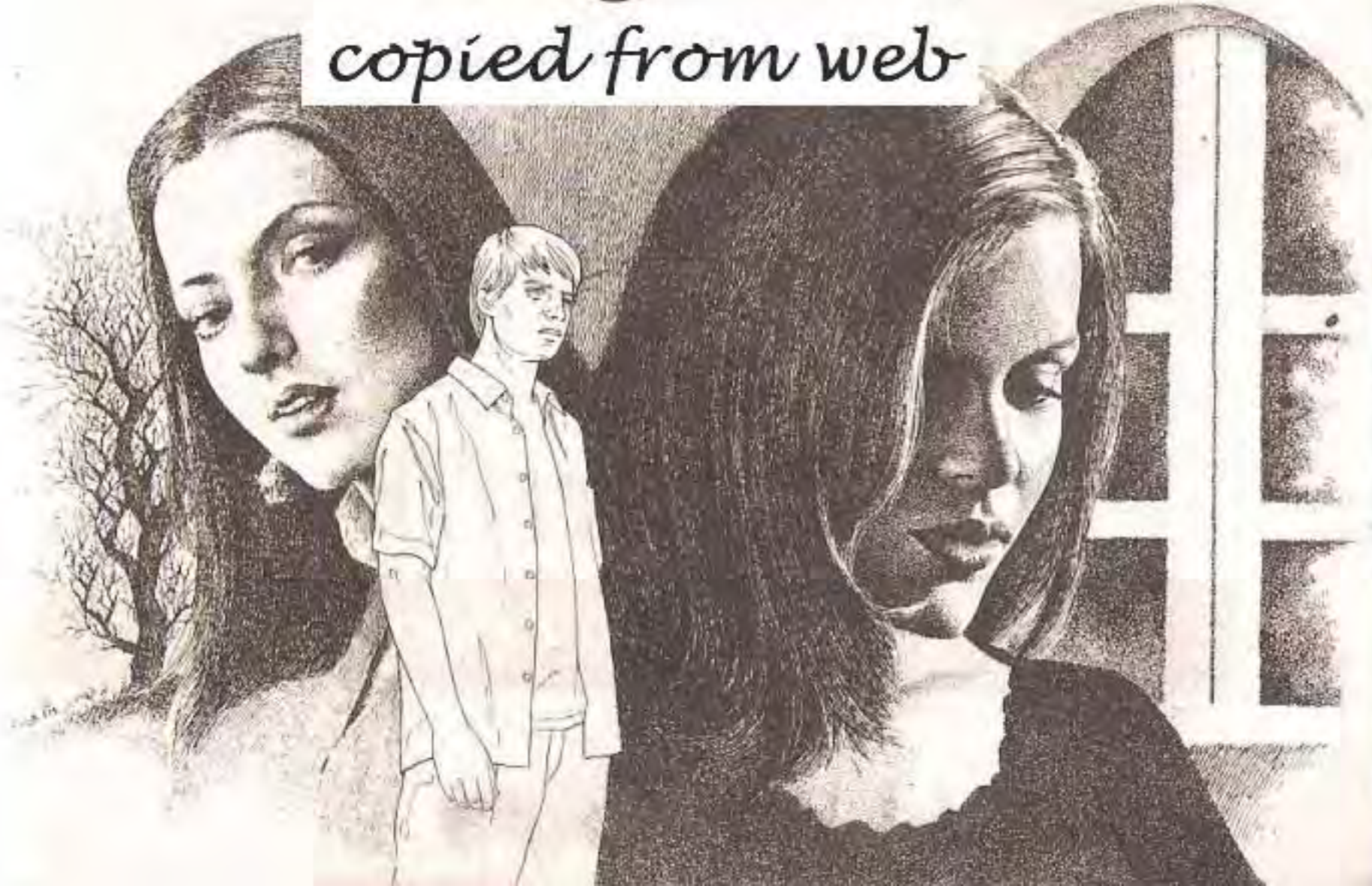
”سنو وہ کہاں ہے؟“ اس نے پھولوں سے بے آواز پوچھا۔ وہ جواب میں بالکل خاموش رہے تھے۔ وہ انتہائی سے جلتے ہوئے گھر کے اندر آ گئی۔

”پہلے سارا گھر تو دیکھ لو۔ تم دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔ میں نے اسے اتنی اچھی طرح سجاایا ہے۔“ اس کے بالکل قریب ایک آواز ابھری۔ اس نے چونک کر اپنے دائیں بائیں دیکھا، وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اس گھر کے انٹیریئر نظریں دوڑا رہی تھی۔ وہاں

## فرحت اشتیاق



copied from web





ہو رہی ہوگی کہ جس بندے کے پیچھے اتنی لڑکیاں ہوں ہیں وہ میرے پیچھے رہا ہے۔" اس نے زخمی نگاہوں سے اس خال صوفے کی طرف دیکھا۔ وہ وجود آج اپنی مخصوص کرسی پر سے غائب تھا۔ اس کے دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ وہ فوراً "ڈائننگ روم" سے نکل گئی۔ سامنے نظر آتے ہیں کی طرف خود بخود ہی اس کے قدم اٹھتے تھے۔

خود ہی بد تیزی کرتی ہو پھر مظلوم سی شکل بنا کر رونے بھی لگتی ہو جاتی ہو۔

"زندگی میں بہت سی باتیں ہمیں ناگوار گزرتی

ہیں۔ مگر کسی ناگوار بات پر اس طرح ری ایکٹ کرنا بالکل مناسب نہیں ہے۔ تمہارے کل کے دوست پر مجھے بہت دکھ ہوا۔" وہ خاموشی سے اسی جگہ کو تنگ رہی تھی۔ آج وہاں کوئی نہیں تھا جو اس سے کہتا۔ "نہیں ہوں بابا میں تم سے ناراض۔ اب کب تک یہ رولی صورت بنائے رکھو گی؟" اس کے دل نے شدت سے دعا مانگی کہ کہیں سے بھی وہ آجائے بالکل اجانک۔ وہ آئے اور آکر اسے حیران کر دے۔ اس نے بچھڑ کر آنکھیں بند کیں پھر وہ بار کھولیں۔ اس کی دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔ وہاں پر کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے رونے کی کوشش کی مگر اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکل رہے تھے۔ وہ رونا چاہتی تھی بہت شدت سے اور چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی۔ مگر رول سے آنکھوں کے اندر رہتے ہوئے آنسو ایک بار پھر چھلنے سے انکاری ہو گئے تھے۔

\*\*\*

"آپ فرست کیوں نہیں آتے ارٹھی بھائی؟" وہ بہت غفلت سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ ہر سال ارٹھی اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن لیا کرتا تھا۔ اب کی بار جب وہ پہلی پوزیشن نہیں لے پایا تو سب ہی کو خفا دکھ ہوا تھا۔ مگر کسی نے اس سے کچھ کہا نہیں تھا بلکہ سب نے اس کا حوصلہ بڑھانے اور دل

جوئی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر صبا وہ یہ بات برداشت کرتی نہیں سکتی تھی کہ ارٹھی غصہ نہیں کسی جگہ ہارے۔ ارٹھی کی کلاس میں دوسری پوزیشن صبا کے لیے ایسا بھی جیسے وہ ہل ہو گیا ہو۔ وہ خود بھی تھوڑا دل برداشتہ سا تھا اسی لیے صبا کا روٹھے لمحے میں کیا جانے والا شکوہ زیادہ ہی شدت سے محسوس ہوا تھا۔

"دیکھا نہیں تھا، تفتی طبیعت خراب تھی ارٹھی کی امتحان کے دنوں میں پیرزے وہ دن پہلے تو بے چارہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آیا تھا اور گھر آکر بھی طبیعت کہاں سنبھلی تھی۔ لیکن اتنی بیماری میں بھی میرا بچہ اتنے اچھے کرپڈز کے ساتھ پاس ہوا ہے۔ کلاس میں دوسری پوزیشن لی ہے۔ میرے لیے تو یہی بہت ہے۔ انشاء اللہ اگلے سال ارٹھی بھی پہلی پوزیشن لے گا۔ ساری لڑکیاں اور تمام سٹیلڈ میرے بیٹے کی ملیں گی۔" اماں سے ارٹھی کی اداس شکل دیکھی نہ گئی تھی۔ جھٹ اس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے بہت محبت سے بولی تھیں۔

ایک دن وہ اس صدمے کے زیر اثر رہا مگر پھر اس نے اپنی اس ناگاہی کو اعصاب پر سوار کرنے کے بجائے نارمل انداز میں دیکھا شروع کر دیا تھا۔

"ہمیشہ جیتنے والے کبھی ہار بھی تو جاتے ہیں اب میں نے مختلف انداز میں سوچنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ میں کبھی نمبر دو بھی ہو سکتا ہوں۔ ضروری نہیں جب جو میں چاہوں وہ مجھے مل بھی جائے۔ کبھی کبھی میرے بہت چاہنے پر بھی مجھے میری پسندیدہ چیز نہیں مل سکتی اور مجھے اسے نارمل طریقے سے لینا چاہیے۔" اس روز اس کو مل جاتے ہوئے ارٹھی نے یہ بات ظفر سے کہی تھی۔

ابھی اس کی عمر اتنی نہیں تھی جتنا وہ بیسیور ہو گیا تھا۔ پتا نہیں ماں کی کمی نے اسے اس وقت سے پہلے بیسیور کر دیا تھا یا پھر اس سوچ نے کہ وہ اس گھر کا بڑا بیٹا ہے۔ جو بھی تھا بہر حال وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھ دار

اور ہر بار تھا۔ جبکہ صبا اپنے بچپن کے دنوں کو پوری طرح انجوائے کرتی بہت صدمی بہت شریر بہت چلندی روٹھتی اور اتنی ہی جلدی مان جانے والی بنی تھی۔ وہ ارٹھی سے سات سال چھوٹی تھی۔ مگر ان دونوں کی آپس میں دوستی بہت تھی۔ ان کی دلچسپیاں اور مشاغل بھی قریب قریب ایک جیسے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ظفر اور ارٹھی کے دوست گھر پر کھیلنے آتے ہوئے ہوتے وہ زبردستی ان لوگوں کے کھیل میں شامل ہونے کی کوشش کرتی تو ظفر ہمیشہ اسے جھڑک کر بھاگوا دیا کرتا۔

"مزید کرکٹ نہیں کھیلتیں۔ تم جا کر اپنی ڈوٹلر سے کھیلو۔" اپنے سے چھ سال چھوٹی بہن کو وہ ذرا کم ہی خاطر میں لایا کرتا تھا۔ وہ منہ بسورتے ہوئے ارٹھی کی طرف دیکھتی تو وہ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ظفر کو نوکے ہوئے اسے کھیل میں شامل کر لیا کرتا ظفر اور باقی دوست منہ بناتے ہوئے اس کا بد شگونی حکم کو سنا کرتے۔

ارٹھی کا اس کے ساتھ بڑا شفقت بھرا دھیما اور بزرگانہ انداز ہوا کرتا تھا۔ کبھی اگر ظفر کسی بات پر صبا کو سخت لمحے میں کچھ کہتا یا ڈانٹ ڈپٹ کرتا تو ارٹھی فوراً اسے ٹوکتا۔

"بھی وہ چھوٹی ہے ظفر! کیا ہو گیا اگر اس نے تمہارا بہن لے لیا۔ استعمال کر کے رکھ دے گی واپس۔" وہ اپنی حمایت کرنے پر ارٹھی کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھنے لگتی۔

"لیکن صبا! بہت بُری بات ہے بغیر پوچھے کسی کی چیز لینا، تمہیں اگر بہن اچھا لگ رہا تھا اس سے لکھنے کا دل چاہ رہا تھا تو تم ظفر سے پوچھ کر لے لیتیں۔"

ظفر کے۔ جانے کے بعد وہ اس کے پاس بیٹھ کر حجت سے سمجھا تا تو وہ اپنی غلط حرکت پر شرمندہ ہوتی آنکھ کسی کی چیز بغیر پوچھے نہ لینے کا وعدہ کر لیتی۔ ارٹھی کے ان ہی رویوں کے سبب وہ اس سے بہت تنگ ہو گئی تھی۔ اپنی ہر بات پر اہم وہ بڑے آرام سے اس

سے ٹسکس کر لیا کرتی تھی۔ وہ بغیر ٹوکے بڑے سکون سے اس کا ہر مسئلہ سنتا اور پھر اس کا کوئی نہ کوئی حل بھی بتا دیا کرتا۔

\*\*\*

وقت کچھ اور آگے بڑھا ارٹھی اور ظفر اسکول سے نکل کر کالج اور کالج سے یونیورسٹی پہنچ گئے۔ لیکن اس کی ارٹھی کے ساتھ دوستی میں کوئی کمی نہ آئی۔ رات کو وہ ارٹھی کے کمرے میں گئی۔ وہ اپنی اسٹڈی میں رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھا پڑھنے میں مصروف تھا۔

"آپ بڑی ہیں میں بعد میں آجاؤں گی۔" وہ اسے مصروف دیکھ کر پلٹنے لگی تھی۔

"کیا کوئی خاص مصروف نہیں ہوں۔ بس صرف آج کے لیچر پر ایک نظر ڈال رہا تھا۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے۔" ارٹھی نے فائل بند کرتے ہوئے اسے جاننے سے روکا۔

"آپ یونیورسٹی میں جو کچھ پڑھ کر آتے ہیں اسے اسی روز یاد بھی کر لیتے ہیں؟" وہ اس کی کرسی کے نیچے پرے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس معصومانہ سوال پر بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"آپ پڑھنے کیوں؟" اسے اس کا ہنسا برا لگا تو منہ پٹھا کر بولی۔

"بس یونیورسٹی کی ایک بات یاد آگئی تھی۔ ہاں پوچھو تمہیں کیا پوچھنا ہے۔" وہ ہنسنے پر تنبیہ کی لائے ہوئے بولا تو اس نے محض اپنا جرح حل کھول لیا۔ "مجھے نیوٹن کا یہ Law سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

For every action there is an equal and opposite reaction

(ہر عمل کا مساوی اور متضاد رد عمل ہوتا ہے)  
"بڑی سیدھی سی بات ہے صبا! خواہ مخواہ نیوٹن نے اپنا نام کیا ہے۔ یہ بات تو کوئی چھوٹا سا بچہ بھی بتا سکتا



ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہیں ایک زوردار تھپڑ ماروں تو تم چوہ میں کیا کرو گی؟" وہ شوشی سے مسکراتا ہوا بولا۔

"آپ مجھے کبھی ماری نہیں سکتے۔" اس نے فوراً یہ بات سنانے سے انکار کر دیا۔

"بھئی فرض کرو۔" وہ اس کے پر یقین انداز پر دیکھنے سے ہنسا۔

"مجھے بہت دکھ ہو گا۔ میں روؤں گی۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے معصومیت سے بولی۔

"چلو رونا بھی ایک رد عمل ہی ہوا۔ مگر میں یہ کتنا چاہ رہا تھا کہ میرے زوردار تھپڑ کے جواب میں تم مجھے اچھے اچھے اتنے ہی زور سے تھپڑ مارو گی۔" وہ کہتے کہتے کچھ سوچ کر شرارت سے مسکرایا۔ "اب دیکھو اگر اماں کو یہ بتا چل جائے کہ ان دھاڑے ان کی کیریاں کون چرا کر کے جا رہا ہے تو وہ اس چور کے ساتھ کیا سلوک کریں گی؟ چور کی چوری ایک عمل تھا اور اماں کی جوابی کارروائی اس عمل کا opposite and Equal ری ایکشن ہو گا۔" مہا اس کی بات پر ہونٹ سی ہو گئی تھی۔ اپنی اتنی مسرت سے کی جانے والی چوری پکڑے جانے پر وہ بہت شرمندہ تھی۔

"بہت مرتبہ تمہیں چپکے چپکے کیوں اٹھاتے ہوئے دیکھا ہے۔" وہ ہنوز مسکراتا تھا۔

"آپ کب کہیں گے کہ چوری کرنا بری بات ہے۔ لیکن ارٹھی بھائی! اماں اور ماما مجھے کیریاں اور اپنی کھانے نہیں دیتیں۔ میری سب دوستیں اتنے مزے لے لے کر اٹلی اور کیریاں کھاتی ہیں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے۔ ماما کہتی ہیں تمہارا گلا خراب ہو جائے گا۔ اب آپ خود بتائیں میں اس طرح چرا کر نہ کھاؤں تو کیا کروں گی؟" وہ معصومانہ انداز میں اپنے عمل کی تائید چاہ رہی تھی۔ ساتھ ہی یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں ارٹھی بھائی اماں کو بتا نہ دیں۔ مگر اس کا یہ ڈر غلط ثابت ہوا۔ ارٹھی نے ان سے کچھ بھی نہ کہا تھا۔

البتہ اسے اتنی اچھی طرح اس حرکت سے منع کیا

تھا کہ وہ فوراً "ہاں جی جی۔" نصیحتیں سننا تو کسی کو بھی اچھا نہیں لگتے۔ پھر وہ بار بار سال کی سب نصیحت سنائیے پسند کر سکتی تھی۔ لیکن ارٹھی کا نصیحت کرنے کا انداز اتنا اچھا ہوا کہ اتنا تھا کہ اسے اس کا نصیحت کرنا اور کسی بات پر کچھ سمجھنا بھی کسی برا نہیں لگتا تھا۔

"تھپڑ کر تو ہم وہ کام کرتے ہیں مہا! جس کے بارے میں ہمیں پتا ہوتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ ماما ہمیں اس لیے منع کرتی ہیں کہ پھر اگر تمہارا گلا خراب ہو گیا اور تم بیمار ہو گئیں تو سب سے زیادہ پریشانی بھی تو ان ہی کو ہو گی۔ ویسے بھی کبھار اس طرح کی چیزیں کھانے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ میں ماما سے کہوں گا کہ مہا کو کبھی کبھی اس کی پسند کی اوث پٹانگ چیزیں کھانے دیا کریں۔"

اس صبح وہ یونیورسٹی کے لیے تیار ہو کر نیچے آیا تو لاؤنج میں اماں اور مہا بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اسکول یونیفارم پہنے۔ اماں سے اپنی چوٹی پوچھ رہی تھی۔ اپنے لیے ہالوں سے سخت الجھن ہوئی تھی۔ کئی مرتبہ وہ ماما سے اس بات پر جھگڑا کر چکی تھی مگر ماما ورت ہی اماں دونوں میں سے کوئی بھی اسے ہل کھانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

"بے وقوف! بے ہالوں میں تو اصل خوب صورتی ہوتی ہے۔" وہ اسے سمجھایا کر تھیں۔ وہ حیران ہوئی کہ ان فضول لیے ہالوں میں اماں اور ماما کو خوب صورتی کہاں سے نظر آیا کرتی تھی۔ اس کے لیے تو یہ خوب صورتی ویل جانے لگی۔

ماما مصروف تھیں وہ اماں کے پاس۔ آؤ جی جی لیکن اسے ان کی بھائی چوٹی پسند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اماں کی بنائی چوٹی کھول دی تھی اور اماں اس کے غروں پر سخت برہم نظر آ رہی تھیں۔

"پر حالے میں اتنا دم کہاں سے لاؤں کہ تمہاری ماں جیسی کسی ہوئی۔ تمہارے مطلب کی پٹیا باندھ سکوں۔" وہ دونوں ابھی ہوئی تھیں۔

"لاؤ مہا! میں بنا دوں۔" اخبار ایک طرف رکھتے

ہوئے ارٹھی نے اچانک اپنی خصلت پیش کیس تو اماں کے ساتھ ساتھ مہا بھی اس پیش کش پر بری طرح حیران ہوئی۔

اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ بھئی۔ اتنی دیر سے میں اماں کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ تو برا آسان سا کام ہے۔"

اماں! مہا پر غصے کے باوجود بھی ارٹھی کی اس انوکھی پیشکش پر ہنسنے لگی تھیں۔ جبکہ وہ اماں کے ہاتھ سے برش لے کر ارٹھی کے پاس آ گئی تھی۔ اماں ہنسنے ہوئے اس دلچسپ سی پیشکش کو دیکھ رہی تھیں۔ ارٹھی اوپر صوفے پر برش لیے بیٹھا تھا اور مہا اس کے پیروں کے پاس گارہٹ پر۔

"گتے لیے ہل۔ مہا! تم ان میں کیا ڈالتی ہو۔ میرا مطلب ہے کون سی گھاڑ؟" وہ اس کے گھنے ہالوں کو حتمی حصول میں تقسیم کرتے ہوئے جب سے بولا۔ وہ ابھی جواب دینے کے لیے لب کھولنے ہی والی تھی کہ اچانک ایک زوردار جھج اس کے حلق سے نکلے۔

"کیا ہوا؟" ارٹھی اس کے جھجے پر حیران ہو گیا۔

"اتنے زور سے میرے ہالوں کو پیچھا ہے اور پھر پوچھ رہے ہیں کیا ہوا۔" اس نے کرون موڈ کر شکایتی انداز میں کہا۔

"ابھی تم خود ہی تو اماں سے کہہ رہی تھیں کہ بالکل بات سی چوٹی بنا میں۔"

"ہاں لیکن یہ تھوڑی کما تھا کہ ہالوں کو جڑ سے ہی اکھاڑ دیں۔" وہ جواباً "مارٹھی سے بولی۔

"آپ ٹھیک ہے؟ آپ تو تکلیف نہیں ہو رہی؟"

اس نے ہالوں کو ذرا ہلکے ہاتھ سے پکڑتے چوٹی میں پسیا ہل ڈالتے ہوئے پوچھا۔ مہا نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"ہاں میں یہ کیا ہو رہا ہے؟" لاؤنج میں آتا ہوا ظفر اس حیرت انگیز منظر کو دیکھ کر دوڑ سے ہی چلا آیا۔

"مہا کو اماں کے ہاتھ کی چوٹی پسند نہیں آ رہی تھی اس لیے۔"

"اس لیے تم نے مہا کے پیٹو اسٹائلسٹ کی ڈیوٹی

سنبھال لی۔" ظفر نے اس کا جملہ کاٹنے ہوئے برجستہ کہا۔

"بات کرتا ہوں میں آج بابا سے۔ کہوں گا آپ ناخن اٹھاتے بیٹے کی تعلیم پر اتنا پیسہ خرچ کر رہے ہیں۔ وہ موصوف تو مستقبل میں پوٹی سیلون کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" ارٹھی اس کے مذاق اڑانے پر پریشانے بغیر اپنے کام میں مشغول رہا۔

"تھینک یو ارٹھی بھائی! اتنی اچھی طرح محسوس کر چوٹی باندھتی ہے آپ نے اب سارا دن میرا آرام سے گزار جائے گا۔" ارٹھی نے سات آٹھ میل دے کر ہال اس کے حوالے کیے تو وہ جلدی جلدی چوٹی میں ہل ڈالتے ہوئے بولی۔

"آپ تو میں روزانہ آپ سے ہی چوٹی بنوایا کروں گی۔" اپنی کمر سے بھی نیچے آئی ہوئی چوٹی کو جیتا لگاتے ہوئے اعلان کیا تو ارٹھی ہالوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

ڈی ڈی وی کا مشہور پروگرام

# کھانا خزانہ

نیا ایڈیشن

سنجیو کپور

خوبصورت تصاویر کے ساتھ

حسین و خوبصورت گیٹ اپ

قیمت صرف = 250/- روپے

لے کا پتا:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی



"میں ہا ہا ہاں" آج کے لیے سو رہی۔  
 "اور اپنے لہلہٹے کا مظاہرہ کرو ان محترمہ کے سامنے اب مشکل ہی ہے کہ یہ بلا تمہارا پیچھا چھوڑ دے۔" وہ اپنے لیے "ہا ہا ہا" کا لفظ سنتے ہی ظفر سے لڑنے مرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ یونہی لڑتے جھگڑتے وہ لوگ ناشتے کے لیے ڈانٹنگ روم میں آ گئے۔  
 "تج تو ہماری مہمانجی ہی صبح بڑی خوش نظر آ رہی ہیں۔" ظفر نے بتائیں کس بات سے یہ اندازہ لگایا تھا۔  
 "بہت صحیح اندازہ لگایا ہے آپ نے برخوردار۔" ڈیڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 "اس کا رات فون آیا تھا۔ وہ لوگ اگلے ہفتے پاکستان آرہے ہیں۔" ڈیڈی نے اب کی بار ماں کو مخاطب کیا تھا۔ مہمانجی بے تحاشا خوشی کا سبب صبا سمیت سب ہی کی فورا "بھہ" میں آیا تھا۔  
 "اس ماموں آرہے ہیں یعنی کہ شہزادہ پاکستان آ رہی ہے۔" اس نے دل میں بے حد خوشی محسوس کرتے ہوئے سوچا تھا۔ سال ذرا پہلے میں وہ لوگ پاکستان کا ایک چکر ضرور لگایا کرتے تھے۔ شہنشاہ اس گھر کے ہر فرد کے لیے بہت زیادہ اہم تھے۔ مگر ماما اور ڈیڈی کے لیے وہ باقی سب لوگوں سے کچھ زیادہ اہم تھی اور وہ اہم کہیں نہ ہوتی۔ وہ شفیق علی اور یلین شفیق کی سگی بیٹی تھی۔ اولاد کوئی ہانٹنے والی چیز نہیں مگر بعض اوقات حلاوت اور واقعات ایسا رخ اختیار کرتے ہیں کہ انسان کو بہت سے کام چل نہ چاہتے ہوئے بھی گرنے پڑ جاتے ہیں۔  
 یلین شفیق کے لیے ان کا بڑا بھائی صرف بھائی ہی نہیں بلکہ باپ کی طرح تھا۔ جس نے ماں باپ کے مرنے کے بعد بہن کا ہر طرح خیال رکھا۔ اسے کبھی ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اور پھر جب بہن کی شادی کا وقت آیا تو اس کے لیے ایک بہترین گھرانے اور بہترین شریک سفر کا انتخاب کر کے اپنے سب فرائض بڑے احسن طریقے سے ادا کر دیے۔  
 شفیق علی اس کے بہت قریبی دوست تھے۔ چیتھی بہن کی شادی اپنے عزیز ترین دوست سے کر کے انہوں

نے دوستی کے تعلق کو رشتہ داری میں بدل کر اسے مزید مضبوط کر لیا تھا۔ خدائے یلین کو جتنا اچھا بھائی دیا تھا اتنی ہی اچھی بھانجی بھی دی تھی۔ ہر کسی کے دکھ وہ میں کلام آنے والی بڑی مفسد اور خوش مزاج مگر جملے رب کی اس میں کیا مصلحت تھی کہ وہ دونوں محبت کرنے اور محبت ہانٹنے والے لوگ اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ کوئی امید ہو تو انسان دعا میں مانگے "بھجیوں کا انتظار کرے۔ وہاں تو کوئی امید بچی ہی نہیں تھی۔ پہلی پریکٹس میں ہی کچھ ایسی وحید کی ہوئی تھی کہ اب وہ دوبارہ بھی ماں میں بن سکتی تھیں۔ یہ بہت بڑا صدور تھا۔ ان کی برداشت اور حوصلے سے بھی بڑا۔ ہر وقت روتی رہتیں۔ شوہر کی تسلیاں دلا سے سب انہیں بے معنی لگا کرتے۔ ان کی حالت دیکھتے ہوئے ڈاکٹرز نے اس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ کوئی بچہ گوڑے لیں۔ انہیں خود بھی اولاد کی بہت خواہش تھی۔ یوپی سے بھی بہت محبت تھی۔ مگر اس سب کے باوجود بھی کسی پر اسے بچے کو اپنا بچہ بنانے کے لیے وہ کسی طور راضی نہ ہوتے تھے۔ یلین بھائی اور بھانجی کے اس غم پر بہت دہمی ہوتی تھیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس طرح وہ اپنے جان سے پیارے بھائی کی زندگی سے اس کی کو دور کر دیں اور ایسے ہی ایک جذباتی سے لمحے میں وہ بھانجی سے یہ وعدہ کر بیٹھی تھیں کہ اس بار ان کے ہاں بیٹیا یا بیٹی جو بھی ہو وہ اسے ان کی گود میں ڈال دیں گی۔  
 شہنشاہ کے پیدا ہونے پر جب بھانجی انہیں ان کا وعدہ یاد دلانے آئیں تو ان کا دل اندر ہی اندر کانپ کر رہ گیا۔ "تمہارے پاس تو ظفر ہے یلین! تمہارا بیٹا" اور اس کے بعد بھی تم وہاں رہاں بن سکتی ہو جبکہ میرے پاس تو ایسی کوئی امید ہی نہیں ہے۔ کسی اور کے بچے کو اس کبھی گود لینے پر راضی نہیں ہوں گے۔ شہنشاہ کی بھانجی ہے۔ ان کا خون۔ اسے تو وہ دل و جان سے قبول کریں گے تم مجھے خود غرض سمجھ لو یا جو بھی۔ بس شہنشاہ مجھے دے دو۔" وہ یلین کے چہرے پر نظر آتے انکار کو دیکھ کر دھتے ہوئے لپٹی تھیں۔ روٹا اور گڑ گڑانا صرف

یلین ہی کا نہیں بلکہ شفیق کا دل بھی موم کر گیا تھا۔  
 دل پر بہت بھاری پھر رکھ کر یلین نے اپنی بیٹی باپ جیسے بھائی کے اور شفیق نے اپنے عزیز ترین دوست کے سپرد کر دی تھی۔ شہنشاہ ایک سال کی تھی جب اس کو آسٹریلیا میں ایک بہت اچھی جاب آفر ہوئی اور یوں وہ لوگ سفری طے گئے۔ شہنشاہ بہت خوش تھی۔ وہ جب یہاں آئی تو بالکل مہمانوں کی طرح ان لوگوں سے الگ تھلک رہا کرتی کہ شہنشاہ کے دو سال بعد ہی اللہ نے ان کی جھولی میں صبا ڈال دی تھی۔ ظفر اور صبا کے ہونے کے باوجود ماما اور ڈیڈی شہنشاہ کی بڑی شدت سے محسوس کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی یلین کا ہاتھ لگا کر وہ بھائی سے اپنی بیٹی واپس مانگ لیں۔ حالانکہ وہ لوگ اسے کتنے ناز و نعم میں پال رہے تھے۔ جہاں وہ قدم رکھتی ان دونوں کا بس نہیں چلتا تھا۔ پاپا اور ماما۔ اس نے چھ سال کی عمر میں ہی یہ بات شہنشاہ کو بتادی تھی کہ وہ اس کے ماموں مہمان ہیں اور یہ کہ اس کے بچے ماں باپ وہ ہیں۔ جن سے وہ لوگ ہر سال ملنے پاکستان جاتے ہیں۔ اس قسم کے ساتھ ساتھ ظفر اور صبا کبھی اس کے لیے گزربھی حیثیت رکھتے تھے۔ صبا نے اپنی بہن کے لیے ہمیشہ ہی دل میں بہت شدید محبت محسوس کی تھی۔



شہنشاہ اس ماموں اور مہمانی کے ساتھ کراچی آ گئی تھی۔ اس کا آنا میل سب کے لیے کچھ ایسا تھا جیسے کسی دور دیس کی شہزادی نے ان کے گھر میں قدم رکھ دیا ہو۔ ماما اور ڈیڈی کے ساتھ ساتھ اہل "پاپا اور صبا" کے لیے بھی وہ بڑی خاص شخصیت کا وجود رکھتی تھی۔ یعنی اپنائیت کا اظہار یہ لوگ کر رہے تھے۔ شہنشاہ جو اس میں کسی اپنائیت کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔ وہ شاید کبھی ہی بہت کم کو اس کا ہنپنا یا اس کا ہانپنا کرتی تھی۔ اور ظفر بھی اس سے زیادہ بات چیت نہیں کرتے تھے۔ صبا کا البتہ بڑا دل چاہتا تھا کہ وہ شہنشاہ کے ساتھ خوب ساری باتیں کرے۔ اسے فاصلوں اور

دوری نے ان کے درمیان بے تکلفی اور اپنائیت پیدا نہیں ہونے دی تھی۔ لیکن ان کا آپس میں جو رشتہ تھا وہ تو ایک اٹل حقیقت تھی۔  
 "صرف لڑائی جھگڑوں میں ہی چیز ہے ہماری صبا یا پڑھائی میں بھی کچھ کارنامے انجام دے رہی ہے؟" اس روز کھانے کی میز پر اس ماموں نے اس سے پوچھا۔ ظفر کے ساتھ ہونے والے اس کے معرکوں اور بقول ماں کے "تفشی" کی طرح چلتی ہوئی زبان کو دیکھ کر صبا "انہوں نے یہ سوال کیا تھا۔  
 "صبا شفیق ہر کلام میں اچھی ہے ماموں!۔" اس نے غریب انداز میں جواب دیا۔ اس ماموں اس کے جواب پر ہنستے ہوئے ظفر اور انہی سے بھی ان کی پڑھائی کے بارے میں باتیں کرنے لگے تھے۔ ممان لوگوں کی باتوں سے لا تعلق شہنشاہ کے لڑا اٹھانے میں مصروف تھیں۔ اصرار کر کر کے وہ مختلف ڈشز اس کے آگے رکھ رہی تھیں۔ سارا سال وہ ان دنوں کا انتظار کرتی تھیں جب شہنشاہ ان کے پاس ہوتی تھی۔ یہ تھوڑے سے دن کتنی جلدی گزر جاتے تھے اور اب کی بار تو ان لوگوں کا قیام ہمیشہ سے بھی زیادہ مختصر تھا کیونکہ شہنشاہ کی خواہش پر اس ماموں اسے معرکہ ہانٹنے لے جا رہے تھے۔ چند دن کراچی میں گزار کر ان لوگوں کو قاہرہ جانا تھا۔  
 شہنشاہ نے صبا کو بتایا تھا کہ اس نے اپنی ہسٹری کی کتاب میں معرکہ کے بارے میں کافی کچھ پڑھا ہے اور اسی وجہ سے اسے وہاں جانے کا بہت شوق ہے۔ اس نے حسرت سے شہنشاہ کی طرف دیکھا۔ صرف چھوہ سال کی عمر میں پتا نہیں اس نے کیا کیا بدھ ڈالا تھا۔ کم از کم صبا کو تو ہسٹری میں قطعاً "کوئی کچھ نہیں تھی۔" اس ماموں سے باتوں کے دوران ہی یہاں سے یہ انکشاف کر کے کہ وہ انہی کو آئرز کے بعد مزید تعلیم کے لیے لندن بھیجے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ صبا کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ ایسی کوئی بات اس سے پہلے تو اس کے علم میں کبھی نہیں آئی تھی۔ انہی کا انداز بھی ایسا تھا جیسے وہ اس بات سے پہلے سے باخبر تھا اور یقیناً ہے۔



حد خوش بھی وہ کھانے کے بعد اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں آئی۔  
 ”آپ نے بھی مجھے بتایا بھی نہیں کہ بابا آپ کو رخصت کے لیے باہر بھیجے والے ہیں۔“ وہ اندر آتے ہی شکاری انداز میں بولی۔  
 ”اس بارے میں پہلے سے کیا شور مچاتا۔ اس ایک روز بابا نے پوچھا کہ کیا تم لندن جا کر رخصت میں انٹرسٹ ہو اور میں نے ہاں کہہ دی اور پھر صبا! ابھی تو میرے جانے میں بہت وقت بڑا ہے۔“ اس نے حسب معمول بڑی نرمی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔  
 ”آپ مت جائیں ناں ارٹھی بھائی! پاکستان میں رہ کر بھی تو رہائی کی جا سکتی ہے۔“ وہ اس کے بچکانہ سے اصرار پر اٹھتی سے ہنس۔  
 ”ابھی تو اس سب میں بہت دن پڑے ہیں۔ تم کیوں بلاوجہ اس بات کو سر پر کر رہی ہو۔ جاؤ جا کر شمن کو کہنی دو۔ وہ اتنی دور سے تم سے ملنے آئی ہے۔“ ارٹھی نے رسوائیت سے کہا وہ ارٹھی کے سمجھانے پر وقتی طور پر ہل گئی تھی۔ دوسرے یہ بات بھی ذہن میں تھی کہ جب جانے کا وقت آئے گا تو میں انہیں جانے نہیں دوں گی۔ ہمیشہ کی طرح شمن تھوڑے سے دن رہ کر واپس چلی گئی۔ کتنے دنوں تک ممانیت بے بات اس کا ذکر کر کے روٹی رہی تھیں۔



”ابھی تو تم یہاں ہو۔ میں سارے گھر میں تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔“ ظفر نے کہن میں آتے ہوئے ارٹھی کو مخاطب کیا تھا۔  
 ”ہاں میں اور صبا مل کر چن کر چن کر رہے ہیں۔ آج تو تم بھی تمہاری بھی دعوت کر دیتے ہیں۔ کیا یاد کرو گے تم بھی۔“ اس نے سر کھٹا کر ظفر سے کہا۔  
 ”سو ٹھیک کے لیے نہیں چل رہے؟ میں تو تمہیں اسی لیے ڈھونڈ رہا تھا۔“ ظفر اور ارٹھی اکثر سو ٹھیک کے لیے شام میں ایک ساتھ ہی جایا کرتے تھے۔

”مہو تو تھا میرا جانے کا۔ لیکن اب صبا سے چن کر ایک ہفتے کا وعدہ کر لیا ہے تو وعدہ پورا بھی کرنا پڑے گا۔“ وہ خاموشی سے کھڑی ارٹھی اور ظفر کی گفتگو سن رہی تھی۔ ظفر اس کے انکار پر کندھے اڑکا تا کہ اس سے باہر چلا گیا اور وہ دونوں ایک مرتبہ پھر چن کر ایک ہفتے میں مصروف ہو گئے تھے۔  
 اسے خود تو جانتا نہیں آتا تھا وہ تو بس ارٹھی کو حکم کرتے ہوئے دیکھے جا رہی تھی اور خود ارٹھی ذہن پر زور ڈال کر ”اب کیا کرتا ہے؟“ اور ”کیا والا ہے؟“ کا ورد کے جا رہا تھا۔ بڑی کوششوں اور جان توڑ محنت کے باوجود بھی جو چیز تیار ہوتی تھی اسے چن کر ایک کے علاوہ سب کچھ کما جاتا تھا۔ وہ خود ہی اپنے بنائے ہوئے اس بجوبے کا مذاق اڑاتے اور منہ بناتا کر اسے کھانے میں پیش پیش تھا۔ صبا چن کر ایک کے بارے میں اس کے دلچسپ مہجوں کو انجوائے کر رہی تھی۔  
 ارٹھی اکثر یونیورسٹی سے سیدھا بابا اور ڈیڈی کے پاس آفس چلا جایا کرتا تھا۔ بابا چاہتے تھے کہ دو دن تعلیم ہی ارٹھی بڑس کے ادارہ چھوڑ کر عملی زندگی کی دشواریوں سے آگاہ ہو جائے اور انہیں حل کرنا بھی سکھ جائے۔ چاہتے تو وہ یہ تھے کہ ظفر بھی ارٹھی ہی کی طرح آفس آیا کرے لیکن ظفر کو بڑس میں ذرا ابھی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ فزکس میں آنرز کر رہا تھا اور اپنے متعلقہ مضمون کے علاوہ اسے کسی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ بابا اور ڈیڈی دونوں ہی بچوں پر روک لوگ اور پابندیاں لگانے کے خلاف تھے۔ ڈیڈی کی کتنی شدید خواہش تھی کہ ظفر ایم ایل۔ اے کرے لیکن جب اس نے فزکس میں ماسٹر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے اسے خوشی خوشی اجازت دے دی۔  
 ارٹھی کا آنرز مکمل ہوتے ہی بابا نے اس کے لندن جانے کے تمام انتظامات مکمل کر دیے تھے۔ وہ لندن اسکول آف اکنامکس (School of Economics) at London school آف اکنامکس میں M.S.C کرنے جا رہا تھا۔  
 صبا اس کے جانے کا سن کر بہت روٹی تھی۔ وہ اسے

روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔  
 ”آپ مت جائیں ارٹھی بھائی! آپ چلے گئے تو پھر مجھے تنہا کون پرھائے گا اور سڑی میں ہوائی ساری ڈشیں یاد کرنی پڑی ہیں وہ کون یاد کروائے گا۔“ وہ ارٹھی کا ہاتھ پکڑ کر ملتھیانہ لہجے میں بولی۔ اس وقت لاؤنڈن میں ماں ”مما اور ظفر بھی مہجوتے۔“ ارٹھی اس کے کندھے پر چار سے ہاتھ رکھ کر بددھاری سے سمجھانے لگا۔  
 ”میں پر اس نے کر چاہوں گا ظفر سے۔ وہ تمہیں ڈانٹے گا بھی نہیں اور پر صبا میں پہلے ہی کیا کرے گا۔“ مگر وہ اس کی کوئی بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔  
 ”اور صبا! میں کوئی ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہا ہوں۔ تم دیکھنا اتنی جلدی دو سال گزریں گے اور میں واپس تم لوگوں کے پاس آجائوں گا۔“ وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے یقین دلانے لگا۔  
 ”ہاں اگر وہاں کسی سیم نے انہیں اپنے چنگل میں نہ پھنسا لیا تو۔“ ظفر نے بڑی برحسبی سے کہتے ہوئے ایک نظر ماں کے چہرے پر ڈالی۔  
 ”میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔“ ماں نے بڑے یقین اور اطمینان سے کہا تھا۔ ”یعنی یہ طے ہے کہ آپ جائیں گے ضرور۔ میرے روکنے سے بھی نہیں رکھیں گے۔“ وہ ”آتش کو مضموع تبدیل ہو تا دیکھ کر چڑھتے ہیں سے بولی۔ ارٹھی نے بڑی بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ناراض کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا ہاتھ تھا۔ ”آکھوں میں آنسو اور ناراضی لہجے بیٹھی تھی۔  
 ”صبا! کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تمہارے ارٹھی بھائی خوب سارا پڑھیں؟“ ”مما نے اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے پیار سے پوچھا۔  
 ”دل تو چاہتا ہے ماما مگر۔“ لیکن ممانے اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی تھی۔  
 ”اگر مگر کچھ نہیں، کبھی کبھی اپنے بہت پیاروں کو ان کی بہتری اور فائدے کے لیے خود سے دور بھیجنا پڑتا

ہے۔ اگر تمہیں ارٹھی سے پیار ہے تو پھر تمہیں اسے خوش خوشی رخصت کرنا ہو گا۔“ ارٹھی نے تنقید آمیز نظروں سے ماما کی طرف دیکھا تھا۔ اپنی اس تیرہ سال کی نٹ کھٹ اور ضدی کی لڑن کو جو بات وہ نہیں سمجھا رہا تھا وہ ممانے سمجھاؤں تھی۔  
 ایئر پورٹ پر جب وہ سب لوگ ارٹھی کو الوداع کہنے آئے تو وہ پگلس جھپکا جھپکا کر اپنے آنسو روک رہی تھی۔  
 ”میں تمہیں یاد دہانی سے خط لکھا کروں گا صبا! اور فون بھی بہت جلدی جلدی کیا کروں گا۔“ پگلس پکا پر اس کر رہا ہوں۔ ”وہ اس کا ہاتھ تھام کر محبت بھرے انداز میں بولا۔  
 ”آپ وہاں پر بھی ہمیشہ فرسٹ پوزیشن لیا کیجئے گا ارٹھی بھائی! جیسے پہلے ہی لیتے تھے۔“ اس کی آنکھوں سے ایک دم ہی آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے۔ اسے روٹا دیکھ کر ماں کو بھی رونے کا بہانہ مل گیا تھا۔  
 ”کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو۔ وہ جنگ لڑنے تو نہیں جا رہا۔ بجائے ہنسی خوشی اسے رخصت کرنے کے آپ لوگ آنسوؤں کے ساتھ رخصت کر رہے ہیں۔“ ڈیڈی نے فوراً سوال کو ٹوکا۔  
 پھر وہ چلا گیا تو جیسے اپنے ساتھ ساری رونقیں بھی لے گیا۔ وہ دن میں کتنی مرتبہ اسے یاد کر کے رویا کرتی تھی۔ پڑنے بیٹھتی اور کوئی چیز سمجھ میں نہ آتی تو جھٹ رونا شروع کر دیا کرتی۔ حالانکہ ارٹھی کے جانے کے بعد ظفر اس کا بہت خیال رکھتے لگا تھا۔ پابنت ڈیڈی اور ڈیڈی جھگڑا ابھی بہت کم کر رہا تھا لیکن ارٹھی کی کمی تو کوئی بھی پوری کر ہی نہیں سکتا تھا۔ فون پر ارٹھی سے زیادہ تفصیلی بات نہیں ہو پاتی تھی لیکن وہ اسے خط خوب لہجہ ڈال لکھا کرتی تھی۔ ظفر اس کے خطوط کی لمبائی جو ڈیڈی کا بہت مذاق اڑاتا تھا۔  
 اس رات وہ ارٹھی کو خط لکھتے بیٹھی تھی۔ ڈیڈی ساری باتوں کے بعد جب اس نے ہمیشہ کی طرح خط کے اختتام میں ”جیلے تحریر کیے۔“  
 ”ارٹھی بھائی! میں آپ کو بہت مہم کرتی ہوں۔“



بے طرح رویا کرتی تھی۔ لیکن اپنے کمرے میں سب سے چھپ کر۔ اب جب وہ اسے یاد کر کے روتی تو اس کا دل چاہتا کہ کسی اور کو اس کے رونے کا پتہ نہ چلے۔  
ار تفضی کا ایم ایس سی کا پہلا سال مکمل ہو گیا تھا۔ بابا نے اس سے چھٹیوں میں پاکستان آنے کے لیے کہا سب ہی کا اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کا بہت دل چاہ رہا تھا۔

لیکن ار تفضی نے اگلی فون کال پر اماں اور بابا سے اپنے دوستوں کے ساتھ آسٹریلیا جانے کی اجازت مانگنی تھی۔ اماں اور بابا دونوں ہی نے اسے فوراً اجازت دے دی۔

”اسٹوڈنٹ لائف کی یہ بے فکری پھر اسے کہاں ملے گی۔ اچھا ہے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ زندگی کی خوب صورتیوں کو انجوائے کرے۔ ہمارے پاس تو پھر اسے ہمیشہ ہی رہنا ہے۔“ بابا نے فون رکھنے کے بعد ڈیڈی کو ساری بات بتاتے ہوئے کہا۔

اسے ار تفضی کے نہ آنے کا سن اتنا دکھ ہوا تھا کہ وہ اس رات کتنی دیر تک تکیے میں منہ چھپائے روتی رہی تھی۔ وہ ار تفضی سے بری طرح ناراض ہو گئی تھی۔ ار تفضی آسٹریلیا میں اپنے دوستوں کے ساتھ چھٹیاں انجوائے کرنے کے بعد واپس لندن آ گیا اور واپس آ کر اس نے گھر پر سب سے فون پر بات کی تو اس نے بات نہیں کی۔

”تم بات نہیں کرو گی؟“ ظفر نے اسے صوفے پر الگ تھلگ سے انداز میں بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر سامنے پڑا میگزین اٹھا لیا تھا۔ لیکن وہ اپنی یہ خود ساختہ ناراضی زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ پائی تھی۔ اس روز اماں نے ار تفضی کو فون کیا تو ان کے بات ختم کر لینے کے بعد اس نے ریسیوران کے ہاتھ سے لے لیا۔

”کیا سڈنی کا ساحل کراچی کے ساحل سے زیادہ خوب صورت ہے؟“ سلام دعا کے فوراً بعد اس نے روٹھے لہجے میں شکوہ کیا تھا۔

”ہاں خوب صورت تو ہے۔“ وہ اس کا شکوہ سمجھنے

مجھے آپ کے بغیر گھر میں بالکل مزا نہیں آتا۔ آپ بس جلدی سے واپس آجائیں۔“ لکھتے کے ساتھ ہی اسے پتا نہیں کیوں خود ہی اپنے لکھے ہوئے جملوں پر اعتراض ہوا۔ اس نے وہ پورا صفحہ پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا، لیکن وہ خود ہی اپنی اس حرکت پر بہت حیران تھی۔

اپنے لکھے جملوں میں آخر اسے کیا بات نامناسب لگی تھی جو اس نے اسے کاٹ دیا۔ وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھی اور مسلسل اپنے آپ پر حیران ہوئے جا رہی تھی۔ اپنے رویے کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے خود اپنے بارے میں بعض ایسی باتیں پتا چلیں جن پر ابھی تک اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ ار تفضی کا فون آنے پر اس سے بہت سنبھل کر اور سوچ سمجھ کر باتیں کرنے لگی تھی۔ پہلے کی طرح بے دھڑک اور بے جھجک اپنے دل میں موجود ہر بات نہیں کہتی تھی۔ اس کے فون کا اسے پہلے ہی کی طرح بڑی بے چینی سے انتظار رہا کرتا تھا۔ اس کے خطوط کا وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے انتظار کرنے لگی تھی۔ دن میں کئی کئی مرتبہ جا کر لیٹر بکس چیک کرتی کہ اس کا خط آیا یا نہیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں اب وہ اس سے پہلے جیسی بے تکلفی سے بات نہیں کر پاتی تھی۔ ار تفضی کا انداز تو پہلے جیسا ہی ہوا کرتا تھا لیکن صبراً اب شاید بڑی ہو گئی تھی۔ یہ اس کا اسکول میں آخری سال تھا۔

جب اسے ار تفضی سے جھجک محسوس ہونی شروع ہوئی تھی وہ اب گھر والوں کے سامنے بھی اس کا ذکر سوچ سمجھ کر کرنے لگی تھی۔ پتا نہیں ار تفضی نے اس تبدیلی کو محسوس کیا تھا یا نہیں مگر خود اس نے تو اپنی اس تبدیلی کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ اب وہ خود پر حیران ہوتی تھی کہ کیسے ار تفضی کے جانے پر اس نے ننھے بچوں کی طرح رونادھونا مچایا تھا۔ وہ اب بھی اسے پہلے کی طرح شدت سے یاد آتا تھا۔ اب تو وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اب بھی اسے پہلے کی طرح شدت سے یاد آتا تھا وہ اب بھی اسے یاد کر کے



کے پلو جو سنجیدگی سے بولا۔ وہ مذاق بھی بیش بڑی سنجیدگی کے ساتھ کیا کرتا تھا۔

”وہاں کی ہر چیز خوب صورت ہے۔ وہاں کے ساحل وہاں کا قدرتی حسن وہاں کی آب و ہوا۔“ وہ اس کے بچے کی شرارت سمجھ نہیں پاتی تھی۔ اسی لیے اس بات پر اپنے دل میں مزید دکھ محسوس کیا۔

”آخری ساری خوب صورتیوں کے پلو جو مجھے وہاں خوب صورتی نظر نہیں آ رہی تھی اس لیے کہ وہاں صبا شفیق نہیں تھی۔“ ایک سینئر کا ڈرامائی وقفہ دے کر اس نے ہنسنے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”اگر آپ آج آجائے تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ کوہ اتنے دنوں بعد سب گھروالے اکٹھے ہوتے تھے۔“

”کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ لیکن یار ابھی کھیار دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کا بھی تو دل چاہتا ہے نا اور تپا ہے تمہیں میں وہاں اس انگل کے گھر بھی گیا تھا۔ ممانے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ سٹنی جا رہے ہو تو اس انگل کے گھر بھی ضرور جانا۔“ وہ اس بات سے پہلے ہی واقف تھی۔

”تمہیں کیسی ہے ارٹھی بھائی؟“ وہ اپنی سب ناراضیاں جھول کر من کے بارے میں پوچھنے لگی۔

”تمہیں بالکل ٹھیک ہے اور تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں صبا! ہم لوگ ٹمن کو جتنا روز اور کم کو سمجھتے ہیں وہ ایسی ہے نہیں۔ بہت زیادہ باتوں تو خیر وہ نہیں ہے لیکن جس طرح یہاں آکر خاموش خاموش رہتی ہے ایسی بھی نہیں ہے۔ مجھ سے اس نے کافی ساری باتیں کی تھیں۔ انگل اور آئی کے ساتھ ٹمن نے بھی بہت اچھی طرح میری میزبانی کی۔ وہ تمہاری بھی خیریت پوچھ رہی تھی مجھ سے۔ کہہ رہی تھی کہ کیا صبا ابھی بھی ظفر بھائی کے ساتھ جھگڑتی ہے اور کیا بیڑیاں چڑھتے اترتے وقت وہ ابھی بھی ٹمن ٹمن اسپیس ایک ساتھ چلا گئی ہے؟“ وہ ہنسنے ہوئے اسے ٹمن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ صبا بھی بے اختیار کھٹکھٹا کر من پڑی۔

ارٹھی کا ایم ایس سی مکمل ہو گیا تھا۔ اس کی آؤٹ اسٹینڈنگ کار کروڑی کو سب سراہ رہے تھے، لیکن صبا کی خوشی دوسروں سے کچھ بڑھ کر تھی۔ ارٹھی نے کانوولوشن کی تصاویر ان لوگوں کو بھیجیں تو وہ انہیں دیکھ کر اور زیادہ خوش ہوئی تھی۔ لندن اسکول آف آئیٹس کا مخصوص کٹاؤن سننے وہ کتنا پینڈم لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی فخریہ مسکراہٹ صبا کے چہرے پر بھی غرور و انبساط کے رنگ بکھیر گئی تھی۔

”تم خوش ہو صبا؟“ ارٹھی نے فون پر اس سے پوچھا۔ وہ فی الحال پاکستان نہیں آ رہا تھا۔ اپنے سہراؤز کے ساتھ مل کر وہ کسی ریسرچ میں مصروف تھا۔ پانچ چھ مہینے پہلے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ”تمیں بہت خوش ہو جاؤ ارٹھی بھائی! میرا دل چاہتا ہے آپ ہر جگہ جیتیں۔ کبھی بھی کسی جگہ آپ ٹھہر نہ ہوں۔“ اس نے بڑی چٹائی سے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

ارٹھی کی کراچی واپسی اس کے لیے کیا معنی رکھتی تھی یہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بے پناہ خوش تھی۔ اسے ساری دنیا اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی خوشی سب گھروالوں کو نظر آ رہی تھی۔

”بولی یہ یہ لڑکی ارٹھی کے بچھے۔“ اہل نے اس کی بے تحاشا خوشی پر تبصرہ کیا تو ظفر اسے چڑانے کا جھٹ بولا۔

”بولانی نہیں بلکہ یہ ارٹھی کی چچی ہے اہل! دیکھیں گے بھائی کو کھاس نہیں ڈالتی اور ارٹھی بھائی کا راگ لاپے جاتی ہے حالانکہ اس نے ارٹھی اور گھر والوں کے سامنے اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار بالکل نہیں کیا تھا۔

”صبا! یہ صبا تو پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گئی ہے۔“ ارٹھی نے اسے دیکھتے ہی سب کے سامنے ممانے یہ بات کہی تھی۔ اپنی اس تعریف پر خوشی کے ساتھ ساتھ اسے ارٹھی سے عجیب سی شرم بھی محسوس ہوئی تھی۔

”صبا تو واقعی بڑی ہو گئی ہے۔“ اور وہ شرمیلی

شرمیلی سی اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ کر اسے اپنی پڑھائی کی مصروفیات کے بارے میں بتاتے لگی۔

دو چار روز آرام کرنے اور اپنے دوستوں اور قریبی رشتے داروں سے ملنے ملانے کے بعد ارٹھی نے باقاعدہ طور پر آفس جانا شروع کر دیا تھا۔



وہ صبح کا آفس گیا ممانے سات سات سات بجے سے پہلے گھر واپس نہیں آتا تھا۔

گھر کے تمام افراد کے ساتھ اس کا وہ یہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا لندن جانے سے پہلے تھا۔ وہ اہل کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر ان کے پسندیدہ گھریلو موضوعات پر بغیر پور ہوئے گفتگو کر لیا کرتا تھا۔ ممانے کے ساتھ بھی اس کی پہلے جیسی ہی دوستی تھی۔ ظفر کو اس نے کزن سے بھی بڑھ کر بیش دوست کا درجہ دیا تھا۔ وہ آج بھی اس کا سب سے اچھا دوست تھا۔ رہی صبا تو اسے وہ پہلے جیسی ہی توجہ اور اہمیت دیا کرتا تھا۔ صبا کے ساتھ اس کے دماغ میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

وہ اب بھی چاہے یا کالی کاموڑ ہونے پر کسی ملازم کو توازن لگانے کے بجائے خود اٹھ کر کچن میں آجایا کرتا۔ لیکن اب صبا کچن کے معاملات میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

پہلی مرتبہ جب وہ رات کو ارٹھی کے لیے کافی لے کر اس کے کمرے میں آئی تو وہ حیرت سے بولا۔

”تمہیں کافی پانی آگیا صبا؟“ پھر کافی کا ایک گھونٹ لے کر اس کی تعریف کرتے ہوئے اسے بیکدم ایک اور بات پر حیرت ہوئی تھی۔

”تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ میرا اس وقت کافی پینے کا موڑ ہے؟“

”ارٹھی بھائی! ہم دونوں اس گھر میں شروع سے ایک ساتھ رہتے آئے ہیں۔ کیا مجھے اتنی سی بات بھی پتا نہیں ہو گی کہ جس وقت آپ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کر رہے ہوتے ہیں اس وقت آپ کو چاہے یا کالی کی شہوت سے طلب ہوئی ہے۔“ ارٹھی اس کی بات سن

کر شرارتی انداز میں بے ساختہ بولا۔

”ہاں جیسے مجھے یہ بات معلوم ہے کہ امتحان کے دنوں میں رات رات بھر جاگ کر پڑھتے ہوئے صبا چپس کے چار پانچ پیکٹس اور پیپسی کے دو تین کین بڑے ترانس سے خالی کر دیتی ہے اور اگر امتحان کرنی کے زمانے میں آئیں اور نہیں سے ٹمک لگی کیوں مل جائیں تو پھر تو کیا ہی بات ہے۔“ بڑھنے میں بھی خود بخود ہی دل لگنے لگتا ہے۔ وہ ارٹھی کی بات پر ہنس پڑی۔

صبا اپنا کمرہ صاف کرتی تو اس کے بعد ظفر اور ارٹھی کے کمرے بھی صاف کر دیا کرتی تھی۔ ارٹھی کے کمرے اور اسٹڈی کی تمام چیزوں کو صاف کرنا ترتیب سے ان کو اصل جگہ پر رکھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ ارٹھی کو شاید یہ بات معلوم بھی نہیں تھی کہ صبا ہر روز اس کی بکھری اور بے ترتیب چیزوں کو قرینے سے واپس لے کر اصل جگہ پر رکھتی ہے۔ اس نے خود بھی کبھی ارٹھی کو یہ بات نہیں بتائی تھی۔

ارٹھی صبا کی بعض تبدیلیوں کو بہت انجوائے کرتا تھا۔ وہ نہ اب اس کا ہاتھ پکڑ کر خدیں کرتی تھی اور نہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر اپنی جائز ناجائز فرمائش پوری کروایا کرتی تھی۔ پھونکی سی صبا اب بڑی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ کتنی بھی بڑی ہو جاتی ارٹھی کی نظر میں اسے ہمیشہ اپنی ہی رہتا تھا۔

اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ ”ارٹھی خشنفر! صبا تمہارے لیے کیا ہے؟“ تو وہ ایک لمحہ کی دیر لگائے بغیر کہتا کہ صبا اس کی پھونکی سی ٹیوٹ سی کزن سے لور اس پھونکی سی شرر سی پی سی وہ ہے تحاشا پار کرتا ہے۔ وہ ان کے گھر کی سب سے پھونکی بیٹی تھی۔ اس نے بیٹھ اسے بچوں کی طرح ٹیٹ کیا تھا۔ وہ اس کا اسی طرح خیال رکھتا تھا جیسے گھر کے سب سے چھوٹے بچے کا گھر کے بڑے افراد رکھتے ہیں۔ وہ سات سال کا تھا جب صبا پیدا ہوئی تھی۔

”یہ موٹو مجھ سے نہیں اٹھتی۔“ ظفر کبھی لاڈ میں اسے گود میں اٹھا بھی لیتا تو ٹھوڑی ہی دیر میں منہ ہاتے



ہوئے اسے واپس بکٹ میں لانا دیتا۔ لیکن ارتضیٰ کو اسے گود میں لینا پیار کرنا سب سے اچھا لگتا تھا۔ یہ یہ جیتی جاگتی گڑیا تو اسے اپنے سب کھلونوں سے زیادہ پیاری تھی۔

اس قدر غم سے اس کے شاید ممالور ڈیڈی نے بھی نہیں اٹھائے تھے جتنے ارتضیٰ نے اٹھائے تھے۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی ارتضیٰ سے اس کی قربت بڑھتی چلی گئی۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے مسئلے اس کے پاس لے کر آتی کبھی گھبرا تو وہ اس کی پچکانہ باتوں پر چڑھی جاتا مگر کچھ کہہ کر اس کا دل توڑنا اسے بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

اور یہ وقت کتنی جلدی سے گزرا تھا وہ چھوٹی سی بچی بڑی ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے لیے تو سب آج بھی وہی جا رہی تھی۔ مصوم سی، خند سی، شرارتی سی بچی۔



مما جو دن رات شمن کو یاد کر کے آنسو بہاتی اور اکثر بھائی بھانجے سے بھی گواہی مانگ لینے کا سوچا کرتی تھیں لیکن یہ خواہش بہت تکلیف دہ انداز میں پوری ہو گئی تھی۔ ان کی پیاری اور لڑائی شمن واپس ان کے پاس آ گئی تھی۔ مگر اس کا یہ اتنا خوشیوں کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ وہ آنسوؤں کے ساتھ واپس ان کے پاس آئی تھی اور انہوں نے بھی اس کا استقبال آنسوؤں کے ساتھ ہی کیا تھا۔ کتنا پرانے کا بھائی بھائی تھا ماما اور شمن پرانے ہوں اور ماما کا ایر کریش میں انتقال ہو گیا تھا۔ ماما کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شمن ایک کونسی اور دلاسے دیں یا خود اپنے آپ کو۔ وہ جان سے عزیز بھائی جس سے انہیں اس قدر محبت تھی کہ اپنے جگر کا ٹکڑا اس کے حوالے کر دیا تھا اس کی جدائی کا دکھ کوئی معمولی دکھ نہیں تھا۔ ڈیڈی شمن کو اپنے ساتھ کراچیا لے آئے تھے۔ روٹی، مٹکی، ہر اسالیب کی شمن وہ شمن لگ ہی نہیں رہی تھی جس سے وہ لوگ واقف تھے۔ سب سے الگ تھلک وہ سارا سارا دن کمرے میں پڑی

رہتی تھی۔ پہلے پر سب اس کے اپنے تھے اس کے خونی رشتے۔ مگر وہ ان سب کو اپنی نگاہوں سے دور کر گئی تھی۔ ماما اپنا غم بھلا کر شمن کی کل ہوئی میں لگ گئی تھیں۔ مگر باہر فردل و جان سے اسے خوش رہنے اور یہ احساس دلانے میں کہ یہ اس کا اپنا گھر ہے مصروف تھا۔

صبا، شمن کو کسی بھی وقت اکیلا نہیں رہنے دیتی تھی۔ اکثر وہ اسے زبردستی کمرے سے نکال کر باہر لے آتی اور اگر وہ سختی سے انکار کرتی تو پھر وہ خود بھی وہیں اس کے پاس ہی بیٹھ جایا کرتی اور اپنے کلن اور دوستوں کے لوٹ پناہ گھر آتے اسے سنا شروع ہو جاتی۔ اس نے بیش بہا شمن کے لیے اپنے دل میں بہت محبت محسوس کی تھی۔

رات کی تھلائی میں جب وہ گھٹ گھٹ کر بے آواز ہوئی تو صبا بری طرح بے چین ہو جاتی تھی۔

”شمن! میں تمہاری بہن ہوں۔ سکی بہن۔ تم چھپ چھپ کر اکیلے رونے کے بجائے میرے گلے لگ کر کیوں نہیں رو گئیں۔ تم اپنے دکھ اور اپنے آنسو مجھ سے شیئر کرو شمن پلیز۔“ اس رات اسے کبل میں منہ چھپائے خاموشی سے آنسو بہا دیکھ کر وہ روتی ہوئی تھی۔ شمن ایک دم ہی اس کے بازو پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”مہی پاپا کے بغیر زندگی میں کچھ نہیں رہا صبا!“  
”ہاموں اور ماما کی کاظم بہت پرانا ہے شمن۔ مگر تم یہ بھی تو سوچو کہ اس غم کو جھیلنے کے لیے تم تنہا نہیں ہو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تم ہمارے دل کے بہت قریب ہو۔ تمہارے آنسو ممالور ڈیڈی سے لے کر اس گھر کے ہر فرد کو دکھ میں مبتلا کرتے ہیں۔“ وہ چھوٹی ہو کر بڑی بہنوں کی طرح اسے خود سے لگائے ہوئے پیار سے سمجھا رہی تھی۔ دلاسے دے رہی تھی۔ پتا نہیں اس کے لفظوں میں کوئی جاو تھا یا اس کے انداز میں وہ امانت پن اور وارفتگی اس شدت کی تھی کہ شمن ساری اپنی زندگی اور غیرت بھلا کر اس رات سارا وقت اس کے گلے لگ کر اپنے سب غم بٹکے کرتی رہی تھی۔

صبح وہ کلن کے لیے تیار ہو رہی تھی جب شمن کی آنکھ کھلی تھی۔  
”سو جاؤ ابھی سے مت اٹھو۔ اپنی نیند پوری کر لو“ رات بھر کی جاگی ہوئی ہو۔

”تم بھی تو میرے ساتھ جا چکی تھیں۔“ شمن کبل ایک طرف بٹاتے ہوئے آنکھ کر پڑھ گئی۔  
”میری تو مجبوری ہے پیار! کلن نہ جانا ہوتا تو کبھی نہ اٹھتی اتنی جلدی۔“ وہ ڈرنگ کبل کے آگے کھڑی خود پر ایک طائرانہ لگاؤ لاتے ہوئے کلائی پر گھڑی باندھ رہی تھی۔

”دیسے تمہیں میرا تم کتنا اور تمہارا نام لینا برا تو نہیں لگتا؟“ پہلے کی بات دوسری تھی پہلے تو تم مجھ سے کرن کی حیثیت سے ملا کرتی تھیں لیکن اب تو تم میری بڑی بہن ہو اور وہ بھی پورے دو سال بڑی بہن۔“ شمن نے اس کی بات پر ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”یعنی تمہیں برا نہیں لگتا؟ یہ اچھا ہے ورنہ اگر تم خود کو بچوا اپنی کھلو آئیں تو پھر مجھے خواہ مخواہ تمہارا احترام کرنا پڑ جاتا اور پھر پیار احترام کے لیے ارتضیٰ بھائی اور ظفر بھائی کلنی ہیں۔ تم تو بس صرف میری دوست ہو۔“ اس نے شمن کے چہرے پر اسے دنوں میں پہلی مرتبہ ایک اپناجیت بھرا تاثر ابھرا ہوا دکھلا ڈیڈی نے شمن کی مرضی سے اس کا کراچی یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروا دیا تھا۔ یوں اس کی تعلیم کا مشق قطع ہو جانے والا سلسلہ پھر سے جڑ گیا تھا۔

”آپ دونوں میں سے کوئی کلنی دے گا؟“ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے اس نے شمن اور ظفر سے پوچھا۔ وہ دونوں اس وقت صبا کی کمرے میں بیٹھ کر بیٹھے کارڈز کھیلنے میں مصروف تھے۔ ظفر اپنی عادت اور مزاج کے خلاف شمن کا بہت زیادہ خیال رکھ رہا تھا۔ اس وقت بھی یقیناً وہ اس کا دل بٹانے ہی کے لیے اس کے ساتھ کارڈز کھیل رہا تھا۔ ”تم کیا اپنے لیے کلنی بنانے جا رہی ہو؟“ شمن نے گردن گھما کر سوال پوچھا تو وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے

بولی۔

”میں ارتضیٰ بھائی کے لیے کلنی بنانے جا رہی ہوں۔“

”وہ اتنی رات کو تم سے کلنی خواہ کر رہے ہیں؟“ شمن نے تعجب سے پوچھا۔ اس تعجب میں ناگواری بھی چھپی ہوئی تھی۔ رات کے پارہ بچے ارتضیٰ کا اپنی بہن سے کلنی کی فرمائش کرنا اسے بہت برا لگتا تھا۔

”وہ کیوں کے گا؟ اسے خود ہی شوق ہے اس کی چچہ گھیری کرنے کا اصل میں یہ شروع ہی ہے ارتضیٰ کی چچی ہے۔ اس کے سامنے اپنے کے بھائی تک کو خاطر میں نہیں لاتی۔ ابھی تمہیں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے اس لیے حیران ہو رہی ہو۔ آہستہ آہستہ تمہیں پتا چلے گا کہ کیسے یہ سکے بھائی پر اپنے ارتضیٰ بھائی کو ترجیح دیتی ہے۔“ ظفر نے پتا چھپتے ہوئے شمن کو آنکھ کرنے کی کوشش کی تھی۔ صبا اس حملے پر ہلجھلاتے ہوئے صحت کمرے کے اندر آ گئی۔

”ارتضیٰ بھائی بہت اچھے ہیں شمن! تمہارے تو خیر سب کچھ ایسی بہت مختلف ہیں ورنہ تمہیں کس پر صبا کی میں تمہاری کس قدر مدد کرتے آتے کیرنگ اور نرم مزاج ہیں ارتضیٰ بھائی کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ اپنی ذہانت اور علم پر انہیں بالکل بھی غور نہیں ہے۔“ آخری جملے خالصتاً ظفر کے لیے کہے گئے تھے۔ شمن اس کے طرز پر ہنستے ہوئے ظفر کو دیکھنے لگی تھی جو صبا کو ٹولفٹ کروا کر اپنی توجہ مکمل طور پر کارڈز کی جانب مبذول کر رہا تھا۔

ظفر غیاس یونیورسٹی میں اپنے ایڈمشن کے مراحل طے کرنے میں مصروف تھا۔ اس مصروفیت کے علاوہ فی الحال اس کی کوئی دوسری مصروفیت نہیں تھی۔ اس لیے وہ آج کل وقت گزاری کے لیے آفس جانے لگا تھا۔ اپنی فراغت کا کام وہ اٹھا کر وہ صبح کلنی دیر سے سو کر اٹھا تھا اور شمن یونیورسٹی جانے کے لیے اس کے غم سے بمشکل برداشت کرتی تھی۔

پھر ایک روز ارتضیٰ ہی اسے یونیورسٹی لے گھر لے کر آیا تھا اور پھر یہ سلسلہ اس ایک دن پر ختم نہیں ہوا



تھا۔ ارنٹنی نے یہ ذمہ داری مستقل قبول کر لی تھی بلکہ وہ صبح میں بھی اسے اپنے ساتھ ہی لے جانے لگا تھا اسے یونیورسٹی چھوڑ کر وہ آٹس چلا جاتا جبکہ صبا ڈرائیور کے ساتھ کالج جاتی تھی۔

”تمہیں مشکل ہوئی ہوگی ارنٹنی! میری والدہ کوئی خاص مصروفیت بھی نہیں، شمن کو میں یک کر لیتا ہوں۔“ ظفر نے ایک روز ارنٹنی کے آپس کی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”مشکل کیسی یاد! بلکہ اس میں تو میرا فائدہ ہی ہے۔ شمن کو چھوڑنے کے بدلے مجھے گھر پہنچ کر لے کر کام موقع مل جاتا ہے۔“ کچھ قائل پر بیٹھی شمن نے ارنٹنی کو بہت حیرت سے دیکھا۔

بجائے احسان جتانے کے وہ اتنا اس بات کو اپنے فائدے کا باعث بنا رہا تھا۔ پانی گروالوں سے شمن کی اب کافی بے تکلفی ہو گئی تھی جبکہ ارنٹنی کے ساتھ اس کی لڑکی کوئی بے تکلفی نہیں تھی۔ وہ اکثر خود ہی اسے مخاطب کرتا تھا اور وہ اس کی بات کا سنجیدگی اور محنت سے جواب دے دیا کرتی تھی۔

لیکن اب جو وہ اسے باہندی سے یونیورسٹی چھوڑنے اور واپس لینے جانے لگا تھا تو اس کی ارنٹنی کے ساتھ بھی کبھی چٹکی کب شپ ہونے لگی۔ صبا کے لیے ارنٹنی کا شمن کو یک اور ڈراپ کرنا اس کی خواہشوں میں سے ایک اور خوبی تھی۔

”ارنٹنی بھائی کتنے اچھے ہیں۔ شمن نے دیکھا شمن! وہ سب کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔“ شمن نے اس کی بات پر تائیدی انداز میں سر ہلایا تھا۔ وہ اس کی من کا خیال رکھ رہا تھا اور اس کا یوں شمن کا خیال رکھنا اور اس کی پروا کرنا صبا کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”وہ ایسے ہی ہیں شمن! سب کا خیال رکھتے ہیں۔ میں نے انہیں بھی نوکروں کے ساتھ بھی جچ چلا کر بولتے ہوئے نہیں سنا۔“ اسے ارنٹنی میں بھی کوئی خالی نظر نہیں نہیں سکتی تھی۔ بنواس نے کہا وہ صبح ہے۔ جو وہ کر رہا ہے وہ صحیح ہے۔ وہ کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

وہ یکن میں کبھی اپنی بوریٹ سے نجات حاصل کرنے کی کوئی تدبیر سوچ رہی تھی۔ چھٹی کھول تھا۔ کل ہی صوبہ سے اس نے چاکلیٹ آٹس کریم کی ترکیب سیکھی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے ڈیرکزن؟“ ارنٹنی نے بچن میں قدم رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”چاکلیٹ آٹس کریم بنا رہی ہوں ارنٹنی بھائی! صوبہ سے ریسیپی ملی تھی میں نے۔“ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کفٹر پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔

”آٹس کریم بن رہی ہے پھر تو بھی مزہ آجائے گا۔“ ارنٹنی نے فرج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

”ہاں! اگر آٹس کریم اچھی بن گئی تو درنہ تو میری ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔“

”دیکھا تو ترکیب ہے کیا؟“ پانی بی کرگلاس واپس رکھ چکا تو اس کے ہاتھ سے کفٹر لے کر ترکیب پڑھنے لگا۔

”بہت آسان ہے۔ اس میں کیا مسئلہ ہے۔ چلو میں تمہاری ہیلپ کروا رہا ہوں۔“ وہ جو اکیلی پور ہو رہی تھی تو اب بوریٹ بھی دور ہو گئی تھی اور ارنٹنی کے ساتھ ہونے کی وجہ سے خوش و خوش اچانک ہی برسر گیا تھا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے آٹس کریم بنانے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے جب شمن بچن میں آئی۔

”کیا بن رہا ہے؟“ شمن دونوں کو اتنی سنجیدگی سے جوڑے دیکھ کر اس نے فوراً پوچھا۔

”صبا آٹس کریم بنا رہی ہے اور میں اس کی مدد کر رہا ہوں۔“ ارنٹنی نے گردن موڑ کر شمن کو بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”تمہیں صبا سے کلام ہے یا مجھ سے؟“

”آپ نے کیسے اندازہ لگایا ارنٹنی بھائی! کہ میں کسی کلام سے آئی ہوں؟“ وہ بری طرح حیران ہوئی۔ حیران تو صبا بھی ہوئی تھی کیونکہ خود اسے تو بالکل بھی

ایسا نہیں لگا تھا کہ شمن کسی کلام سے بھل گئی تھی۔

”کیسے اور کیوں میں کیا رکھا ہے۔ آپ کلام بتائیے مس شمن!“ وہ اس کی حیرت کے جواب میں خوشی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”مجھے آپ ہی سے کلام ہے ارنٹنی بھائی! لیکن اگر آپ اس وقت مصروف نہیں ہیں اور مجھے ہونے بھی نہیں ہیں تو۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”نہ میں مصروف ہوں اور نہ ہی تمہا ہوا ہوں! کو کیا کلام ہے۔“ ارنٹنی نے اس کی ہچکچاہٹ اور تکلف کے جواب میں اپنا ہنس اور مسانیت سے کہا۔

”کل میرا میٹ ہے۔ مجھے اپنی دوست کے گھر سے ایک بیک لانی ہے۔ اگر آپ مجھے وہاں لے چلیں تو۔“ زیادہ دور نہیں ہے اس کا گھر صرف دس پندرہ منٹ کی ڈرائیو ہے۔“

”شکر ہے اس کا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر دور ہوتا تو میں تمہیں کبھی بھی نہیں لے کر جاتا۔ اچھا ہوا! تم نے اس بات کی پہلی وضاحت کر دی۔“ وہ شمن کو یکاڑے ہوئے شکل سے بولا۔ پھر فوراً ہی اس نے اپنا رخ صبا کی طرف کر لیا۔

”تم جب تک آٹس کریم تیار کرو صبا! میں ان محترمہ کو دس پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر واقع ان کی فریڈ کے گھر پہنچاؤں۔“ وہ کچھ طنز انداز میں استغورا ہی بچن سے باہر چلا گیا۔ اسے جا آدیکہ کر شمن بھی تیزی سے اس کے پیچھے چلی گئی تھی۔

دونوں منٹ تو وہ یوں خالی الذہنی کی کیفیت میں چپ چاپ سی کھڑی رہی۔ پھر سر جھٹک کر اس نے اپنی توجہ دوبارہ آٹس کریم کے آمیزے کی طرف کر لی پانچ منٹ میں ہی اسے احساس ہوا کہ آٹس کریم بنانے میں اس کی کوئی قصداً ختم ہو چکی ہے۔ وہ اب صرف بے دلی سے اس آمیزے میں پیچہ چلانے کا کام کر رہی ہے۔ وہ اپنی بے دلی کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ اسی وقت ندیم بچن میں آیا تو وہ اسے سارا سامان سمیٹنے اور آٹس کریم تیار کرنے کا حکم دیتی بچن سے باہر جانے لگی۔

”لیکن مجھے تو آٹس کریم بھائی نہیں آتی۔“ وہ گڑبڑا گیا۔

”یہ کفٹر پر ساری ترکیب لکھی ہوئی ہے اور اگر اچھی نہیں بھی دیکھ لو کون سا میں نہیں پھانسی پر چڑھا دوں گی۔“ وہ چڑچڑے پن سے اسے جواب دیتی اپنے کمرے میں گئی۔

”ارنٹنی بھائی مجھے جلدی سے سبک سے کتاب لانے کا کہہ کر گاڑی ہی میں بیٹھے رہے تھے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہوئی کہ سبک کا بھائی! ارنٹنی بھائی کا اسکول کا دوست نکل آیا۔ بہت اصرار سے اس نے انہیں اندر بلا لیا۔“ ارنٹنی اور شمن کلنی در بعد واپس آئے تھے کمرے میں آتے ہی وہ اس سے کچھ پوچھتے بغیر خود ہی تقاضا شروع ہو گئی تھی۔ میگزین کے صفحے پلٹتے ہوئے بڑی بے توجہی سے اس نے شمن کی بات سنی۔

”تمہاری آٹس کریم کا کیا ہوا؟“ شمن نے اس کی غیر معمولی خاموشی کو محسوس کے بغیر پوچھا۔

”میں گئی۔“ شمن کے ہنسنے مسکراتے چہرے پر ایک سنجیدگی نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے مختصر جواب دیا۔

اس کا اس وقت شمن کے ساتھ بات کرنے کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا جبکہ وہ باتیں کرنے کے موڈ میں نظر آرہی تھی۔

”تم اپنے میٹ کی تیاری کیوں نہیں کر رہی شمن! پھر اگر تمہارے اچھے مارکس نہیں آئے تو تم مجھے الزام دو گی کہ صبا نے مجھے ہاتھوں میں لگائے رکھا تھا۔“ وہ بظاہر مسکراتے ہوئے بولی۔ شمن کو بھی ایک دم اپنے میٹ کا خیال آگیا اسی لیے اس کی بات پر ہنسنے ہوئے وہ آٹسنگ کھیل کی طرف بڑھ گئی۔

ارنٹنی آٹس کریم کی بات بیکسری بھول گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ رات کے کھانے کے بعد ماما کی بنائی کبیر کھانے کے بجائے آٹس کریم کھانے کی فرمائش کرے گا۔ لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ شاید اپنے پرانے دوست سے ملنے کی خوشی میں اسے یہ بات یاد ہی نہیں رہی تھی۔



صبح وہ تیار ہو کر ناشتے کے لیے کچن میں آئی تو ریشماں کے ساتھ مہمان بھی کچن میں موجود تھیں۔ وہ اہل کے لیے دلہ بٹاری تھیں۔ وہ مہمان کو سلام کرتی جلدی سے فرج سے ایک انڈا نکال کر ہائے کے لیے چولہے پر رکھنے لگی۔ جب سے ارنٹی واپس آیا تھا اس کے ناشتے کی ذمہ داری اس نے از خود اپنے ذمے لے لی تھی۔ اس کا ناشتہ ہوتا بھی بہت سادہ سا تھا۔ خیر گایک سلاٹس پہلا ہوا انڈا اور ایک کپ چائے۔

اس کے علاوہ باقی سب لوگ ناشتے میں اہلیت کھانا پسند کرتے تھے۔

شمن صبح بہت اہتمام سے ناشتہ کیا کرتی تھی۔ انڈا پر اٹھا اور طلحہ پوری قسم کا ڈس ناشتہ۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ابھی صبح کچن میں آئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ شمن بھی کچن میں آئی۔

”میرے لیے اہلیت مت بنانا ریشماں! رات کی کھیر اور شیر مل رکھے ہیں۔ میں وہ کھاؤں گی۔“ شمن کے اس انوکھے ناشتے پر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

”کھیر بھی کوئی شیر مل کے ساتھ کھانا ہے اور وہ بھی ناشتے میں؟“ وہ اس کے مذاق اڑانے کا برائے بغیر رات کے شیر مل ادول میں رکھ کر گرم کرنے لگی۔

”مہمان شمن کو ناشتے کا اتنی اچھی طرح اہتمام کرنا دیکھ کر حسب عادت اسے ناشتے میں صرف ایک گلاس دودھ پینے پر نوکے لگیں۔

ارنٹی نے شمن کے ایک ہاتھ میں کرشل کاٹازک سا پیالہ اور دوسری پلٹ میں رکھے شیر مل کو دیکھ کر تعجب سے دیکھا تھا۔ صبا، شمن پر ایک مسکراتی ہوتی نگاہ ڈال کر ارنٹی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”آج میں ناشتے میں کھیر شیر مل کے ساتھ کھاؤں گی۔ چاہیں تو آپ بھی کھا سکتے ہیں۔ یہ میری گارنٹی ہے کہ اتنا مزے دار ناشتہ آپ نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں کیا ہوگا۔“ وہ پیالہ اور پلٹ میز پر رکھنے کے بعد خود کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ارنٹی اس کے پچھارے لینے اور مزے لے لے کر کھیر اور شیر مل کی تعریفیں کرنے پر ہنس دیا۔

”آپ یونہی ہنس رہے ہیں ارنٹی بھائی! ایک بار یہ کبھی ہنس زبانی کر کے دیکھیں آپ کو ہوتا چلے گا۔ میں غلط تعریف نہیں کر رہی۔“ وہ اپنی پلٹ میں کھیر نکالتے ہوئے بولی۔

”ارنٹی بھائی تو یہ کبھی بھی نہیں کھائیں گے۔ بہت لائٹ ناشتہ کرتے ہیں ارنٹی بھائی!“ ارنٹی کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔

”خیر کبھی کبھار روٹین سے بٹنے میں کچھ مضائقہ بھی نہیں۔ زندگی میں تبدیلیاں تو اچھی لگتی ہیں۔ کیا حرج ہے تمہارا سا انجوائے منٹ ہی رہتا ہے۔“ وہ بیک وقت صبا اور شمن سے مخاطب ہوا۔ اپنی پلٹ میں تھوڑی سی کھیر نکال لی۔

”صبا! تم بھی ڈرائی کرو۔ شمن بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ یہ تو واقعی بہت مزے کا لگ رہا ہے۔“ پہلے ٹوالے کے بعد وہ سر ٹوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے صبا کو بھی دعوت دی۔ وہ ارنٹی کی من پسند فل کریم پیر کے گلاس کا ٹوکن ہٹائے ہاتھ میں چھری لیے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اس سے جواب میں کچھ بھی نہیں بولا جاسکا۔ اس نے زبردستی مسکراتے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو پاری تھی۔ شمن ارنٹی کو اپنی پسند کا ناشتہ کرتے اور اس کی تعریفیں کرتے دیکھ کر کچلی خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ ہر ٹوالے پر اس ناشتے کی تعریف کر رہا تھا اور شمن کو یقیناً

یہ بات اچھی لگ رہی تھی کہ اس کی پسند کا ناشتہ گھر میں کسی اور کو بھی پسند آ رہا ہے۔ اچانک اس نے اپنے سامنے پلٹ میں رکھے بواکل انڈے اور پیر کے گلاس کو خود پر ہنستا ہوا محسوس کیا۔ وہ یہ سب کس کے لیے لائی تھی؟

کیا ارنٹی کو کچھ بھر کے لیے بھی اس بات کا خیال نہیں آیا تھا کہ روزانہ کی طرح صبا آج بھی یہ ناشتہ اسی کے لیے لائی ہے۔ وہ اس کے لندن سے آنے کے بعد سے پچھلے ڈیڑھ سال سے ہر روز اسی طرح اس کے لیے ناشتہ لاتی تھی۔ کیا وہ اتنی غیر اہم تھی کہ وہ اسے نظر انداز کیے زندگی میں پیدا ہو جانے والی تبدیلیوں کو

انجوائے کر رہا تھا۔

اپنی اداسی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے بس یہ پتا تھا کہ وہ آج بہت اداس ہے۔ مگر کیوں؟ وہ خود اپنے آپ کو کچھ نہیں یاد پاری تھی۔ آخر کیوں وہ اتنی حساس اور زود رنج ہو رہی تھی؟ من ناشتے کی میز پر ہونے والی بات اتنی بڑی بھی نہیں تھی جسے وہ دل سے ہی لگا کر بیٹھ جاتی۔ مگر وہ بات اسے اتنی بڑی کیوں لگ رہی تھی۔

اماں کو وہ پھر میں غیبت نہیں آتی تھی، شمن اکثر وہ پھر میں ان کے پاس لیٹ کر باتیں کیا کرتی تھی۔ وہ شمن سے اپنے بچے کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ اپنی نو عمری کے قصے ڈاؤن جان کی باتیں کیا اور ڈیڑی کے بچپن کے واقعات۔ صبا کو ان قصوں میں کبھی بھی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ شمن بتا نہیں ان کا دل رکھنے کی خاطر وہ قصے سن کر بھی یا پھر واقعی اسے نہیں سننے میں مزہ آتا تھا۔ وہ کبھی صبا کی طرح اماں کو من پر جواب نہیں دیا کرتی تھی۔ کتنی جلدی اس نے خود کو اس گھر کے ماحول میں ڈھال لیا تھا۔ زندگی کے اتنے سال ایک آزاد معاشرے میں گزارنے کے باوجود شمن کے ہر انداز میں مشرقت تھی۔ اس کا انصاف، ہنسنا، بات چیت، سلیقہ، اس کی شخصیت کا وہ مہمان نہیں سے آہستہ آواز میں نظریں نیچے کر کے بات کرتا۔ اماں تو اب بھی کبھار صبا کو کسی بات پر روکتے ہوئے شمن جیسا بننے کی نصیحت بھی کرنے لگی تھیں۔

نماز وہ پابندی سے پڑھتی تھی اور تو اور ممائی نے اسے کافی حد تک کھانا پکانا سکھایا تھا۔ وہ کچن میں کالم کر رہی ہوتی تو صبا اسے حیرت سے دیکھا کرتی تھی۔ کتنی فحاشت اور سلیقے سے وہ ہر کام کرتی تھی۔ خود صبا اگر کچن میں کوئی کام کرتی بھی تو ایک چیز پکانے میں دس چیزیں پھیلاتی تھی۔ شمن کے ہر انداز میں ایک عجیب شگنائے پن اور نزاکت ہوتی۔ طریقہ اور سلیقہ گویا اس پر اگر ختم ہو گیا تھا۔

اس گھر کا فرد اس کی ان خوبیوں کو سراہتا تھا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے صبا؟“ وہ لینے کے لیے نکلی

سیدھا کر رہی تھی جب شمن نے پوچھا۔

”کیا ہوا ہے مجھے؟“ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیا بات تو میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔ کیا تم مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو؟“ وہ ہیڈ پر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

”میں کیا پاگل ہوں جو بغیر کسی بات کے تم سے ناراض ہوں گی۔“ وہ برائے نوالے انداز میں بولی۔

”پھر کیا بات ہے؟ تم نے آج دن بھر میں مجھ سے بالکل بات نہیں کی۔ شام کو میں تمہارے اور اپنے لیے سنڈویچز بنا کر لائی تو تم نے منع کر دیا۔ ابھی بھی دیکھو، کتنی جلدی سونے کے لیے لیٹ گئی ہو۔ جبکہ روزانہ ہم دونوں کتنی دیر تک جاگ کر باتیں کرتے ہیں۔ ان باتوں پر میں کیا سوچ سکتی ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔“ شمن کے ان شکوک پر وہ بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

”سوری شمن! میں بتا نہیں کیوں آج میرا سوڈا بوجھ خراب ہو رہا تھا۔ تم سے میں کیوں ناراض ہوں گی۔“

”سوڈا کس بات پر خراب ہو گیا تمہارا؟“ شمن اس کے برابر میں لیٹ گئی۔

”بات کوئی نہیں ہے پار! میں ہوں ہی سوڈی۔ تمہاری طرح نیک اور اچھی بچی نہیں ہوں نہ اماں سے نصف صدی پہلے کے قصے خوش خوشی سننے والی۔“ اس نے شرارت سے شمن کو چھیڑا تھا۔

”تم بہت اچھی ہو صبا! یہاں جو میں اتنی جلدی ایڈجسٹ ہو گئی ہوں تو اس میں سب سے بڑا ہاتھ تمہارا ہے۔“ وہ شمن کے منہ سے اپنی تعریف سن کر مسکرا دی۔

”جب ممی بابا کی ڈیوٹی ختم ہوتی تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں بھری دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہوں۔ مجھے تم لوگوں سے بالکل بھی محبت اور اپنائیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ تم سب تو شروع سے ایک ساتھ ایک ہی گھر میں تھے۔ تم لوگ ایک تھے اور میں تم لوگوں سے الگ، بالکل پرانی۔ میرا ماحول، میری تربیت سب تم لوگوں



”واقعی؟“ وہ خوشی سے فوراً ”کھڑی ہو گئی تھی۔  
ار تفضی نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا اور بولا۔  
”تم مجھے ایک گلاس پانی کا پلاؤ اور تمہیں کو بھی بلا  
لاؤ۔ پھر تینوں مل کر چلیں گے۔“ صبا جانتی تھی ار تفضی  
اخلاقیات نبھانا کبھی نہیں بھولتا۔ وہ لوگ کہیں باہر  
جائیں اور ار تفضی تمہیں سے نہ کہے ایسا ہو ہی نہیں سکتا  
تھا۔

”وہ اپنا اسائنمنٹ بنا رہی ہے۔ مشکل ہی ہے کہ وہ  
ہمارے ساتھ چلے۔“

”تم اس سے کہو تو۔“ وہ صوفے کی پشت سے سر  
ٹکاتے ہوئے بولا۔ یوں جیسے صرف ایک اخلاقی تقاضا نبھانا  
چاہ رہا ہو۔ ار تفضی کو پانی پلا کر وہ تمہیں کے پاس کمرے  
میں آگئی۔

”تمہیں! میں اور ار تفضی بھائی باہر کھانا کھانے جا  
رہے ہیں۔ ار تفضی بھائی نے تمہیں بھی انوائٹ کیا  
ہے۔“ وہ برجوش سے انداز میں بولتے ہوئے اس کے  
پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ تمہیں رائٹنگ ٹیبل کے  
آگے بیٹھی مسلسل کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔

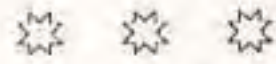
”تم لوگ جاؤ صبا! مجھے ابھی بہت کام ہے۔“ اس کا  
جواب حسب توقع تھا۔

”چلی چلو نا تمہیں! مزہ آئے گا۔“ اس نے دوبارہ  
اصرار کیا تو تمہیں نے سہولت سے معذرت کر لی۔ وہ  
تمہیں کی بدذوقی پر لعنت بھیجتی واپس لاؤنچ میں آگئی۔  
”تمہیں نہیں آئی؟“ ار تفضی نے اسے اکیلے آنا دیکھ  
کر آہستگی سے پوچھا۔

”یا گل ہے تمہیں، پڑھائی کو سر پر سوار کر لیتی ہے۔  
اسائنمنٹ جمع کرانے کی تاریخ ابھی دور پڑی ہے پھر  
بھی محترمہ دل و جان سے اسے مکمل کرنے میں لگی  
ہیں۔ فرما رہی ہیں، آپ لوگ جائیں مجھے اسائنمنٹ  
بنانا ہے۔“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولی۔

”تمہیں کو ابھی یہ نہیں معلوم کہ آخری تاریخ سے  
ایک دن پہلے گھبرائے اور بو کھلائے ہوئے انداز میں  
کام کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔“ اس نے لطیف  
سے انداز میں صبا کے ہر کام کو آخری وقت پر ٹالے

سے مختلف تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ تم لوگوں کا یہ گھر  
چھوڑ کر واپس سڈنی چلی جاؤں مگر اب مجھے اپنی اس  
وقت کی سوچوں پر افسوس ہوتا ہے۔ تم سب کتنے اچھے  
ہو۔ میرے اپنے ہو۔ مجھ سے بے تحاشا پیار کرتے ہو،  
اس کے لفظوں میں اتنی سچائی اور اتنی وارفتگی تھی کہ  
اس نے بے اختیار تمہیں کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر  
محبت سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔



ار تفضی اپنی فٹنس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ روزانہ  
صبح پابندی سے ایکسرسائز اور جاگنگ اور ہفتے میں دو  
مرتبہ سو وہ ضرور کیا کرتا تھا۔ آج بھی وہ آفس  
سے گھر آنے کے بجائے سوئمنگ کے لیے چلا گیا  
تھا۔ وہاں سے گھر واپس آیا تو لاؤنچ میں صبا اکیلی بیٹھی  
نظر آئی۔

”کیا ہوا؟ اتنی بری بری شکلیں کیوں بنا رہی ہو؟“  
اس کے سلام کا جواب دے کر وہ بھی صوفے پر بیٹھ گیا  
تھا۔

”بور ہو رہی ہوں۔ اس گھر میں کسی کو میری پروا  
نہیں ہے اور یہ نی وی بھی بس ایک دم فضول اور  
بورنگ۔“ وہ نی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر روٹھے  
لہجے میں بولی۔

”یوں منہ بسورتے ہوئے تم کتنی پیاری لگتی ہو  
صبا!“

”خاک پیاری لگتی ہوں۔ اس پیاری کی کسی کو رتی  
برابر بھی پروا نہیں ہے۔ ماما اور ڈیڈی غیث انکل کے  
گھر چلے گئے، بابا ابھی تک گھر ہی واپس نہیں آئے،  
ظفر بھائی تو خیر گھر پر ٹکتے ہی کم ہیں، اماں ہیں تو وہ اپنے  
وظائف پڑھنے میں مصروف ہیں اور تمہیں کا تو ذکر ہی  
بے کار ہے۔ کتابی کیرئیر نہ ہو تو۔“ وہ ہنوز ناراض تھی۔

”چلو میں تو ہوں اپنی پیاری سی صبا کی پروا کرنے  
کے لیے۔ ایسا کرتے ہیں آج ڈنر کہیں باہر کر لیتے  
ہیں۔ تمہاری پسند کی جگہ پر۔“ اپنی تھکن بھلا کر اس  
نے فوراً ”پروگرام ترتیب دے ڈالا۔“







اس کے لیے آپ بارے اپنا آپ بارے آپ نے  
خمن کے آگے اپنا آپ کیوں بار دیا؟" اسے مزید رونا آ  
ریا تھا۔ عمر وہ اس وقت اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی  
تھی اس سے کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔

"آپ کیوں بارے ارٹھی بھائی؟" اچانک ہی اس  
کے ہونٹوں سے شکوہ جھل گیا تھا۔

"یار ہمیشہ جیتنا بھی تو میں ہی ہوں۔ ایک بار بار گیا  
ہوں تو تم اس طرح رورہی ہو۔ اچھا چلو بالکل پکا وعدہ  
اگلی بار میں جیتوں گا اور پھر جیتنے کی خوشی میں تمہیں  
تمہاری فیورٹ آئس کریم بھی کھلاؤں گا۔ بہت  
ساری آئس کریم۔" وہ پیار سے اس کی طرف دیکھتے  
ہوئے وعدہ کر رہا تھا، مگر اس مسکراہٹ اور پیار میں وہ  
بات نہیں تھی جو خمن کی طرف اٹھنے والی نگاہوں میں  
تھی۔

"مبارک ہو تمہیں، تم تو یقیناً بہت خوش ہو گی۔  
تمہارے بھائی صاحب جیت جو گئے ہیں۔" یہ بات  
خمن سے کہتے وقت ارٹھی غصے سے جتن نگاہوں سے  
خمن کو دیکھا تھا، ان میں کتنی دارتھی تھی، کس قدر  
محبت تھی۔ وہ کتنی باتیں کر کے دیکھتے ہوئے ان  
نگاہوں سے موازنہ کر رہی تھی۔ پیار دونوں ہی جگہ تھا  
مگر انداز جدا تھا۔ وہ اس سے کیا کہہ رہا ہے اسے ایک  
لفظ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

"اچھا اب یہ آنسو صاف کرو۔" اس نے اسے ہاتھ  
پکڑ کر کھرا کر دیا۔

"جلدی سے منہ دھو کر آؤ۔ ظفر زندگی میں پہلی  
مرتبہ مجھ سے جیتنے پر خوشی سے پاگل ہو رہا ہے اور اسی  
خوشی میں وہ سب کچھ کھلانے چاہنے باہر لے کر جا رہا  
ہے۔" ارٹھی شوق سے بولا۔ وہ خاموشی سے واش  
روم میں چلی گئی تھی۔ ارٹھی بیل پر بیٹھا اس کا انتظار  
کر رہا رہا۔ وہ سب لوگ لاؤنج میں بیٹھے ان ہی دونوں کا  
انتظار کر رہے تھے۔

"بہت برا لگا ہے، ابھی لوگوں کو میرا جیتنا۔" ظفر نے  
اسے دیکھتے ہی طنزیہ انداز میں کہا۔ وہ جواباً خاموش  
رہی۔ کچھ دیر بعد وہ سب گاڑیوں میں شخص ٹھساکر

ظفر سے شاندار سی ٹریٹ وصول کرنے جا رہے تھے۔  
وہ بہت کوشش کے باوجود بھی سب کے ساتھ باہمی  
کرنے اور ہنسنے ہنسانے میں کامیاب نہیں ہو پا  
تھی۔

"وہیئے تمہارے بارے پر مجھے بہت حیرت ہے۔  
چچی کسب لیتے ہوئے ناورنے ارٹھی سے کہا۔

"بھئی جی بات تو یہ ہے کہ ظفر نے واقعی  
بہترین انداز میں کھیا اور دوسرے یہ بھی ہے کہ ان  
کل میں آفس میں ضرورت سے زیادہ مصروف ہو  
ہوں اس لیے پابندی سے پریکٹس نہیں کر سکتا۔" اور  
جواب دے کر وہ اپنی پلیٹ میں میکرویز ڈالنے لگا۔

"مطلب یہ کہ اگر آپ دوبارہ پابندی سے پریکٹس  
شروع کریں تو با آسانی ظفر بھائی کو ہرا دیں گے۔"  
خمن کو ارٹھی کی بات بہت بڑی لگی تھی۔ ارٹھی نے  
ہاتھ میں پکڑا ہوا پیچ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ خمن کی  
طرف وہ بڑی محفوظ سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"ہار کر لوگ یو ٹی وی اسکرین سے جواز پیش کرتے  
ہیں۔ یوں ہوتا تو میں یوں کر لیتا اور یوں نہیں ہوتا۔  
اس لیے میں یوں نہیں کر پایا۔ یہ بات تھوڑی اس کے  
منہ سے نکلے گی کہ آج میں نے اسے آؤٹ کاٹ کر دیا  
ہے۔" ظفر نے خمن کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ چاہا  
پلیٹ میں تھوڑے سے چاول اور سلاؤ ڈالے انہیں  
زبردستی کھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تمہیں ہارنے پر دکھ تو ہوا ہو گا؟" اسماء نے سوال  
ظفر سے ارٹھی کو دیکھا۔

"بھئی بھی انسان ہار کر بھی تو جیت جاتا ہے۔"  
"وہ فلسفہ۔" اسماء نے مذاق اڑانے والے انداز  
میں کہا۔

"مسٹر ارٹھی غصے! آج آپ نے ہار کر کیا جیت لیا  
؟" وہ اسماء کی بات پر دھجھے سروں میں ہنسا۔

"یونہی کہہ رہا تھا۔ بات اصل بات تو یہ ہے کہ  
آج کا دن میرا نہیں، ظفر کا تھا۔" اسماء کو جواب دیتے  
ہوئے اس نے ایک نظر اپنے بالکل سامنے بیٹھی خمن  
پر ڈالی پھر کچھ سوچ کر مسکرایا۔

"اور جہاں تک جیتنے کی بات ہے تو اور کچھ نہ سنی  
کم از کم آج میں نے خمن کی مسکراہٹ تو جیت لی  
ہے۔ کیا میرے جیتنے پر یہ اس طرح مسکرا سکتی تھی؟  
میں سوچ کر مجھے زیادہ افسوس نہیں ہو رہا کہ چلو میرے  
بارے پر ظفر کے ساتھ ساتھ خمن بھی بہت خوش  
ہے۔" خمن اس کی صاف گوئی اور کچھ دیر پہلے کے  
اپنے رویے پر شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

"مجھے آپ کے جیتنے پر بھی خوشی ہوتی ارٹھی بھائی!  
لیکن ظفر بھائی کے لیے جس طرح میں ٹھیل کرتی ہوں،  
اس طرح آپ کے لیے تو نہیں کر سکتی۔ یہ تو بہت  
بچپل سی بات ہے۔" وہ اپنے رویے کی وضاحت  
کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ظفر، خمن کی محبت پر  
بڑی سرشاری سے مسکرایا تھا۔

"دنیا کی ساری بینیں میرے جعفر سے رشتہ جوڑے  
تھوڑی نیچی ہوتی ہیں۔ کچھ تو خمن جیسی بھی ہوتی ہی  
ہیں۔" ظفر نے بہت دیر سے جب بیٹھی صبا کو لڑائی پر  
آسانے کی کوشش کی تھی۔ ظفر کی بات نے سب کو  
ایک دم ہی اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ ورنہ اتنی دیر  
سے کسی کی بھی توجہ اس کی جانب نہیں تھی۔

"ظفر بھائی بالکل ٹھیک کہتے ہیں صبا! تم واقعی  
ارٹھی بھائی کی بیٹی ہو۔" خمن صبح یونہی پین کر  
جانے والے کپڑے نکالتے ہوئے بولی۔ ان لوگوں کو  
واپسی میں اچھی خاصی دیر ہو گئی تھی۔ واپس آکر وہ  
فوراً بستر پر لیٹ گئی تھی۔

"اور ظفر بھائی کتنے اچھے ہیں۔ انہوں نے  
تمہارے رویے کا برا بھی نہیں مانا۔ میں ان کی جگہ  
ہوتی اور تم میرے جیتنے پر اس طرح ناراض ہو تیں اور  
دو تیں تو میں تم سے بات بھی نہیں کرتی۔" وہ اپنے  
کام میں مصروف اس کے رویے پر اپنی ناپسندیدگی کا  
اظہار بھی کرتی جا رہی تھی۔

"ہم میں سے کسی کو تو پتا بھی نہیں چلا تھا کہ تم  
ناراض ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی ہو۔ وہ تو ارٹھی  
بھائی ہی کی نظر پڑی تھی۔ ظفر بھائی کہنے لگے کہ اس  
کے چہیتے ارٹھی بھائی مجھ سے ہار جو گئے ہیں وہ ضرور

کمرے میں بیٹھ کر اس بار کا فہم ستاری ہو گی۔" وہ اپنے  
کام سے فارغ ہو چکی تھی، بیڈ کی طرف آتے ہوئے  
اس نے اپنا جملہ مکمل کیا تھا۔

"لائٹ آف کر دو خمن!۔" ٹکیہ منہ پر رکھتے ہوئے  
اس نے بیڈ کی سے خمن سے کہا۔ خمن لائٹ آف کر  
کے اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔

"ارٹھی بھائی کے گزرتے سارے ہی بہت اچھے ہیں۔  
خوش مزاج اور ہنسنے ہنسانے والے، صبا! کچھ دیر  
بعد اس نے خمن کی توازی سنی۔ وہ روزانہ کی طرح باتیں  
کرنے کے موڈ میں تھی۔ صبا جواب میں اسی طرح بے  
حس و حرکت خاموش لیٹی رہی۔

"تم کیا سوچیں صبا؟" اس کے جواب نہ دینے پر  
خمن نے پوچھا۔ اس نے اب کی بار بھی جواب نہیں دیا  
تو اس نے یہ سمجھ کر کہ صبا سو گئی ہے دوبارہ اسے توازی  
نہیں دی۔ کئی دیر تک کمرے میں خاموشی اور سناتے  
کا راج رہا۔ بہت دیر بعد اس نے منہ پر سے ٹکیہ ہٹا کر  
خمن کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ گہری اور  
پر سکون نیند۔

"میری آنکھوں سے غینہ چرا کر تم کتنے مزے سے  
سو رہی ہو خمن! اس نے خمن کے حسین چہرے پر  
نگاہیں جمائیں۔

"تم یہاں پر کیوں آگئی ہو خمن۔" اس رات پہلی  
مرتبہ اس نے خمن کے بارے میں یہ بات سوچی۔

"پلیز واپس چلی جاؤ خمن، تم واپس سٹڈی چلی جاؤ۔  
جہاں سے آئی تھیں وہیں لوٹ جاؤ۔ تمہارے آنے  
سے پہلے ہم سب کتنے خوش تھے۔" اتنے دنوں سے  
اسے کیا بات اور اس کر رہی تھی گونجی چیز تھی خواہ  
دکھی کر رہی تھی اور جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی، آج  
اس کی سمجھ میں وہ بات آگئی تھی اور وہ بات کتنی  
تکلیف دہ تھی۔

"وہ مجھے نہیں دیکھتا، خمن کو دیکھتا ہے۔ اسے مجھ  
سے نہیں خمن سے محبت ہے۔" ساری رات وہ بے  
چینی سے کونٹیں بدلتی رہی تھی۔



وہ ہر روز شمن کو دیکھ کر "تم یہاں کیوں آگئی ہو شمن؟ ضرور سوچا کرتی تھی۔ اس رات بھی وہ فرس کی کتاب اور نوٹ بک سامنے رکھے اسی ایک جگہ کو بڑھے جا رہی تھی جب شمن نے اس کے پاس میز پر لا کر کچھ رکھا۔

اس نے سر اٹھا کر نہ تو شمن کی طرف دیکھا اور نہ اس چیز کی طرف جو اس نے میز پر رکھی تھی۔

"زحاکو صاب! یہ سینڈویچز اور چائے میں آپ سی کے لیے لائی ہوں۔" اس نے جاکے آگے سے کتاب اٹھا کر دور رکھتے ہوئے فحش کی کتاب سے چاہتے ہوئے بھی اپنے پاس رکھی پلیٹ میں خوب صورتی سے سجے ہوئے سینڈویچز اور مک مک بھاپ اڑائی ہوئی چائے کو دیکھتے ہوئے مجبور ہو گئی تھی۔

"میرے لیے؟ لیکن کیوں؟ میں نے کھانا کھا تو لیا تھا۔" اس نے سر اٹھا کر شمن کی طرف دیکھا۔

"ہیں بس رہنے دو کھانا کھالیا تھا۔ دیکھا تھا میں نے تمہیں کتنا کھانا کھایا تھا تم نے۔ ایسی بھی کیا احتیاجوں کی شش کہ بڑھ کھانا پینا ہی چھوڑ دے۔ حالت دیکھو ذرا اپنی فحش کمزور ہو رہی ہو۔ مہما بھی کہہ رہی تھیں کہ اب کی دفعہ صبا امتحان کی ضرورت سے زیادہ مہنت لے رہی ہے۔" اس کی ڈانٹ میں پناہ چھپا ہوا تھا۔ بالکل بڑی ہنسنے والا محبت بھرا انداز تھا اس کا اپنی لحد بھر میلے کی سوچ پر اسے ایک دم ہی ندامت ہوئی۔ "کتنا اچھا ہے کہ لوگ ہماری سوچ نہیں پڑھ سکتے۔ ورنہ شمن کو دکھ ہوتا۔"

"مہنت مزے کے سینڈویچز بناتے ہیں میں نے۔ اس میں چکن بھی ہے، ڈینی بھی، سیلز بھی ہیں اور مایونیز بھی ہے۔ کھا کر دیکھو تمہیں مزہ آجائے گا۔" شمن کے کہنے پر اس نے سینڈویچ اٹھا لیا تھا۔

"مزے کا بنا ہے نا؟" اس کے پسلاؤ والے لیتے ہی شمن نے پوچھا۔ اس نے اسی طرح پلیٹ پر نظرس مرکوز رکھتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ وہ شمن سے نظرس نہیں ملایا رہی تھی۔

"تب میں بھی پڑھنے بیٹھ رہی ہوں۔ شرافت سے

یہ پوری پلیٹ خالی کر دینا۔ ورنہ پھر میں زبردستی سارے سینڈویچز تمہارے منہ میں ٹھونسوں گی۔" اسے دھمکانی پنڈ پر اپنی نوٹ بک اور پین لے کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر اس من موہنی سی لڑکی کی طرف دیکھا جو اس کی بہن بھی تھی جو بہت اچھی تھی جو اس سے بہت پیار کرتی تھی۔

"شمن! جس طرح تم مجھ سے پیار کرتی ہو، اسی طرح میں بھی تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔ بہت زیادہ بے حساب مگر پھر بھی بتا نہیں کیوں اکثر میرے دل میں تمہارے بارے میں ایسے خیالات آتے ہیں کہ اگر وہ میں تمہیں بتا دوں تو تم مجھ سے نفرت کرنے لگو۔ اکثر تمہیں دیکھ کر میں یہ سوچتی ہوں کہ تم یہاں نہ آتیں تو کتنا اچھا تھا۔ تم اتنی ہی اچھی ہو شمن! اتنی اچھی کہ تم سے پیار کرنے کے علاوہ کچھ اور سوچائی میں جا سکا۔ کاش تم مجھ سے لباب بھرا ہوا یہ دل نہیں رکھتیں، تم اتنی خوبصورت کی مالک نہ ہو تیں، پھر کوئی بھی تم سے پیار نہ کر سکتا۔"

اپنے کمرے میں داخل ہوتے ارٹھی کو دیکھ کر اس کا دل پھٹنے لگا تھا۔

"بہت زبردست طریقے سے پڑھائی ہو رہی ہے۔ لگتا ہے اب کی بار فرسٹ پوزیشن لینے کا ارادہ ہے۔" وہ بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ شمن بھی کمرے ہی میں موجود تھی۔

"میں آفس کے کام سے ٹیو کو جا رہا ہوں۔ جلدی سے اپنی فرائض بتا دو۔ کیا کیا چیزیں لاؤں تمہارے لیے وہاں سے۔"

"جو مجھے چاہیے، وہ تم مجھے بھی نہیں دو گے۔" وہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"یار! ممانے تو بس یونہی ایک بات کہی تھی۔ تم بلاوجہ ان کے ڈانٹنے پر اپنی سیریس ہو گئی ہو۔" بڑے یقین سے وہ اس کی خاموشی کی وجہ بتا رہا تھا، یوں جیسے اس بات کے علاوہ اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ بالکل اتفاق ہی تھا کہ جس روز ارٹھی کے کزن ان لوگوں کے گھر آئے تھے اسی روز صبح ممانے اسے

ایک میز میں سیریس نہ ہونے اور اپنا وقت بیکار کے مشغول میں ضائع کرنے پر خاصا تفصیلی ریکارڈ تھا۔ ارٹھی اس وقت وہیں بیٹھا ہوا تھا اور اس نے بیٹھ کی طرح ممانے کی طرف اشارہ بھی کیا تھا۔

"صبا کا رزلٹ بہت اچھا آئے گا اس بات کی آپ کو میں گارنٹی دے رہا ہوں۔ ہر ایک کا پڑھنے کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ صبا ہر وقت کتابوں میں منہ گھسا کر نہیں بیٹھتی، لیکن جس وقت پڑھتی ہے تو پھر پوری سنجیدگی سے پڑھائی کرتی ہے۔" اور ارٹھی ہی کی وجہ سے ممانے اپنی ڈانٹ اور لکچر کا دورانیہ تھوڑا مختصر کر دیا تھا۔ شمن اپنے جرنل پر ڈائیکٹرام بناتے ہوئے ان دونوں کی طرف بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ ارٹھی نے شمن کی توجہ محسوس کی تو بظاہر اسے نظر انداز کیے صبا سے بولا۔

"ہماری صبا تو بہت کھکھکاتی اور شرارتیں کرتی ہوئی ہی اچھی لگتی ہے۔ بڑی بی ٹائپ کی بزرگ اور سنجیدہ خواتین تو یہاں پہلے ہی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ امیں اور ممانہ ہمیں جن خاتون کے جیسا بننے کی نصیحتیں کرتی ہیں، خدا کے لیے تم ان کے جیسی مت ہو جانا۔" اس کے چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں بڑی شرری چمک رہی تھی۔ شمن نے پائل اور ریوڑ ایک طرف رکھ کر ارٹھی کی طرف بڑی ناراض نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ اس سے بے نیاز صبا سے باتوں میں مصروف تھا۔ لیکن آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ شمن کے تاثرات کو انجوائے کر رہا ہے۔

"آپ کو میری پسند معلوم تو ہے، بس جو آپ کو اچھا لگے، لے آئیے گا۔" وہ اس کے اصرار پر آہستگی سے بولی۔ کچھ دیر تک وہ اس سے اس کی پڑھائی کے بارے میں باتیں کر کے کمرے سے چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کے مزان کی تبدیلی گھر کے کسی فرد کے لیے بھی قابل قبول نہیں۔ ابھی تو امتحانوں کا ہما نہ تھا، اس کے بعد اس کے پاس سب سے الگ تھلک اور خاموش رہنے کے لیے کیا ہما نہ ہو گا؟ وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اماں تک بھی جو اسے شمن

کے آنے کے بعد سے اکثر اس جیسا بننے کی نصیحت کرنے لگی تھیں۔ کل بے اختیار کہہ بیٹھیں۔ "میرے گھر کی بیل خاموش کیوں ہے۔ تم سے ہی تو اس گھر میں رونق ہے صبا! آج کل تو گھر کھلنے کو ڈرنا ہے۔ ایسی خاموشی، کوئی شور شراب ہی نہیں۔"

وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اس کے کدے دوسرے تو کوئی قبول نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہنسنا اور شرارتیں کرنا چھوڑ دے ارٹھی کے آگے پیچھے پھرنا چھوڑ دے، مقررے لڑنا چھوڑ دے، اماں سے بحث کرنا چھوڑ دے۔ اسے خود کو بدلتا ہوا گلہ صبا کو اب بڑا ہونا ہو گا۔ اپنی خوشی اور غم چھپانا سکھنا ہو گا۔ اب وہ کبھی کسی کو صرف صبا شفیق کا دل رکھنے کی خاطر چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ نہیں چھپانے لگی۔

وہ دوبارہ سے پہلے والی صبا بن گئی تھی۔ ارٹھی ٹیو کو سے واپس آیا تو اس کے لیے بہت سی چیزیں لایا تھا۔

"یہ رہیں تمہاری چاکلیٹس، یہ تمہاری کی چیونٹ، دیکھ لو یہ ساری کی ساری تمہاری پسند کے کارٹون کی پیکٹرز کی کی چیونٹیں اور یہ ہیں تمہاری پسند کے کلر فل پین اور پینسلین سب سے خاص چیز ہے یہ کیلکولیٹر جب تم یونیورسٹی جانا شروع کرو گی تو اس سے تمہیں بہت مدد ملے گی۔" اس نے کیلکولیٹر اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے بتا چلا کہ صبا کو اس طرح کی چیزیں لا کر دینا کون ہے۔" شمن جو کی چیونٹ کو بغور دیکھ رہی تھی، مسکرا کر بولی۔

وہ شمن کی بات سے بغیر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی اور وہاں سے اپنا کانٹیکٹ اٹھا کر لے آئی۔ پہلے کی لگی ہوئی چند کی چیونٹ انار کر اس نے ان کی جگہ ارٹھی کی لائی ہوئی نئی کی چیونٹ لگانی شروع کر دی تھیں۔ ارٹھی اس کام میں اس کی مدد کروا رہا تھا۔

"صبا کو شروع سے شوق ہے اس طرح کی چیزیں جمع کرنے کا۔" کی چیونٹ اس کے بیگ پر لگاتے ہوئے ارٹھی نے شمن کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"تب ہی اس کے پاس مارکرز اور پینسلوں کا اتنا



زبردست ذخیرہ ہے۔ مجھے بھی ہمیشہ سے نئی نئی طرح کے چین جمع کرنے کا شوق رہا ہے۔  
 ”پھر تو مجھے تمہارے لیے بھی اس طرح کی کوئی چیز ضرور ملنی چاہیے تھی۔“ وہ بیک اور کی چین سے توجہ ہٹا کر چین کی طرف دیکھتے ہوئے ناسف سے بولا۔

”تم بھی بتائی بھی تو نہیں ہوا اپنی پسند ناپسند بتا دیا ہوتا تو میں تمہارے لیے بھی دو چار منفرد قسم کے چین لے آتا۔“ اس کے لیے میں انیسویں کے ساتھ ساتھ نکلتی بھی تھی۔

”یہ تو میں ایسے ہی ایک بات کہہ رہی تھی اور ویسے بھی آپ اپنے بزنس کے کام سے گئے تھے میرے حساب سے تو اس پر فیوم کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“ ”چمن نے اسے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔  
 ”چمن کو جو پر فیوم ارٹھنی نے تھے میں وہاں بہت قیمتی تھا۔ لیکن صبا کے سارے مخفوں کی قیمت کے ساتھ اگر اس پر فیوم کا مقابلہ کیا جاتا تو یقیناً صبا کے تھے قیمت میں زیادہ تھے۔ وہ ایک اکیلا پر فیوم جو بہت مونگاتو تھا لیکن صبا کے لیے آئے بہت سارے مخفوں کی مشترکہ قیمت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے لینے کے لیے صبا کا دل چل رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چمن سے تحفہ بدل لے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چمن سے کہے۔

”یہ سب چمنس تم لے لو مجھے بس صرف یہ پر فیوم لے لینے دو۔“ ارٹھنی سے اس کے لائے ہوئے تمام تحائف کے لیے بہت شکریہ کہہ کر اور ان پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کر کے جب وہ کمرے میں گئی تو اس کی سب سے پہلی نظر ڈرنگ ٹیبل پر رکھے اس پر فیوم پر پڑی جسے ابھی چھ دیڑ پہلے ہی چمن نے یہاں رکھا تھا۔ اسے حد محسوس ہوا۔ اپنے سب تحفے اٹھا کر پھینک دینے کو دل چاہا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم بیک وقت کسی سے محبت بھی کریں اور نفرت بھی؟ اسے کبھی چمن سے محبت محسوس ہوتی اور کبھی شدید نفرت۔ اس وقت وہ شدید نفرت کے حصار میں تھی۔  
 ”تم یہاں پر کیوں آگئی ہو چمن! واپس چلی جاؤ۔ خدا

کے لیے واپس چلی جاؤ۔ مجھ سے میری محبت مت چھینو۔ میں نے اس شخص سے بہت شدید محبت کی ہے اور اس کے علاوہ میں بھی کسی سے محبت نہیں کر پاؤں گی۔“



اس روز کھانے کی میز پر باپا اور ڈیڈی ارٹھنی کے چلیان کے بزنس ٹرپ کو موضوع گفتگو بنائے ہوئے تھے۔ جس کام سے کیا تھا اسے بڑے شائد ار طریقے سے مکمل کر کے کیا تھا۔ کھانے کے دوران سارا وقت یہی باتیں ہوتی رہی تھیں۔

”ارٹھنی بھائی تھنے ذہن ہیں۔ میں تو ان سے بڑی طرح اسپریرس ہوں۔“ چائے پیتے ہوئے چمن نے اس سے کہا۔ کھانے کے بعد ظہر کی فرمائش پر چمن چکن میں چائے بنانے آگئی تھی۔ کام کرتے ہوئے وہ مسلسل ارٹھنی کی ذہانت ہی کو ڈسکس کیے جا رہی تھی۔

”ارٹھنی بھائی مجھے بتا رہے تھے کہ انہیں مختلف زبانیں سیکھنے کا بہت شوق ہے اور اس چیز نے انہیں ٹوکیو میں کتنا فائدہ پہنچایا۔ آپ کہیں کوئی بزنس ٹرپ کرنے گئے ہیں اور جس کے ساتھ آپ کو معاملات طے کرنے ہیں آپ اس کے ساتھ اسی کی زبان میں بات کریں تو وہ شخص تو آپ کو فوراً ہی اہمیت دے گا۔“  
 ”مجبور ہو جائے گا۔ فطری ہی بات ہے نا۔“ وہ چمن کی تعریفوں پر خاموشی سے مسکراتی رہی۔

”ابھی تمہیں شاید پتا نہیں ہے چمن! کہ یہ شخص زندگی کے ہر میدان میں یونہی جیتتا آیا ہے اسی لیے تمہیں حیرت ہو رہی ہے۔“  
 ”ارٹھنی بھائی تھنے جینس ہیں نا صبا! مجھے تو برا فخر ہوتا ہے اس بات پر کہ وہ ہم لوگوں کے کزن ہیں۔“  
 باقی سب کو لاؤنچ میں چائے دے کر وہ دونوں لانچ میں آ گئی تھیں۔

”اور بتا ہے صبا! ارٹھنی بھائی جب مجھے یونیورسٹی لینے آتے ہیں تو میری فریڈ زون کے پارے میں کتے

زبردست قسم کے کنٹریس دیا کرتی ہیں۔“  
 ”سیکھ سونیا اور شیطا تھیں کتنی ہیں۔“

”تمہارے اس کزن میں عجیب سی کشش ہے۔ میری بعض کلاس فیلوز جن سے میری خاص دوستی بھی نہیں ان تک نے اپنی طرف سے بڑی لاریوائی سے باتوں باتوں میں مجھ سے ارٹھنی بھائی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سچ صبا! لڑکیاں ارٹھنی بھائی پر مرقی ہیں۔ پتا نہیں انہیں یہ بات معلوم ہے بھی یا نہیں کہ وہ لڑکیوں میں کتنے پاپولر ہیں۔“ وہ چائے کے سپ لیتے ہوئے ارٹھنی ہی کو موضوع گفتگو بنائے ہوئے تھی۔

”وہ بے وقوف تو نہیں ہیں چمن! اچھے خاصے ذہن آدمی ہیں۔ ظاہر ہے انہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگی۔ بلکہ وی سی دل میں وہ اس بات پر بہت خوش بھی ہوتے ہوں گے اور کیا پتا وہ تمہیں یونیورسٹی لینے جاتے ہی اس لیے ہوں لڑکیوں کے پاگل پن کا مزا لینے کے لیے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ ارٹھنی بھائی اس طرح کے ہرگز نہیں ہیں۔“ چمن نے اس کے بھبرے کو تپاند کیا تھا۔  
 ”تو تم اس مقام تک آگئیں کہ تمہیں ان کی برائی بڑی لگ رہی ہے۔“ وہ خاموشی سے چمن کی طرف دیکھتی رہی۔



”تم سو گئیں صبا؟“ چمن جائے نماز تہ کر کے رکھتے ہوئے بولی۔

”نی اٹھال تو جاگی ہوئی ہوں۔“ اس نے بند آنکھیں کھول کر چمن کی طرف دیکھا۔ وہ کمرے کی لائٹ آف کر کے ٹائٹ بلب جلانے کے بعد بیڈ پر آ گئی تھی۔

”میں تم سے ایک بات شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ بہت پرستل بات۔ میں اس بات کا ذکر تم سے کرنا نہیں چاہتی تھی بلکہ کسی سے بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر پھر بھی میں تم سے اس بارے میں بات کرنے سے خود

کو روک نہیں پا رہی ہوں۔“ چمن کی مدھم سی آواز اس نے بڑے غور سے سنی۔ وہ اپنی جگہ پر لیٹے کے بعد اس کی طرف کروٹ لے کر بے ہوئے تھی۔

”ہو سکتا ہے یہ شخص میرا وہم ہو۔ انہوں نے من سے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ شاید میں خود ہی ان کی توجہ اور انکشاف کے غلط معنی نکال رہی ہوں۔ مگر اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا صبا! یچین کرو وہاں آسٹریلیا میں میرا ایک کلاس فیلو دل و جان سے مجھ پر فدا تھا۔ ہر وقت میرے آگے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ مگر مجھے اس میں بھی کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کبھی اس کا دلچھنا اور باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ صبا! کے ایک دوست کا بیٹا تھا وہ بھی بہانے بہانے سے ہمارے گھر میری وجہ سے آیا کرتا تھا۔ میں نے کبھی کسی لڑکے کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا۔ جب میں یہاں آئی تو شروع میں ارٹھنی بھائی کی توجہ کو صرف ایک کزن کا اچھا سلوک سمجھتی تھی۔ مگر پھر پتا نہیں کیوں مجھے آہستہ آہستہ ان کا یہ انداز اچھا لگنے لگا۔ تم بتاؤ صبا! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ میرے بارے میں کچھ مختلف انداز سے سوچتے ہوں؟ کیا یہ صرف میرا وہم ہے یا وہ واقعی مجھے غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں؟“ اس نے ہچکچاہٹ کے ساتھ اپنی بات مکمل کی تھی۔

”تم آج کل سارا وقت ان ہی نظموں کے حصار میں رہتی ہو۔ پھر بھی یہ بات بوجھ رہی ہو؟ کیا تم اس شخص کی نگاہیں بڑھتا نہیں جانتیں جن میں تمہارے لیے محبت اور والدانہ چاہت کے سوا کچھ اور ہوتا ہی نہیں ہے۔“ اس نے چمن کی طرف بغور دیکھتے ہوئے سوچا۔

”تم میں کس بات کی کمی ہے چمن! اتم سے تو کوئی بھی محبت کر سکتا ہے۔ خوش قسمت تو وہ ہو گا جس سے تم بھی محبت کرو گی اور یقیناً وہ خوش قسمت انسان ارٹھنی بھائی ہی ہیں۔ اور جو وہ بھاگے بھاگے تمہیں یونیورسٹی چھوڑنے اور لینے جاتے ہیں تو یقیناً خدمت خلق کے طور پر تو وہ ایسا ہرگز نہیں کرتے ہوں گے۔“ وہ اس سے کسی بھی قسم کی منفی اور دل توڑنے والی بات



نہیں کہہ پائی تھی۔ شمن اس کی بات سن کر بگڑتی ہوئی  
 مسکرائی تھی۔  
 "لیکن صبا! مجھ میں اور ان میں کتنا فرق ہے۔ وہ  
 کتنے کو ایذا پہنچا رہی ہیں۔ کتنے ہندو اور وہ ہیں اور میں  
 نے تو ابھی آئرز بھی کھل نہیں کیے۔ پھر میں ان کے  
 جیسی غیر معمولی شخصیت بھی نہیں ہوں۔"

"تو تم ان سے پانچ سال چھوٹی بھی تو ہو۔ انہوں نے  
 بہت زیادہ اعظیم حاصل کی ہے تو تم بھی کرو گی۔ اب  
 تک کے ایک ملک کی ریز میں تم ہمیشہ پوزیشن ہولڈر میں  
 ہی شامل رہی ہو اور تمہاری خوب صورتی کی اگر میں  
 نے تعریفیں کرنا شروع کیں تو تمہارا وجہ چرہ جاؤ گی۔ جو  
 کہ میں چاہتی نہیں ہوں۔" اس نے اچھے والے  
 انداز میں کہا۔

"صبا! تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ واقعی بہت اچھے  
 ہیں۔ سب کا خیال رکھنے والے۔ ان کا سب سے اہم  
 ہیو مرن کتنا اچھا ہے۔" شمن "اراضی کی تعریفیں کرنے  
 میں مصروف تھی اور وہ خاموشی سے اسے دیکھتے ہیں۔

"مجھے تو تمہیں یہ بتانا چاہیے کہ اگر اس شخص کی  
 آنکھیں بولی بھی ہیں۔ کیا تم نے کبھی ایسی زندگی سے  
 بھرپور چمک دار اور بولتی ہوئی آنکھیں دیکھی ہیں۔ وہ  
 مسکراتا ہے تو اس کی آنکھیں بھی مسکرائی ہیں۔ وہ مجھے  
 میں ہو تو اس کی آنکھیں بھی خفا خفا ہی نظر آتی ہیں۔  
 جب وہ لکھتے لکھتے کچھ سوچنے لگتا ہے تو بے خیالی میں  
 قلم اپنے لبوں میں دبالتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے کتنا  
 زبردست لگتا ہے۔ اسے غلی پاندھتے وقت کبھی شیشے  
 کے آگے کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بغیر  
 شیشے میں دیکھے بھی وہ اتنی زبردست ٹٹ بتاتا ہے۔ پایا  
 اور ڈیڑی سے بھی زیادہ اچھی۔ اسے ٹیو پیس بہت پسند  
 ہیں۔ اسے وائٹ لٹلی اور سفید گلاب بہت پسند ہیں۔  
 ساری دنیا سرخ گلابوں پر مبنی ہے اور اسے سفید  
 گلاب پسند ہیں۔ وائٹ گلر اس کا ہیورٹ گلر ہے ناں  
 اسی لیے تم میری وارڈ روب دیکھو شمن! اس میں اکثر  
 لباس تمہیں سفید رنگ کے نظر آئیں گے۔ ممانعتی  
 ہیں۔

"صبا تو بازار جا کر وائٹ گلر کے ڈیزائن کے ساتھ  
 کسی اور رنگ کے کپڑوں کو ہاتھ ہی نہیں لگائی۔  
 اسے کیٹس کی شاعری بہت اچھی لگتی ہے۔ اسے  
 سروپوں کی بارش بہت پسند ہے۔ وہ اپنے خیالات میں  
 گم ہو چکی تھی کہ شمن کی بات سن کر جھجکی۔  
 "پرسوں ان کی سالگرہ ہے نا" میں سوچ رہی ہوں  
 ہم دونوں مل کر انہیں کوئی تحفہ دیں۔ وہ ٹوک سے ہم  
 دونوں کے لیے تجھے لائے تھے۔ پھر میں بھی تو انہیں  
 کوئی تحفہ دینا چاہیے لیکن تجھے میں کیا چیز دینی چاہیے  
 یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اتنے دنوں میں میں  
 کے سب لوگوں کی پسند ناپسند سے بہت اچھی طرح  
 آگاہ ہو گئی ہوں۔ کس کو کھانے میں کیا پسند ہے جسے  
 میں کیا پسند ہے اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں۔ لیکن  
 ان کی کھانے میں پسند تک کامیں اندازہ نہیں لگا پائی۔  
 وہ تو ہر ڈش ایک ہی جیسی رفیت سے کھاتے ہیں۔ چنا  
 ہی نہیں چلتا انہیں کیا چیز اچھی لگتی ہے اور کیا  
 نہیں۔"

"میں نے بچپن میں ہم تینوں کو ایک بات سکھائی  
 تھی کہ کھانے کی میز پر بیٹھ کر کبھی کھانے کی برائی سے  
 کرنا بھی کسی کھانے کی چیز کو دیکھ کر منہ نہ بنانا۔  
 اللہ کی نعمت کو دیکھ کر منہ نہ بنانا تو لہذا ناراض ہو جانا  
 ہے رزق میں سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ ہم تینوں میں  
 سے بہت سب سے زیادہ اچھی طرح اس نے سمجھی۔  
 لیکن پھر بھی شمن! تم نے شاید بھی غور نہیں کیا۔ اگر  
 غور کریں تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ اسے پیڑ ڈال کر کھائی  
 ہوئی مسکڑی سبزیاں بہت پسند ہیں۔ وائٹ سیٹ وہ بہت  
 شوق سے کھاتا ہے۔ اسے مٹی ہوئی پھلی اور مہل  
 بھری ہوئی ہنڈیاں اچھی لگتی ہیں۔ چائینیز کھانے  
 اسے بہت زیادہ پسند ہیں۔ ابھی تو اس کی بہت سی  
 خوبیاں اور اچھائیاں تمہاری نظروں سے اوچل ہیں  
 شمن! جب تمہیں وہ معلوم ہوں گی تو تم مزید اس کی  
 عاشق ہو جاؤ گی۔"

براہر برابر ایسی وہ دونوں ٹوکیاں ایک ہی شخص کے  
 بارے میں سوچ رہی تھیں اس فرق کے ساتھ کہ

ایک جو سوچ رہی تھی اسے بول بھی رہی تھی اور  
 دوسری جو سوچ رہی تھی اسے بول نہیں سکتی تھی۔  
 اراضی کی سالگرہ کا دن تھا۔ شمن نے صبح اٹھنے کے  
 ساتھ ہی اس سے پوچھا تھا۔  
 "تمہارے ذہن میں کوئی گفٹ کیا۔ میں تو کل سارا  
 دن سوچتی رہی لیکن کوئی چیز میری سمجھ میں نہیں  
 آئی۔" وہ اراضی کو تحفہ دینے کے لیے بہت بے چین  
 نظر آ رہی تھی۔  
 "میں تو گفٹ بہت دن ہوئے خرید بھی چکی۔ سب  
 لی دفعہ اس کا اراضی کو تحفہ دینے کا پکا دل نہیں چاہ  
 رہا تھا۔ لیکن اس کے تحفہ نہ دینے پر کوئی اور چوٹ لگایا  
 میں کم از کم اراضی تو اس بات پر نہ صرف چوٹا بلکہ  
 ہالکھ اس کے پاس آ کر تحفہ نہ دینے کی وجہ بھی  
 دریافت کرنا۔"

"نکل دن پہلے جب وہ ایک روز مہار کے ساتھ شاپنگ  
 کرنے گئی تھی تو اراضی کو تحفے میں دینے کے لیے ایک  
 ٹوب صورت سی پٹی اور وائٹ خرید کر لے آئی تھی۔  
 "تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔ پرسوں رات بھی  
 جب میں اس بارے میں بات کر رہی تھی تو کبھی نہ  
 سن رہی تھیں۔" شمن نے مصنوعی غصے سے گھورا۔  
 "مجھے کیا پتا تھا کہ تم بھی انہیں گفٹ دینے کے لیے  
 اچھے بے تپ ہو۔ میں تو شروع ہی سے اراضی بھائی کی  
 برتھ ڈے پر انہیں گفٹ دیا کرتی ہوں اس میں کون  
 کی خاص بات تھی جو میں تم سے ذکر کرتی۔" اس نے  
 اچھے خاصے بے مروت انداز میں شمن سے کہا۔ لیکن  
 شمن بتا نہیں کہ اس کی بیٹی تھی جو اسے صبا کی کوئی  
 بات بری ہی نہیں لگتی تھی۔ اسے صبا کا بوجھ برا لگا اور  
 نہ یہ بات کہ صبا نے اسے تائے بغیر جا کر تحفہ خرید لیا۔  
 "میں پھر ایسا کروں گی کہ جا کر ان سے پوچھ لوں گی  
 کہ وہ گفٹ میں کیا لیں گے۔ سب اتنے مشکل بندے  
 کو میں خود سے کیا ہوں کم از کم میری سمجھ میں تو بالکل  
 نہیں آ رہا۔" اس نے نہ شمن کی بات کا کوئی جواب دیا  
 نہ اس بارے میں کوئی مشورہ کہ وہ اراضی کو تحفے میں کیا  
 دے۔ شمن کمرے سے چلی گئی۔ وہ خود بھی کانچ کے

لے تیار ہو چکی تھی۔  
 اپنی الماری میں رکھا ہوا گفٹ اس نے نکالا اور  
 اراضی کے کمرے کی طرف آگئی کمرے کا دروازہ کھلا  
 ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھلا دیکھ کر چلنے سے دستک دے کر  
 پونہ اندر جانے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن اندر کمرے  
 میں اراضی کے سامنے کھڑی شمن کو دیکھ کر اس کا  
 دستک دینے کے لیے اٹھا ہوا ہاتھ بے ساختہ ہی گر گیا  
 تھا۔ ان دونوں میں سے کسی کی بھی اس پر نظر نہیں  
 پڑی تھی۔ ایک دوسرے کے آنے سامنے کھڑے ہو  
 کر انہیں صبا حقیق نظر ابھی کیسے لگتی تھی۔  
 "میں آپ کو سالگرہ کی مبارکباد دے رہی ہوں۔  
 پوچھنے آئی ہوں کہ آپ مجھ سے گفٹ میں کیا لیں گے  
 بہت غور و فکر کیا میں نے لیکن آپ کو دینے کے  
 لیے کوئی چیز میری سمجھ میں نہیں آئی۔" وہ سناٹے سے  
 انداز میں اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ وہاں سے  
 فوراً پلٹ جانا چاہتی تھی۔ وہ ایسا نہیں کر سکی تھی۔  
 اراضی نے شمن کی بات بڑے غور سے سنی کچھ دیر وہ  
 یوں خاموش رہا جیسے اس بارے میں سوچ رہا ہو۔ پھر  
 اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بہت  
 گہرے اور گہرے لہجے میں پوچھا۔  
 "جو میں تم سے مانگوں گا وہ تم مجھے دو گی شمن؟"  
 شمن کا اس بات پر کیا رد عمل تھا وہ دیکھ نہیں پائی۔  
 کیونکہ وہ وہاں رہی ہی نہیں تھی۔ تیزی سے چلتے  
 ہوئے وہ وہاں اپنے کمرے میں آئی اور گرنے والے  
 انداز میں وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ گفٹ اس کے ہاتھوں  
 سے پھسل کر کارٹ پر گر گیا تھا۔ وہ وہاں رک کر کیا  
 کرتی؟ اقرار کا وہ اس کے لیے نہیں شمن کے لیے  
 تھا۔ وہ لکھ نہ اقرار اور وہ شخص شمن کے لیے تھا اسے  
 دونا نہیں آ رہا تھا وہ ساکت بیٹھی اپنے دل کے کرجی  
 کرتی ہو کر ٹوٹے اور بکھرے کی آوازیں سن رہی  
 تھی۔

عجب سے در محبت کا جو مرضی پر نہیں کھتا  
 نہیں چٹا میاں سم سم کسی کو دوش کیا دیں ہم  
 "کمال عتاب ہو بے مروت لڑکی اور کمال چھپا کر



دیکھا ہوا ہے تم نے میرا گفٹ؟" شام کو ارٹھی نے اس کی شکل دیکھتے ہی شکوہ کیا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر بڑی ہلادی سے مسکرائی اور پھر ہمیں ابھی تکی کہہ کر دیوں سے بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی اور جلدی سے تختہ اٹھا کر لے آئی۔ ارٹھی کے ہاتھ میں اس نے تختہ چڑھایا جسے اس نے بخوشی "شکر" کہتے ہوئے قبول کر لیا۔ لادج میں اس وقت گھر کے سب افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ارٹھی نے فوراً ہی تختہ کھول لیا تھا۔ خود جلی اور والٹ کا خوب اچھی طرح معائنہ کرنے اور بہت ساری تقریبات کرنے کے بعد اب وہ باقی سب لوگوں کو بھی صبا کا دیا ہوا تختہ دکھانے لگا۔

"اسے کہتے ہیں جی محبت۔ تختے پر سے جہانے سا لگہر کے دن سے تختے پہلے ہی سے تختہ خرید کر رکھا ہوا تھا۔ یہ نہیں کہ وقت کے وقت اور بی بی دل سے رسم نبھانے کو پوچھنے کھڑی ہو جاتی کہ ارٹھی بھائی! آپ تختے میں کیا لکھیں گے؟" ارٹھی کی بات سب سے زیادہ اچھی طرح پہلے شن اور صبا ہی سمجھ سکتی تھیں۔ شن نے ارٹھی کی نظریں اور ہنسل کی معنی خیزی محسوس کرتے ہوئے بے ساختہ اس سے نظریں چرا لیں تھیں۔ وہ اس کے اس انداز پر ذرا لب مسکرا رہا تھا۔ ظفر ارٹھی کے طعنہ دینے پر یہ سمجھا کہ وہ شاید اسے اور شن کو مشترکہ طور پر شرمندہ کرنا چاہ رہا ہے، اسی لیے فوراً لڑنے والے انداز میں بولا۔

"بھائی صاحب! وہ دن گزر گئے جب ہم اتنے بے وقوف ہوا کرتے تھے۔ اب ایک ہاتھ دو اور ایک ہاتھ لو کا زمانہ ہے۔ اگر گفٹ وصول کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر پہلے ہمیں شاید اس ساؤنڈ کرانے وہ بھی ہم لوگوں کی پسند کی جگہ پر پھر گفٹ وغیرہ کی کوئی امید رکھیں گے۔ یہ بغیر ٹریٹ کے گفٹ تو آپ کو صرف آپ کا چچا گروپ ہی دے سکتا ہے۔" جیلے کے اختتام پر ظفر نے ایک شوخ سی نظر صبا پر ڈالی تھی۔ اسے پتا تھا چچا گروپ کھلائے جانے پر وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ بلانے اس موقع پر اس کی مشکل جھانک کر دی تھی اور جھٹ اس کی حلیت میں بولنا شروع ہو

گئے تھے۔ اس نے تشکر آمیز نظریوں سے بلانے کی طرف دیکھا۔

ارٹھی ان لوگوں کو رات کا کھانا ہر کھانے لیا رہا تھا۔ شن اور ظفر ساتھ جا کر ارٹھی کے لیے ان دونوں کی طرف سے ایک مشترکہ تختہ لے آئے تھے۔ "صبا! میں کون سے کپڑے پہنوں؟" وہ بلی سے ایک سلوہ سا سوٹ استری کر رہی تھی جب شن نے اس سے پوچھا۔

"یہ ریڈ والا یا یہ سی گرین یا پھر یہ بلیک والا؟" وہ تین چار ڈنگر زاپے ساتھ لگائے کھڑی تھی۔

"متم کچھ بھی پہن لو، اچھا لگے گا۔" اس نے ان تمام ڈریسز پر ایک نگاہ ڈال کر سنجیدگی سے کہا۔ لیکن وہ اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ "بتاؤ نا، ان ساپٹوں؟" اس نے دوبارہ اصرار کیا۔ اس کے اصرار پر آخر کار اسے اپنی رائے دینی ہی پڑی۔ وہ آج بہت اہتمام سے تیار ہو رہی تھی۔ صبا اس کی تیاریوں کو خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ تیاری کے معاملے میں اس نے شن کو اتنا حساس اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"آج کچھ خاص دن ہے شن؟ میں تو جیسے بہن کی نظریوں سے دیکھ رہی ہوں اور ظاہر بات ہے مجھے تم ہر طرح کی باری لگتی ہو چاہے تم لائن کا پراٹھا سا سوٹ پہن کر اور پاؤں میں جمل چپڑ کر ماسیوں والا حلیہ بنا کر بھی میرے سامنے آؤ تو مجھے تم تب بھی اچھی ہی لگو گی۔"

(اور جن نظریوں سے آج تم خود کو جاچ رہی ہو تو بے فکر ہو۔ وہاں تمہارے لیے ستائش ہی ستائش کی۔ وہ نظریں تمہارے چہرے کے علاوہ کسی اور کو دیکھیں گی ہی نہیں۔)

پھر جب وہ چاروں ہونٹوں میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے اپنی اپنی پسندیدہ ڈشز سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو شن کی طرف دیکھتے ہوئے اسے پتا چلا کہ جب کسی لڑکی کو چاہا جاتا ہے تو چاہے جانے کا لکھا سا احساس اسے مزید خوب صورت بنا دیتا ہے۔ شن تقریباً "سارا وقت زیادہ تر خاموش رہی تھی۔ سر

جھکائے کھانا کھاتی ارٹھی سے نظریں چرا آئی اور اس کے گالوں پر کھراؤ نکلا۔ صبا سے دیکھ کر میں حیران ہو رہی تھی۔

اس کا چہرہ کشادہ کش، آنکھیں من موہنا سا لگ رہا تھا۔ اس پر سے نظریں ہٹانے کو صبا کاخی نہیں چاہ رہا تھا۔ ارٹھی ہلانے ہلانے سے اسے مخاطب کر رہا تھا اور وہ اس کی عام سی باتوں پر بھی بڑی طرح کنفیوز ہو رہی تھی۔

ارٹھی بڑی مصروف زندگی گزار رہا تھا۔ اسے کبھی تقریباً "لوگوں کے ساتھ وقت گزارنے کا شوق نہیں رہا تھا۔ اس کے لندن سے واپس آنے کے بعد سے اس مسلسل اس کے پیچھے لگی ہوئی تھیں کہ وہ شادی کے لیے کسی لڑکی کا انتخاب کر لے۔ ان کی خواہشات اور خوشیوں کا احترام اپنی جگہ لیکن وہ اتنی جلدی شادی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ پلایا اور ڈیڈی کے ساتھ مل کر اپنے بڑے کو مزید پھیلا نا اور آگے بڑھنا چاہتا تھا۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ اس نے کبھی لڑکی کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا جسے وہ اپنی شریک سفر بنانے کا فیصلہ کرے۔ وہ خوب صورتی سے متاثر ہوا تھا مگر صرف اس سے متاثر ہو کر وہ کسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی زندگی میں آنے والی اس لڑکی کے پاس خوب صورت سوچ، خوب صورت ذہن اور خوب صورت دل ہونا چاہیے تھا۔ خوب صورت چہرہ چاہے ہو یا نہ ہو۔ لیکن شادی سے اس کا یہ انکار اس روز دھرا کا دھرا ہو گیا جب اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ شن سے محبت کرنے لگا ہے۔ وہ لڑکی اچانک اس کی زندگی میں آئی اور بس ہر جگہ چھا گئی۔ وہ جو ہر کلام بہت سوچ سمجھ کر اور جذبات کو اعصاب پر سوار کیے بغیر کرتے کا علوی تھا اسے شن سے بس ایک دم ہی محبت ہو گئی۔

وہ اچانک ہی ان سب کی زندگی میں چلی گئی تھی۔

صبا کی حیثیت سے آنے والی ابھی سی شن اور اس لڑکی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ تب وہ ان لوگوں کو پراٹھا سمجھ کر دور دور رہتی تھی اب جب اس گھر کو اپنا بن کر یہاں رہنے لگی تو ارٹھی کو پتا چلا کہ شن کا وہ سراپا نام محبت ہے۔ اسے خالق نے محبت کی مٹی سے تخلیق کیا ہے۔ وہ محبت کرنے اور محبت مانگنے کے لیے بنی ہے۔ گھر والوں کی توبہات کیا تھی ان سے تو اس کا خونی رشتہ تھا۔ اسے تو راستے میں پکڑا جھٹے اور بھیک مانگتے بچوں تک سے محبت ہو جایا کرتی تھی۔ وہ وہ ہیں تھی سمجھ دار تھی، پیغمبر تھی، وہ اپنی عمر سے زیادہ ذمہ دار تھی۔ اس کی بہت سی باتیں ارٹھی جیسی تھیں۔

ارٹھی اس سے بے حد متاثر تھا۔ خود میں موجود اتنی ساری خوبیوں کے باوجود اس میں ایک بے نیازی تھی۔ اپنی خوبیوں سے بے نیازی۔ اسے جیسے اس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ وہ بہت خوب صورت ہے، وہ نہیں ہے۔ وہ سرے لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ اس کی خود اپنے آپ سے یہ بے نیازی اور لاروائی ارٹھی کی نظریں میں اس کی خوبیوں کو کئی گنا بڑھا گئی تھی۔

پھر کچھ اور وقت گزرا تو اسے احساس ہوا کہ وہ صرف شن کی خوبیوں سے متاثر نہیں ہے بلکہ وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ محبت کا یہ انکشاف کتنا اچانک ہوا تھا اس پر اور جب اس پر اس محبت کا انکشاف ہوا تو اسے اس محبت پر بہت فخر محسوس ہوا۔ اس لیے کہ اس نے جس لڑکی سے محبت کی تھی وہ واقعی اس قابل تھی کہ اس سے محبت کی جائے۔ شن کے لیے لڑکی کی دیوانگی خود اس کے اپنے لیے بہت حیرت انگیز تھی۔

اسے یونہی ہی لانے کی خاطر وہ اپنی ضروری سے ضروری اپائنٹمنٹ تک کیٹل کر دیا کرتا تھا۔ محبت لڑکی اس کی دیوانگی سے انجان ہونے لگی تھی بے نیاز تھی۔ وہ اس کے ساتھ بڑی اچھی طرح بات کرتی تھی، لیکن اس میں ابھی تک وہی پہلے والا تکلف اور دوری جاگل تھی۔ کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ شن سے پوچھے۔ "شن! کیا تمہیں میری محبت کا احساس ہی نہیں یا



پھر تم جان بوجھ کر بے نیازی ظاہر کرتی ہو۔ میری آنکھوں میں لکھا پیغام تم کیوں نہیں پڑھ پائیں؟ اس کی بے قراری ہرگز رتے دن کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ اس نے ارٹھی کی آنکھوں میں موجود پیغام دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ براہ راست اس کی نگاہوں میں دیکھنے سے گھرانے لگی، اس سے بات کرتے کرتے وہ اس کی نگاہوں کی وارفتگی دیکھ کر یکتخت چپ ہو چلا کرتی۔ لیکن اس گریز اور اس خاموشی میں اس کے لیے ایک بہت خوب صورت سا اقرار چھپا ہوا تھا۔

وہ اس رات سونے سے پہلے اہل کے کمرے میں آ گیا۔ اہل اس کے لیے بالکل ہال کی طرح تھیں اسے ان سے بات کرتے ہوئے بھی لفظ آکٹھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ان سے اپنے دل کی باتیں کیا کرتا تھا۔

”اہل! آپ جانتی ہیں تاکہ میں شادی کے لیے ہاں کہہ دوں؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بیٹا! تمہاری شادی تو میری زندگی کا سب سے بڑا ارمان ہے۔ جس لڑکی کو تم پسند کرو گے ہم سب اسے دل و جان سے قبول کریں گے۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے جواب دیا۔

”میری پسند وہ لڑکی ہے جو تب سب کو بھی بہت پسند ہے۔ میں تم کی بات کر رہا ہوں اہل! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کے منہ سے تم کی کا نام سن کر اہل کو بے تحاشا خوشی ہوئی۔ اس نے اس لڑکی کو پسند کیا تھا جس سے اس کی شادی اس گھر کے ہر فرد کا ارمان تھی۔ ”اہل! بیٹا! ڈیڈی اور ماما سب کے سب ارٹھی کی تم کی ساتھ شادی کے خواہش مند تھے۔ دل کی یہ خواہش انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کے سامنے ظاہر کر دی تھی لیکن ارٹھی سمیت بچوں میں سے کسی کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا کہ اگر ارٹھی نے اس رشتے سے انکار کر دیا تو خواہ مخواہ آپس میں دل برے ہوں گے۔“

لیکن اس نے تو وہی بات کہہ دی تھی جو سب کی ہوتی تھی۔ اہل نے صبح کا انتظار بھی بڑی مشکل سے کیا تھا۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے پایا ڈیڈی اور ماما کو اس بات سے آگاہ کیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں گھر کے تمام افراد کو اس بات کا پتا چل گیا۔ ماما نے تم کی رضا مندی لینے کے بعد اہل کو باقاعدہ اس رشتے کے لیے ہال کہہ دی تھی۔ اسی دن رشتہ دیا گیا اسی دن رشتہ طے ہوا اور اسی دن مٹھی کی تانیں بھی طے کر لی گئی۔ ظفر کے امریکہ جانے میں صرف چار دن رہ گئے تھے۔ اس کے جانے سے ایک دن پہلے مٹھی کی تقریب ہوئی تھی۔ وقت بہت کم تھا اور اہل نہایت دھوم دھام سے تقریب کرنا چاہتی تھیں۔ اسی لیے کہ میں خوب بھاگ دوڑ رہی ہوئی تھی۔ ارٹھی کے لیے سب ایک حسین خواب کی طرح تھا۔

”کون کتنا ہے محبت جہر ہے مار سالی ہے دکھ ہے آنسو ہے۔ لفظ بالکل غلط۔“ اس نے خود سے کہا تھا۔ ”محبت کرنے والوں کو بیش ہی تو مل صراط کا سفر ملے نہیں کرنا پڑا۔ کبھی کبھی سب کچھ من چاہی ہو تو ہو جانا کرنا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے میرے ساتھ ہوا ہے۔“

\*\*\*

وہ حاسد نہیں تھی، کم ظرف نہیں تھی جو اپنی بہن کی خوشیوں سے حسد کرتی۔ وہ اس کی خوشی میں خوش ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے خود کو ارٹھی کی برسوں پہلے کی ایک بات یاد دلانی چاہی۔

”ضروری نہیں جب جو میں چاہوں وہ مجھے مل بھی جائے۔ کبھی میرے بہت چاہنے پر بھی مجھے میری پسندیدہ چیز میں مل سکتی اور مجھے اسے نارمل طریقے سے لینا چاہیے۔“

”میں آپ جیسی حقیقت پسند اور سنجیدہ نہیں۔ کبھی ہاں لوں کہ جو میں نے چاہا وہ میرے بجائے کسی اور کو مل رہا ہے۔“ اس نے اس پر پیشے ارٹھی کی طرف دیکھا جو ہنسنے لگی تھی۔ اس نے کچھ کہہ رہا

”مجھے یقین نہیں آ رہا تھا! کیا محبت کرنا اور اسے پا کر اپنی آسماں ہوتا ہے؟“ تم کی خوشی کی انتہا پر پہنچ کر مٹھی سے پوچھ رہی تھی۔

”نہیں یہ سب اتنا آسان نہیں ہوتا۔ صرف چند دن قسمت ہوتے ہیں جنہیں محبت حاصل ہو جاتی ہے اور تم جن چند خوش نصیب لوگوں میں سے ایک ہو گے۔“ وہ بس سوچ کر رو گئی تھی۔

”تم کی بات آج بولنے کے لیے بہت کچھ تھا، وہ تمہارا خوشی تھی۔ کتنی دیر تک وہ اس کے ساتھ رہے اس خوشیوں بھرے یادگار دن کے حوالے سے باتیں کرتی رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے تم سو گئی تھیں اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے اس آکر کھڑی ہو گئی۔ آسمان پر جنگ کا تاج چاند اسے اس کے لیے اتنا جھانک رہی تھی۔

”تم تھا ہوا سی لیے اتنے لو اس ہو۔ لو اس مت ہو۔ کھو میں بھی تمہاری طرح آج بالکل تنہا ہوں۔“ وہ خاموش کھڑی چاند سے باتیں کر رہی تھی۔

\*\*\*

وہ سب لوگ ایمر پورٹ پر ظفر کو سی آف کرنے آئے تھے۔

”جیسے ہی تصویریں آئیں فوراً“ مجھے بھیجنی۔ ظفر نے تم کی آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اہل! آپ نے دیکھا یا کو۔ اس نے اس معاملے میں بھی میرے ساتھ نا انصافی کی ہے۔ ارٹھی کے ملان جانے پر یہ کیسے پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور ان دیکھیں! مجھے مزے سے کھڑی ہے۔“ وہ جانتے جانتے بھی اسے چھیڑ رہا تھا۔ اس کے طعنہ دینے پر سب اس پر بے تحاشی ہنسنے لگے کہ تم بھی مڑتے مڑتے ہی بڑی تھی۔ سب کو خدا حافظ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ وہ دم آگے بڑھ اس نے گردن موڑ کر سب کی طرف اٹھاتے نظریں سب پر سے ہوتی ہوئی صبا پر جا کر ٹھہر گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو برہے رہے تھے۔ وہ

بالکل خاموشی سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک دم پلٹ کر واپس گیا۔

”ارے صبا! میں مذاق کر رہا تھا۔“ وہ اس کے پاس آ کر بولا۔

”ظفر بھائی! آپ جلدی ہو آپس آئیے گا۔ اب آپ ارٹھی بھائی کے ساتھ کوئی ٹیم ٹھیکس کے تو میں آپ کو سپورٹ کروں گی۔“ وہ مڑتے ہوئے اسے یقین دلانا رہی تھی۔ ظفر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

ظفر کے جانے پر اواسی اور خوشی کے طے جلتے جذبات لیے وہ لوگ گھر واپس آ گئے تھے۔ شام تک سب یونہی کچھ خاموش خاموش سے رہے۔ ارٹھی، تم کو زبردستی ہارنے جا رہا تھا۔

”صبا! تم بھی چلو۔“ ارٹھی نے آفری۔

”مجھے کلب میں بڑی بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ اخلاقاً مجھے ساتھ ملنے کو کہہ رہے ہیں اگر میں واقعی ملنے کے لیے تیار ہو گئی تو دل ہی دل میں مجھے گالیاں دیں گے۔ پھر موتا۔“ آپ دونوں مجھے برواشت کر س کے اور میری وجہ سے آپ لوگوں کو آپس میں اختلافی احتقان کھٹکھٹائی پڑے گی۔ ہو سکتا ہے پھر آپ اس سے پاکستان کی قانون اور آئین کا پالیسی ڈسکس کریں اور یہ آپ کو کبھی کے پھول اور گیندے کے پھول کے درمیان موجود بنیادی فرق سمجھانے لگے۔“ اس کے منہ پھٹ سے انداز پر ارٹھی قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا جبکہ تم گالیاں کی موجودگی کی وجہ سے بری طرح چھینچھپ گئی تھی۔ خود اہل کے لیوں پر اس کی بات سن کر مسکراہٹ نہ دیتی تھی۔

\*\*\*

اس نے یونیورسٹی میں ایڈ مشن لے لیا تھا۔ وہ کیمسٹری میں آنرز کر رہی تھی۔ وہ اور تم یونیورسٹی ایک ساتھ جایا کرتی تھیں۔ اس نے اپنے ذہن سے سب سوچوں کو جھٹک کر خود کو بڑھائی میں مصروف کر لیا تھا۔ اب اس کیلئے میں بھی نہیں مروتی تھی اس نے



جیسے اس رشتے کو قبول کر لیا تھا۔ دنیا میں ارتضیٰ غضنفر ہی تو ایک اچھا شخص نہیں اس جیسے بلکہ اس سے بھی زیادہ اچھے مرد اس دنیا میں موجود ہیں۔ اسے شمن پسند ہے تو ٹھیک ہے۔ وہ کیوں بیکار میں خود کو بھانکنے لگے۔ ایسے شخص کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ کیوں اس میں رہتی رہتی ہے اس سے بھی محبت بھی ہی نہیں۔ اس نے ارتضیٰ غضنفر کے ساتھ اپنی ایک طرف محبت کو حماقت قرار دے کر خود کو مزید اس حماقت میں جتلا رہے ہیں۔

رات کے کھانے کے بعد وہ سب لوگ لاونج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شمن سب کے لیے کافی بنا کر لے آئی۔ ارتضیٰ کا اگرچہ آج کل گراہی میں قیام بہت مختصر ہو گیا تھا، پھر بھی اس مختصر وقت میں شمن کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اسے اس کی پسند کی چیز بنا کر کھلائے۔ رات میں اسے کافی بنا کر دے۔ وہ ارتضیٰ کے پیچھے لگ کر اس سے پوچھتی تھی کہ وہ کیا چیز کھانا چاہتا ہے۔ صبا کو اب اس کے لیے کافی بنانے اور ناشتہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کی ان سب ضرورتوں کا خیال رکھتے کے لیے شمن کافی تھی اور صبا کو اس بات سے کوئی فرق بھی نہیں پڑا تھا۔

ارتضیٰ نے کپ اٹھا کر پہلا گھونٹ لیا اور فوراً بولا۔

”کافی اچھی ہے شمن! لیکن اس میں وہ بات نہیں ہے جو صبا کے ہاتھ کی بنی کافی میں ہوتی ہے۔“ اس کے اس صاف گواہی کا شمن نے ذرا بھی برا نہیں مانا تھا۔ ”واقعی صبا بہت اچھی کافی بناتی ہے۔ میں کتنی بھی کوشش کر لوں اس کے جیسی مزہ دار کافی نہیں بنا پاتی۔“ اس نے بڑا اعتراف کیا تھا۔

”اچھا کھانا بہت لوگ بنا لیتے ہیں، لیکن اچھی چائے اور اچھی کافی بنانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ کیوں پایا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“ وہ بڑے موڈ میں اس کی تعریف کرتے ہوئے اب پایا کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پایا تائیدی انداز میں مسکراتے ہوئے خود بھی کچھ کہنے والے تھے۔ وہ خاموشی سے

بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ اسے اپنی اس تعریف پر خوشی نہیں ہوئی تھی۔ کچھ سمجھ کر کی جائے والی بات ارتضیٰ پر اسے کوئی خوشی نہیں ہوتی تھی۔

اس نے ارتضیٰ غضنفر کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا لیکن پھر بھی وہ اس کے کراچی میں اس کے وجہ سے ڈسٹرب ہو جایا کرتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایک دولن کے لیے بھی کراچی نہ آئے۔ اس کی شمن موجودگی اسے بڑا سکون پہنچاتی تھی۔ وہ جب پہلا آ کر تو اسے دیکھ کر ہر لمحہ اسے ایسا لگا جیسے اس کی کوئی بات اپنی چیز جس کی وہ مالک تھی جیسے وہ کسی اور کو اپنے مرکز بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ مسلسل اس سے بات ہوتی چلی جا رہی ہے اور وہ بے بسی سے کھڑی اسے دیکھ رہی ہے۔

اپنی اس سوچ پر وہ خود کو سخت لعنت ملامت کرتی۔ خود سے فغا ہو جاتی تھی۔ اسے اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں سوچنا۔ اسے اس شخص کی قطعاً کوئی شمن نہیں۔ وہ شمن سے شادی کرے یا کسی سے بھی اس کی بات ہے۔

شمن کے اطفالوں کے فوراً بعد شادی کی تاریخ طے دی گئی تھی۔ گھر میں کئی دن میلے سے ڈھولک بجاتی شروع ہو گئی تھی۔ ان لوگوں کی کزنز اور شمن کی بہیلیاں سب مل کر رات گئے تک ڈھولک بجاتی گیت گاتیں۔ شمن بھی شرمیلی شرمیلی سی ان لوگوں کے پاس ہی بیٹھی ہوتی۔ مگر ہر بار شمن کے خوشیوں سے جھگڑتے اور مسکراتے چہرے کو دیکھ کر شاہانہ کہیں کہیں اس کی خوشیوں کے دائمی ہونے کی امانت کرتیں۔

”ہاں! دعا کریں میری بیٹی کی خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے۔“ اس روز رات کو وہ لہاں کے کمرے میں ان کے پاس بیٹھی پایا کے فکشن کے بارے میں ان کے مختلف خیالات سن رہی تھی جب مگر اسے میں آ کر لہاں کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”لیبر! تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا! آپ بچوں کی خوشیوں کے لیے دعا کرنے کے علاوہ کب

سے اس زندگی میں اور بے بسی کیلئے۔“ انہوں نے مگر اتنا کہنے پوڑھے اور کمزور ہاتھوں میں لے کر بہت سے کہنا۔ وہ کمرے میں آئی تو شمن جاگی ہوئی تھی۔

”تم سوئیں نہیں ابھی تک؟“ پایاں میں سے بیڈنگ میں کر ڈرنگ ٹیبل پر اچھالتے ہوئے اس نے کہا۔

”بند دل رہ گئے ہیں تمہارے ساتھ اس کمرے میں گزارنے کے لیے شمن ان دنوں میں سونے کے بارے میں بہت ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“ ان کچھ اور اسی سے بولی۔ وہ چوٹی کھول کر بالوں میں اکیس چلاتی ہوئی بیڈ پر آئی۔

”صبا! تمہارے اس کمرے میں میں نے اپنی زندگی بہت خوب صورت دور گزارا ہے۔ یہاں بے شمار چیزیں تم نے میرے آنسو صاف کر کے مجھے جینے کا عمل دیا اور میں نے اپنی زندگی کا سب سے بہترین خواب دیکھا پھر اپنے اس حسین خواب کو تعبیر نے دیکھا۔“ اس کی آنسو سے ایک دم ہی آنسو بننے لگے۔

”پگل ہو! تم کون سا شخص ہو کر کسی دوسرے کو میں جانے والی ہو جو یوں رو رہی ہو۔ تمہیں یہ گھر ملے ہے تو یہ تمہارا ارتضیٰ بھائی لے لو اور ارتضیٰ بھائی کا کہہ میں لے لیتی ہوں۔“ اس نے دوتے دوتے صبا کو غور کر دیکھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو خشک کرنے چاہے تو وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر اور شدت سے رونے لگی۔

”محبت کمرے کی نہیں ہے۔ محبت تمہاری ہے۔ صبا شفیق کی، میری بہن کی، میری سب سے اچھی دوست کی۔ میں تمہیں مس کر لوں گی صبا!“ وہ مسلسل کہنے لگی جا رہی تھی۔

”تم میں کیا ہے صبا! میں تم سے کچھ بھی چھپا رہی ہوں۔ میرا دل خود بخود تمہاری طرف کھینچ رہا ہے۔“ اس سے محبت کا وہاں انداز میں اقرار کر رہی تھی اور صبا کے اندر دور تک سناٹا پھیل گیا تھا۔

”میں اس محبت کےائق نہیں شمن!“



آسمانی رنگ کا شرابہ بنے بہت نفیس سی جیولری اور مہارت سے کیے گئے ٹیک پ کے ساتھ وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ اپنے لیے سلی بالوں کو اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بالوں کی بچ سے ٹانگ نکال کر جو نازک سا ٹیکا اس نے اسے برساتا تھا اس نے اس کی تیاری کو مزید دلکشی عطا کی تھی۔

”صبا! تم لڑکے والی ہو یا لڑکی والی؟“ ظفر شادی سے پانچ دن پہلے آ گیا تھا اور آتے ہی اس نے شادی کے بہت سے کام اپنے ذمے لے لیے تھے۔ لیکن صبا کے ساتھ چھینر تھا۔ وہ بھی جاری تھی۔

”میں لڑکے والی بھی ہوں اور لڑکی والی بھی۔“ ”شمن! اس خدا کا خیال رکھنا۔ کیسے جیسا نہ ہو آخری وقت میں یہ تمہیں ہری بھنڈی دکھا کر دوسما کی گاڑی میں بیٹھ کر بات کے ساتھ آئے۔“ سارے فکشنز بڑی اچھی طرح ہو گئے تھے۔ شادی کے دن بھی وہ بڑی متحرک سی ادھر سے ادھر پھر رہی تھی۔

”دلہن کی بہن کو ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں پڑ رہی۔ وہ الگ ہی نظر آ رہی ہے۔“ اس نے اس کے گل پر ہاتھ کرتے ہوئے تعریف کی۔

”آج کا دن تو میں صبا کا ہے۔ اس کے آگے ہم سب کی تیاریاں بالکل فضاں لگ رہی ہیں۔ ویسے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں دلہن کی بہن کہیں یا نہ۔“ اس کے کنکشن پر بالی سب کزنز بھی پریشان۔

وہ خود بھی مسکراتے ہوئے پایا کی بات سننے چلی گئی۔ اس کے پاس اپنی کیفیتوں کا تجزیہ کرنے کی فرصت نہیں تھی لیکن اتنا اندازہ تو اسے تھا کہ بھری محفل میں تنہا ہونے کی یہ کیفیت آج صبح سے اسے اپنی لپٹ میں لیے ہوئے تھی۔ اسے رونا آ رہا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ نہیں چھپ جائے اور سب سے چھپ کر بہت سا روتے۔ نکلنے کے وقت شمن کے ایک طرف لہاں اور ایک طرف ماما بھی ہوئی تھیں۔ وہ خود بھی شمن کے



ہوئی تمام لڑیاں نوج ڈالے۔ اس کمرے میں چاروں طرف بکھرے ان پھولوں کو اپنے قدموں تلے مسل ڈالے اور ان پھولوں کے درمیان بیٹھی اس حسین لڑکی کو کہیں غائب کر دے۔ آج کتنے دنوں بعد بے اختیار پھر اس کے دل سے یہی جملہ نکلا۔

”تم یہاں پر کیوں آگئیں شمن! تم یہاں نہ آئیں تو کتنا اچھا ہوتا۔“ سب کزنز، شمن کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔ وہاں اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنا ہی نہیں دے رہی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ دروازہ لاک کر کے اس نے خالی کمرے کو ایک نظر دیکھا۔ آج یہاں شمن نہیں تھی۔ وہ اپنے کمرے میں بالکل اکیلی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے رو سکتی تھی۔ دل کی دنیا کے لٹ جانے کا ماتم کر سکتی تھی۔ اتنے گھنٹوں سے خود کو سنبھالتے سنبھالتے وہ تھک چکی تھی۔ خود پر سے اختیار کھوتی وہ بلیک بلیک کر رو پڑی تھی۔ جتنا وہ رو رہی تھی اتنی ہی اس کی وحشت بڑھ رہی تھی۔

”کیوں نہیں مجھے میری محبت ملی؟ جسے میں نے ہمارا وہ کسی اور کو کیوں مل گیا؟ ایسا کیا ہے شمن میں؟ جو مجھ میں نہیں ہے؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ اس شخص کو چاہتی ہے؟“

وحشت زدہ انداز میں اس نے اپنا ٹیکانوج ڈالا۔ پھر گلے کا ہار، کانوں کے بندے، وہ جنونی انداز میں سب کھینچ کھینچ کر اتارتی رہی۔ چند منٹوں میں اس نے اپنے روپ کو اجاڑ ڈالا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر خود کو آئینے میں دیکھا اور پھر اسی سے سرٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”ایسا کیا گناہ کیا تھا میں نے جو تو نے میرے مقدر میں یہ دکھ لکھ ڈالا؟“

”اگر وہ مجھے نہیں ملنا تھا تو پھر اس کی محبت بھی میرے دل میں نہ ڈالی ہوتی۔“ وہ روتے روتے کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

”کیوں ڈالی میرے دل میں اس شخص کی محبت؟ مجھے مل نہیں سکتا تھا۔“ اس سے اپنی چیخیں دہائی نہیں

قریب ہی کھڑی ہوئی تھی۔ جس وقت شمن نے نکاح نامے پر دستخط کیے، اس نے اپنے ارد گرد سناٹا پھیلتا محسوس کیا۔ اسے ایک مرتبہ پھر ایسا لگا جیسے وہ کسی ریگستان میں تنہا کھڑی ہے۔ کہیں کوئی آواز نہیں۔ دور دور تک کوئی اپنا نہیں۔ وہ بالکل تنہا ہے۔

کوئی اس کے رونے پر متعجب نہیں تھا نہ اس کے برابر میں کھڑی کسی کزن نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ شمن کو اسٹیج پر لا کر ارتضیٰ کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ ان دونوں کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر اسے آج بھی بالکل ویسی ہی تکلیف ہوئی تھی جیسی پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہونے پر ہوئی تھی کہ ارتضیٰ غصہ فر جس لڑکی سے محبت کرتا ہے وہ صبا نہیں بلکہ شمن ہے۔

وہ اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔ خود کو سیر زلش کرتے ہوئے آنسوؤں کو بار بار پیچھے دھکیل رہی تھی۔

مختلف رسموں اور تصویروں اور مووی کے لیے اسے بار بار آوازیں دی جا رہی تھیں۔ وہ اسٹیج پر گئی اور ارتضیٰ کے مسکراتے ہوئے چہرے پر اس کی نظر پڑی تو اسے پتا چلا اس شخص کی محبت اس کے دل سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ وہ لا تعلقی اور بے نیازی کا خول جو اتنے دنوں سے اس نے خود پر چڑھا رکھا تھا یککھٹ چٹخ گیا تھا۔ وہ سب کے ساتھ ساتھ خود کو بھی دھوکا دیتی رہی تھی۔

”تم نے مجھ سے میری محبت چھین لی ہے شمن! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ اسے اس لڑکی سے آج پھر شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

”صبا! شمن کو اس کے کمرے میں لے کر جاؤ۔“ گھر واپس آکر کچھ دیر رسومات کا سلسلہ چلا۔ ان سے فارغ ہو کر اماں نے اسے شمن کو اس کے کمرے میں پہنچانے کے لیے کہا تھا۔ وہ اپنی چند کزنز کے ساتھ شمن کو لے کر اس کے کمرے میں آگئی اسے اس پھولوں بھری بیج پر بٹھاتے وقت اس کے دل کو ناقابل بیان تکلیف ہوئی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا اس بے سچے سچے کمرے کو اجاڑ دے۔ سرخ گلابوں اور موتیوں کے پھولوں سے مہکتی



جاری تھیں۔

"اس ساری کائنات میں کسی چیز کی کی آجانی ہو اگر مجھے میری محبت حاصل ہو جاتی۔ کوئی بہت اہمونی خواہش تو تھیں کی تھی میں نے فقط ایک شخص جو جس طرح ختم کو مل گیا ہے اسی طرح مجھے بھی تو مل سکتا تھا۔" وہ روتے روتے اٹھ کر باہر نکلتی تھی۔ اس کا وجود شعلوں کی لپیٹ میں تھا اور ان شعلوں کو باہر کی لٹکڑی والی اور بھڑک رہی تھی۔

"جب میں نہیں تو ختم بھی کیوں۔" اس کے اللہ سے شکوے ختم نہیں ہو رہے تھے۔  
"کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ ختم بھی اس روز اس مہول اور مہمانی کے ساتھ اسی پلین میں ہوئی۔ کیا فرق پڑ جاتا اگر ختم بھی ان لوگوں کے ساتھ مر جاتی۔" ختم نے اپنے اختیار میں تھا تو کیا کر سکتا تھا۔ اس کا تھا تو ختم کو۔ وہ مر جاتی پھر یہ سب نہ ہو تا جو آج ہو۔ وہ آج اس شخص کی دلنہنی بیٹی تھی ہے جسے میں نے اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر چاہا ہے۔ جس کے خواب دیکھتے ہوئے میں بڑی ہوئی۔ اپنی زندگی کے اتنے برسوں تک جس شخص سے میں نے محبت کی اسے ختم نے مجھ سے چھین لیا۔ وہ آج پھولوں میں گھری اس جگہ بیٹھی ہے جس جگہ بیٹھنے کے میں نے خواب دیکھے تھے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں بونچ رہا تھا۔ "کاش تم مر جاتیں۔ اسی روز اسی جگہ میں۔" وہ وحشت بھرے انداز میں روئے پٹی جاری تھی۔



صبح ہو چکی تھی۔ اس کا رات والا جنون اور وحشت ختم ہو چکی تھی۔ اپنی محبت کے چمن جانے کا وہ دل بھر کر ماتم کر چکی تھی۔ اس کا ذہن اس وقت بالکل خالی تھا۔ وہ بغیر کچھ سوچے مجھے خاموشی سے کمرے میں بے اپنی رات کی دیوانگی کے سارے نشانات مٹا رہی تھی۔ رات جو کچھ ہوا اس بارے میں وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر بال نہانے کے بعد کمرے پر ایک مطمئن سی نظر ڈالتی وہ باہر آگئی۔ اس

کی روٹی ہوئی سرخ آنکھیں دیکھ کر کسی کو تشویش نہیں ہوگی۔ اتنا تو اسے اطمینان تھا۔ کیا عجیب اتفاق تھا کہ باہر نکل کر اس کی پہلی نظر ارنشلی پر پڑی تھی۔ وہ لہاں کے کمرے میں جا رہا تھا اس نے صبا کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"یہ ارنشلی غصہ تمہارا بہنٹی ہے۔ تمہاری بہن کا شوہر۔ رشتے بدل گئے ہیں مباحثہ نہیں اس تبدیلی کو قبول کرنا ہی ہو گا۔" اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ وہ ملازمین کو ساتھ لگائے گھر میں ٹھہرے ہوئے مسالوں کے ٹائٹے کا انتظام کرنے میں مصروف تھی۔ اس کی کزنز بھی مدد کرنے میں آگئی تھیں۔  
"ختم تمہارا چوہہ رہی ہے۔" وہ صبح سے ختم کے کمرے کی طرف نہیں گئی تھی۔ جبکہ باقی سب کزنز اس سے مل کر اور منہ دکھائی میں کیا ملا ختم کی معلومات لے کر آچکی تھیں۔ صبح سے ختم کے کمرے میں جانے والی ہر کزن اور ہر آئی نے اسے ختم کا یہ بیچام دیا تھا۔

"ذرا ٹائٹ سے فارغ ہو جائیں سب پھر جاؤں گی ختم کے پاس۔" وہ خود میں اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں دہرائی تھی۔ کیسے دیکھ جائے گی وہ اس چہرے کی وہاں اور ہر مسکراہٹ۔ وہ مختبوت کا عین پالنے کے بعد والی سرخوشی اور جھگڑا تھا۔

"چھوڑو اسے یہاں اتنا کوئی خاص کام نہیں ہے۔ ختم بار بار تمہارا چوہہ رہی ہے۔ جاؤ اس کے پاس۔" شہوہو ابھی ابھی ختم کا میک اپ کر کے آئی تھی اس کے ہاتھ سے مٹھلی کی پلیٹ لیتے ہوئے بولی۔ ایک گہری سانس لے کر وہ چمن سے باہر آئی اور مرے مرے قدموں سے چلتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

ختم اس وقت کمرے میں آگئی تھی۔ سرخ رنگ کی پشاور چوڑی دار پہنا رہی تھی اور بہت بڑے سے سرخ رنگ کے دوپٹے کے ساتھ وہ بیٹھ سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ خاموشی سے بیٹھ بیٹھی وہ ہلک لگ رہی تھی جیسے کوئی ملکہ اپنے تخت پر بیٹھی ہو۔ اس کی چوٹی

آگے بڑی ہوئی تھی اور اس میں ختم کی بیٹلی کی گھٹیاں کس قدر خوب صورت لگ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر غلطی کے اعتبار کے طور پر وہ بالکل چپ بیٹھی رہی۔ وہ اس کے پاس آکر بیٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں خاموش تھیں۔ لیکن اس خاموشی کو ختم نے ہی توڑا تھا۔ اس کی نظر اس کی روٹی ہوئی آنکھوں پر پڑی تو وہ بے چین ہو کر بولی۔

"صبا! تم روٹی تھیں؟" اتنی تشویش اور پریشان تھی اس کے انداز میں کہ وہ ایک ننگ اس کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔

"بے وقوف میں کوئی تم سے دور تو نہیں جا رہی جو تم اتنا روٹی ہو۔ میں بیٹیں تو ہوں تمہارے پاس۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے ہوئے اسے اپنے بالکل قریب بٹھایا تھا۔ (ختم اگر نہیں میرے روئے کی اصل وجہ بتا چلا جائے تو تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گی۔) اسے اس پل ختم سے بہت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خود میں اس سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہیں دہرائی تھی۔

"جس صرف میرا کمرہ بدلا ہے اور تو کوئی فرق نہیں پڑا۔" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ختم! تم خوش ہو نا؟" اس کی وہ تسلیاں اسے چاہک کی طرح لگ رہی تھیں۔ اسی لیے گہرا کر اس نے موضوع بدلا۔ ارنشلی کا ذکر آجائے پر اسے کچھ اور کوئی بات یاد نہیں رہتی تھی۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

"ہاں صبا! میں بہت خوش ہوں۔ اتنی خوش ہوں کہ اپنی کیفیت کا اظہار لفظوں میں کر ہی نہیں سکتی۔ بعض دفعہ لفظ کتنے چھوٹے لگتے لگتے ہیں۔ میں خوش ہوں بہت خوش ہوں۔ بس تم خوشی سے پہلے بہت کا لفظ جتنی مرتبہ دل چاہے لگو۔" بڑی خوب صورت سی مسکراہٹ ختم کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔

"تم اتنی دیر سے کیوں آئیں؟" میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" اسے اچانک ہی شگہہ کرنے

کا خیال آیا۔

"یار میں بڑی تھی۔ گھر میں اتنے سارے مہمان ہیں۔ ماما کہیں بیٹا ہے نا، کہیں کسی چیز میں انہوں نے ذرا سی بھی کمی دیکھ لی تو سمجھو میری شامت کی ہے۔ تو کون پر تو انہیں مجھ سے ہی نہیں ہے۔" وہ تفصیل سے جواب دیتے ہوئے اس کا شکوہ دور کرنے لگی۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ ارنشلی نے مجھے منہ دکھائی میں کیا ہے؟" اس کے شکوے ابھی ختم نہیں ہوئے تھے لیکن اتنی اذیت تھی ان شکووں میں۔

"کوئی ہے تو میں کیسے سب لوگوں سے سن چکی ہوں لیکن چلو تم دوبارہ سے بتاؤ۔ جگہ دکھاؤ۔" ختم جواب میں کچھ بولنے کے بجائے اس کی گردن کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"جیہٹ کسے لگی صبا؟" اس کے بچے میں فکر مندی تھی۔ وہ ایک مریضہ ختم سے نظریں نہ لانے پر مجبور ہوئی تھی۔

"پتا نہیں لگ گئی ہوگی کیسے۔ میں نے تو ابھی منہ دھوئے ہوئے اسے دکھا تھا۔" اس نے اپنے جھوٹ کو بے نیازی کے پروے میں پھینک کر آہستہ سے کہا۔

"دیکھ لیا تھا اور پھر بھی کوئی دوا نہیں لگائی۔ وہ ناراضی سے اس کو گھورتے ہوئے اٹھنے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" تمہارے لیے وہ اپنے جاری ہیں ہوں۔ حد ہے بے نیازی کی۔ اس نے ختم کا ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھالیا۔

"بیٹھی رہو۔ ہمارے ہاں ایک دن کی دلہن سے کلام نہیں کر لیا جائے۔ میں ابھی جا کر خود لگاؤں گی۔"

"لگاؤں گی نہیں ابھی فوراً جا کر لگاؤ۔" وہ ناراضی سے بولی تو وہ فوراً اٹھ گئی۔ اپنی اس چوٹ پر وہ اٹھ گئے ہوئے اسے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ کیا وہ شرمندہ تھی؟ اسے ندامت ہو رہی تھی؟ مگر کس سے؟ کیا ختم سے یا پھر خود اپنے آپ سے؟

دلچسپی کے بعد ظفر ایک ہفتہ ان لوگوں کے ساتھ



وہ کروٹیں چلا گیا۔ ارنلڈی نے اس کے جانے سے پہلے اپنے تمام قریبی رکنز کو شادی کی خوشی میں ڈنڈا دیا تھا۔ اس ڈنڈے کو سب نے خوب انجوائے کیا تھا۔ ظفر نے ارنلڈی اور ثمن کی دعوت کرنے کی خاطر ایک چمک انداز کی تھی۔ اس چمک میں ہونے والا ہلکا اور ہلکا بہت یادگار تھا۔ شادی کے ہنگامے سوچ رہے تھے۔ ارنلڈی اور ثمن بنی سون کے لیے ہوائی جاکے تھے۔ اس نے خود کو پہلے سے بھی زیادہ مصروف کر لیا تھا۔

ثمن اور ارنلڈی نے ہوائی سے تین چار گھر پر فون بھی کیا تھا کہ وہ ان لوگوں سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر ہر بار اسے ان لوگوں سے بات کرنی پڑی تھی۔ اس کی بیٹی اور کھٹکتی ہوئی آواز سن کر اس کے دل کو تپا نہیں کیا ہونے لگا تھا۔ اس سے وہ ایسی برداشت نہیں ہوا کرتی تھی۔

میں نے بھر کا اپنی سون ٹپ انجوائے کر کے وہ دونوں واپس آچکے تھے۔ ثمن کے پاس ہمیشہ کی طرح اسے سنانے کے لیے وہاں کی ڈیڑھ ساری باتیں تھیں۔

”ہمت سے لوگ ہوائی کو زمین پر جنت قرار دیتے ہیں اور واقعی جہاں وہاں کی تعریفیں اگر اس قدر کی جاتی ہیں تو تعین کر دہ جگہ ایسی ہی ہے کہ اس کی اس درجہ تعریفیں کی جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ بے تحاشا حسن بکھیر رکھا ہے۔ وہاں کے اونچے پھاڑ خوب صورت سمندر، حسین ساحل، چاروں طرف چھوٹوں کی دلفریب مہم۔ کون سی ایسی خوب صورتی ہے جو وہاں نہیں۔“ وہ اسے وہاں کی تصویریں دکھاتے ہوئے مسلسل بولتی جا رہی تھی۔ ان دونوں نے وہاں پر بے تحاشا تصویریں کھینچی تھیں اور ان تمام تصویروں میں وہ دونوں کس قدر خوش نظر آ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے ان تصویروں کو دیکھ رہی تھی۔

”ہمارے ہونٹ سے سمندر اتنا نزدیک تھا۔ اتنا خوب صورت لگتا تھا کہ اسے کہنے کی کھڑکی سے کھڑے ہو کر سمندر کو دیکھنا۔“ ثمن بڑے خوشگوار انداز میں بولی رہی تھی۔

وہ سمجھ سکتی تھی کہ ثمن کو وہ جگہ اتنی زیادہ خوب صورت کیوں لگی ہے۔ وہ جس کے ساتھ وہاں گئی تھی اس کے ساتھ ڈاکٹر اسے کسی صحران میں بھی بھیج دیا جاتا تو وہ اتنی ہی خوش خوش ہوتی۔ محبت ایسی ہی زور زور ہوتی ہے۔ چاہے جانے کا احساس اتنا ہی سرشار کر دینے والا ہو تا ہے۔ وہ کیوں نہ خوش ہوئی آخر وہ جس کے ساتھ وہاں گئی تھی وہ اس سے بے تحاشا پیار کرتا تھا۔ وہ رشک بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھے چلی جا رہی تھی اور ثمن جیسے ابھی ان ہی حسین لمحوں میں گھری بیٹھی تھی۔

”میں نے اس ایک مہینے میں زندگی سے اپنے حصے کی ساری خوشیاں سمیٹ لی ہیں۔ زندگی اس قدر خوب صورت تھی ہو سکتی ہے یہ بات تو بھی میں نے سوچی ہی نہیں تھی۔ مجھے تو ساری دنیا ہی بدلی سی محسوس ہو رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے دنیا میں کسی کوئی غم ہی نہیں۔ ارنلڈی کے بارے میں میں تم سے کیا کہوں صبا! اس میں تو کیوں دعا کرتی ہوں کہ تمہیں بھی اتنی ہی محبت کرنے والا شوہر ملے۔“ ثمن کی یہ بات اسے ایسی لگی جیسے چھوٹے ڈنک سا دیا ہو۔

”مت مغموم میرے لیے کوئی دعا۔ تمہاری یہ دعائیں میرا شمع اڑاتی ہیں۔ مجھے نہ اب محبت چاہیے اور نہ ہی محبت کرنے والا کوئی شخص۔ جب میں تو پھر کوئی بھی نہیں۔ میں نے اس سے محبت کرنے کے علاوہ زندگی میں کچھ بھی نہیں کیا اور اس کی زندگی سے نکل جانے کے بعد اب بھی کسی کی نہ محبت پانا چاہتی ہوں اور نہ کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ سوچتے ہوئے ابھرمند کر کے ایک دم وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہوا تمہیں؟ باقی تصویریں نہیں دیکھو گی؟“ ثمن اسے پوچھا تھا کہ کچھ سے بولی۔

”میں ذرا بچپن میں ایک نظر ڈال آؤں۔ ماما کی ڈنڈی کوئی فکر نہیں ہے اس لڑکی کو۔ فراغت سے پہلے کر کہیں مار رہی ہے۔“ وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی اور پھر فوراً ”مگر سے“ بھر نکل گئی۔ وہ بچپن میں آ

کر کوئی مصیبت ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ثمن بھی وہیں آگئی۔ ابھی اس کے قصے ختم نہیں ہوئے تھے تو جب تک وہ انہیں صبا کو سنا نہیں لیتی اسے جھن نہیں آتا تھا۔ اس کی مدد سوچیں بھی اس کے جوش و خروش کو کم نہیں کر رہی تھی۔ وہ لائق کا مظاہرہ کرتی اپنے کلم میں مصروف تھی اور وہ مسلسل بولنے میں۔

”ہر روز صبح جب میری آنکھ کھلتی تو میں اپنے سر پہلے ڈیڑھ سارے پھول پاتی۔ اتنے دنوں میں کبھی ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ میری آنکھ کھلے اور مجھے اپنے پاس پھول رکھے ہوئے نظر نہ آئیں مجھے کبھی بھی پتا نہیں چلا کہ ارنلڈی پھول کس وقت لاتے تھے اور کس وقت میرے پاس رکھتے تھے۔ کتنی مرتبہ میں نے ارنلڈی سے پوچھا لیکن انہوں نے بتایا نہیں۔“ وہ اس کے ساتھ مل کر سلاؤں بناتے لگی۔

”کتنی مرتبہ ہم نے ایک ہی کپ میں چائے اور کافی شیر کی۔ ایک ہی کون آکس کریم کھائی۔ اور ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھایا۔“ وہ اچانک ہی ثمن کی بات کاٹ کر بولی۔

”مالی سوٹ سسٹا! جسے آپ محبت سمجھ رہی ہیں میرے خیال سے وہ ارنلڈی بھائی کی خرچا پکانے کی ایک کامیاب کوشش تھی۔ ایک ہی پلیٹ میں کھانا، ایک ہی کپ میں چائے، کافی، وہ کامیاب بزنس میں ایسے ہی ہوتے ہیں، تمہاری جیسی احمق لڑکیاں اسے محبت کا خوب صورت سا اظہار سمجھ کر خوش اور ان جیسے چالاک بزنس میں کی جیب پر بوجھ بھی کہہ۔“ ثمن کو اس کی بات سن کر ہنسی کا دورہ سا ڈنڈا تھا۔ سب کام پھوڑ کر وہ بری طرح ہنس چلی جا رہی تھی۔

”کس قدر ان روٹینک۔ ہو تم صبا! تو ہے۔“ کتنی دیر بعد کہیں جا کر وہ اپنی ہنسی روکنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

”بے چارہ تمہارا شوہر جو روٹینک ہو تو تم تو اس کی ساری روٹینک سوچوں پر ایسی طرح پائی پھیر دیا کر دی۔ ہر وقت اسے شک کی نظر سے دیکھو گی کہ

ضرور اس بات کے پیچھے خرچا پکانے کی کوئی نہ کوئی کوشش کار فرما ہے۔“ وہ ثمن کو ہنسا دیکھ کر ہنسنے لگی تھی۔

”آج کل کہاں پائی جاتی ہیں آپ؟“ ارنلڈی نے اسے دیکھتے ہی ریموٹ سے لی وی آف کر دیا تھا اور اب پورا کاپور اس کی طرف متوجہ تھا۔

”میں پر ہوں۔ آپ کے سامنے۔“ وہ ہیک کدھے پر لٹکائے کہیں باہر جانے کے لیے تیار نظر آ رہی تھی۔ بڑے سرسری سے انداز میں اس نے ارنلڈی کو جواب دیا تھا۔

”بھیا حیرت ہے۔ میں پر ہو، پھر بھی مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ یا تو گھر پر نظر ہی نہیں آتیں اور اگر آ بھی جاتو تو کسی نہ کسی مصیبت کے ساتھ ارنلڈی اور ثمن کو واپس آئے چار روز ہو گئے تھے اور ان چار دنوں میں اس کی ارنلڈی سے بڑے نامہات چیت ہوئی تھی۔

شادی سے پہلے وہ کراچی میں نہیں تھا، پھر شادی کے ہنگاموں کے دوران اسے اتنا وقت نہیں ملا تھا کہ کسی بات پر کچھ سوچتا لیکن اب چار دن سے وہ کراچی میں تھا اور وہ بھی گھر پر پائل فاسٹ۔ ایسے میں اسے صبا کا اپنے ساتھ زیادہ بات چیت نہ کرنا پڑتا تھا۔

”تنتے عرصے سے تم نے مجھے نہ فارینہ کا کوئی قصہ سنایا ہے اور نہ حرا اور شازیہ کے گروپ کے ساتھ ہونے والی لڑائیاں۔“

”وہ سب تو میری کالج کی فرینڈز تھیں۔“ وہ اسے باتوں کے مڑ میں دیکھ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

”تو کیا کالج اور اسکول کے دوستوں سے یونیورسٹی جا کر دوستی ختم ہو جاتی ہے؟“ ارنلڈی نے بحث کرنے والے انداز میں کہا۔

”دوستی ختم تو نہیں ہو جاتی۔ لیکن اب ان لوگوں کا فٹار ٹمنٹ الگ ہے۔ وہ لوگ فزکس میں ہیں۔ ست کم ان لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ میں نے بہت سارے نئے دوست بنا لیے ہیں۔ فارینہ وغیرہ کے ساتھ تو بس صرف شرارتیں اور احمقانہ حرکتیں ہی کیا



کرتی تھی۔ اب ان لوگوں کے ساتھ دوستی ہوئی ہے تو میرا انٹرنٹ پر بھائی میں پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ سب بچہ وہاں کے گروپ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ تو خیر بہت اچھی بات ہے کہ تم نے بڑھاکو قسم کے لڑکے لڑکیوں کو اپنا دوست بنایا ہے۔ لیکن پرانے دوستوں کو کبھی چھوڑنا مت بھلا! جو بات پرانے دوستوں کی ہوئی ہے وہ نئے دوستوں میں نہیں ہو سکتی دوستی چھٹی پر لٹی ہو آتی ہی خوب صورت اور مضبوط بھی ہوتی ہے۔ یہ ویسے یونسی ایک اضافی بات تھی تم کہیں جا رہی تھیں میں نے تمہیں روک لیا۔ جاؤ تمہیں دیر ہو رہی ہو گی۔" بیشپ کی طرح اس نے بزرگانہ انداز میں اسے نصیحت کی تھی۔ وہ صوفے سے اٹھی تو ارٹھی نے پوچھا۔

"تم جاؤ گی کیسے؟ چلو میں تمہیں ڈراپ کروں۔"

"میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی قریب ہی تو ہے سر امتیاز کا گھر۔ ہمارا گروپ انٹران کی بلا سیرمی میں جمع ہوتا رہتا ہے۔" وہ اسے خدا حافظ کہتے ہوئے لاؤنج سے باہر نکلنے لگی تو ارٹھی پیچھے سے بولا۔

"نئے دنوں سے تم نے مجھے کافی بنا کر نہیں پلائی ہے۔ آج رات مجھے تمہارے ہاتھ کی کافی پانی ہے۔"

"میں کیوں بچوں؟" خمن صاحبہ کس مرض کی دوا ہیں۔ آپ کی کافی ناشتہ وغیرہ سب اب اس کی ذمہ داری ہے۔" لاؤنج میں آتے ہوئے خمن نے اس کی بات سن لی تھی۔

"اسماء صبح کہہ رہی تھی کہ صبا تمہیں بہن اور منہ دونوں رشتوں کے مزے کرواتے گی۔ کیسا مندوں کی طرح اپنے میں ارٹھی کے کان بھرے جا رہے ہیں۔"

ارٹھی خمن کے طعن دینے پر ہنس پڑا تھا۔ اس نے مزہ کرار لٹھی کی طرف سے کھادھ مٹکراتے ہوئے خمن سے کچھ کہہ دیا تھا۔

ہوائی سے آنے کے بعد ارٹھی اور خمن ایک ہفتہ کراچی رہے اس کے بعد وہ دونوں لاہور چلے گئے تھے۔ ارٹھی لاہور میں اپنے جس پروجیکٹ میں ان دنوں مصروف تھا اس کے لیے اسے ابھی کچھ عرصہ

وہیں قیام کرنا تھا۔ شادی سے پہلے ہی اس نے وہاں ایک ذاتی مکان خرید لیا تھا۔ لاہور میں اس کے بعض بہت قریبی دوست بھی رہتے تھے۔

گھر میں سب کو خمن کی کمی بہت محسوس ہو رہی تھی۔ ظفر کے بعد اب ارٹھی اور خمن بھی پہلے نہیں تھے۔ گھر کے سب ہی افریقہ کو ان دونوں کے بغیر گھر بہت سونا سونا لگا رہا تھا سوائے اس کے۔ وہ اس گھر کی واحد فرد تھی جو ان دونوں کے جانے پر بہت خوش تھی۔ وہ خود کو سمجھانے میں بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ کتنی مرتبہ اس نے خود کو سمجھایا تھا تقدیر کے اس فیصلے کو تسلیم کر لینے پر خود کو آمادہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے رشتے کو قبول کرنے کے حق کے تھے۔ لیکن اس کا خود کو سمجھانا صرف اس ایک لمحے میں پریلو ہو جاتا تھا۔

اب جب وہ دونوں یہاں نہیں تھے تو اسے بلا اطمینان تھا۔ وہ اس بلا وجہ کی مشقت سے بچ گئی تھی۔ ارٹھی سے پرانے بے تکلفانہ انداز میں بات کرنے کی مشقت۔ خمن کے ساتھ محبت بھرے انداز میں بات کرنے کی مشقت۔

خمن کراچی ہدی پابندی سے فون کرتی تھی۔ وہ وہاں بہت خوش تھی۔ وہ اپنے منہ سے اپنی خوشیوں کا ذکر نہ بھی کرتی تب بھی اس کی کواڑ سے قی پتا چل جاتا تھا کہ وہ ارٹھی کے ساتھ بے حد خوش ہے۔ حیرت انگیز طور پر اسے خمن کے ساتھ فون پر باتیں کرنا برا نہیں لگتا تھا بلکہ اگر بھی اسے فون کے دو تین دن ہو جاتے تو وہ بے چین ہی ہو جاتی تھی۔ خود سے وہ اسے بہت کم فون کرتی تھی۔ خمن اس کے فون نہ کرنے پر شکوکہ کرتی تو وہ پر بھائی کی مصروفیت اور وقت کی کمی کاغذر کر دیتی۔ بس یہی یوں لگتا کہ جیسے اس کا دل دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ایک حصہ خمن سے محبت کرتا ہے اور ایک نفرت۔ وہ شاید وہی شخصیت کی مالک بنی جا رہی تھی۔ کبھی اس کا موڈ خراب ہوتا تو وہ بڑی بے مروتی سے خمن سے فون پر بات کرنے سے انکار کر دیتی

"مما! میں اس وقت بڑی ہوں۔ آپ خمن کو بتا دیں میں اس سے بعد میں بات کر لوں گی۔" ممما اسے اس بد تمیزی پر کھورتے ہوئے دوبارہ خمن سے باتیں شروع کر دیتیں۔

اگلی بار جب اس کی خمن سے بات ہوتی تو وہ دل ہی دل میں یہ توقع کرتی کہ خمن کبھی بار کی اس کی بد تمیزی کا ذکر ضرور کرے گی مگر وہ اس بات کا کوئی ذکر کیے بغیر معمول کے انداز میں باتیں کرتی۔

"خمن! تم اتنی اچھی کیوں ہو؟ اتنی اچھی کہ میں دل میں تمہارے لیے نفرت رکھنے کے باوجود بھی تم سے نفرت کر نہیں پاتی۔ تمہاری اچھائیاں تمہارا پیار مجھے تم سے محبت کرنے پر مجبور کرنے لگتے ہیں۔ لیکن میں تم سے محبت نہیں کرنا چاہتی۔" خمن کے غلوں اور اس کی محبت اسے ایک نامحسوس سی چیخن سے دوچار کر دیتے تھے۔

خمن کو گھر والوں کی یاد بے چین کرنے لگی تو وہ باج چھ دن کے لیے کراچی آگئی۔ وہ یونیورسٹی سے لٹی تو خمن کو گھر میں دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی۔ وہ اپنی خوشی پر حیران ہوئی اس سے گلے ملنے لگی۔

"مجھے سب لوگ بہت یاد آ رہے تھے۔" وہ اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولی۔

"جس اب تھوڑے دن میں رہنا۔ چند دن میں دن سے پہلے میں تمہیں واپس جانے نہیں دیں گی۔" اماں نے دو لوگ انداز میں خمن سے کہا۔ اس نے اپنے برابر میں بیٹھی خمن کی طرف دیکھا جو اماں کے احترام میں کچھ بولی تو نہیں تھی لیکن اس کے تاثرات ہی ظاہر کر رہے تھے کہ وہ اتنے دن رکا نہیں چاہتی۔ ممما آج ہمیشہ سے بھی بڑھ کر خوش نظر آ رہی تھیں۔ اتنا خوش تو اس نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا اور پھر اس خوشی کی وجہ اسے بھی پتا چلی ہی گئی تھی۔

"واقعی؟" اس نے تصدیق چاہتے والے انداز میں خمن کی طرف دیکھا جس نے مسکراتے ہوئے سر ہلادیا تھا۔ اس بات کو سن کر اسے بے تحاشا خوشی کا احساس ہوا تھا۔

"الف! کتنا مزہ آئے گا۔ مجھے تو سوچ سوچ کر خوشی ہو رہی ہے۔ اب اس گھر میں کوئی مجھ سے چھوٹا آنے والا ہے۔ جس پر میں رعب جمائوں گی ڈانٹ ڈپٹ کر دوں گی۔ وہ خوشی میں اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگی تھی۔

"تم رعب جمائو گی، بچی کرو گی، لود ہم لوگ کہاں ہوں گے جو اسے تم سے ڈانٹیں کھانے کے لیے خواہ چھوڑ دیں گے۔" ممما نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے خفگی سے کہا۔ اس سارے دن اس کے پاس خمن کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے اس موضوع کے علاوہ دوسرا کوئی موضوع نہیں تھا۔

خمن کو آئے تیسرا دن تھا جب ارٹھی نے فون کر کے اس سے واپس آنے کے لیے کہا۔ وہ خود واپس جانے کے لیے بیٹی بے تاب تھی۔ بٹنے شوق اور بے چینی سے وہ سب سے ملنے لگی تھی اب اتنی ہی بے چینی اسے واپس کے لیے تھی لیکن اماں اور ممما اسے کسی بھی قیمت پر اتنی جلدی بھیجنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ لیکن اس کا موڈ دیکھ کر اماںوں نے رکنے کے لیے اصرار نہیں کیا تھا۔ لود خمن تو ہر کسی کا خیال رکھنے کی عادی تھی۔ پھر اماں تو اماں تھیں۔ ان کی کسی بات سے اختلاف کرنے یا منہ پر انکار کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے وہ بے لفظوں میں اماں سے یہ ضرور کہا تھا۔

"میں یہاں رک گئی تو ارٹھی کو مشکل ہو جائے گی۔"

"کوئی مشکل نہیں ہو رہی اسے۔ اسے عالت ہے۔" اپنے سارے کام وہ خود کر لیتا ہے۔ لندن بڑھنے گیا تھا تو کون سا وہاں اس کے پاس ملازمین کا انبار تھا۔ روٹے کا وہ مزے میں۔" انہوں نے قطعیت بھرے انداز میں اس کا اعتراض رد کر دیا تھا۔ ممما سامنے والے صوفے پر بیٹھی صبا کے پاؤں میں تیل کا مساج کر رہی تھیں۔ انہوں نے بغور خمن کی طرف دیکھا۔ وہ مزید کسی بحث اور اختلاف کے بغیر بول خاموش ہو گئی تھی جیسے اماں



کی بات سے متعلق ہو گئی ہو۔ انہیں بے اختیار اپنی اس  
 جی پر یار آیا تھا۔ ابھی اس کی جگہ صبا ہوئی تو لالہ سے  
 خوب بحث کرتی، خد کر کے اپنی بات منواتی۔ اس  
 وقت تو انہوں نے لالہ اور ثمن کی گفتگو میں دخل دینا  
 مناسب نہیں سمجھا لیکن اسی روز انہوں نے لالہ کو بتا  
 نہیں کس انداز میں قائل کیا تھا کہ وہ خوشی خوشی اسے  
 واپس بھیجے پر تیار ہو گئی تھیں۔ ثمن کو یہ بات معلوم  
 نہیں تھی، رات ارنٹنی سے فون پر بات ہوئی تو اس  
 نے کہہ دیا۔  
 "میں لالہ کو ناراض کر کے نہیں آسکتی۔ جب تک  
 وہ خوشی سے اجازت نہیں دیں گی، میں نہیں آؤں  
 گی۔" مگر جب لالہ نے اسے اس کی صحت اور  
 خوراک کے حوالے سے ایک طویل ہدایت نامہ دیتے  
 ہوئے واپس جانے کی اجازت دی تو اس کی خوشی دیکھنے  
 سے تعلق رہتی تھی۔ لالہ کے سامنے اس نے کسی  
 قسم کی خوشی اور ایک اسٹنٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا  
 لیکن رات میں صبا کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس  
 نے اپنی بے تحاشا خوشی کا برملا اظہار کیا تھا۔  
 "جب وہیں تھی تو سب لوگ بہت یاد آتے تھے"  
 اب یہاں لٹی ہوں تو ارنٹنی کی کمی پڑی شدت سے  
 محسوس ہو رہی ہے۔ میں کسی کے بغیر بھی نہیں رہ  
 سکتی۔ مجھے وہ سب لوگ ایک ساتھ چاہئیں جن سے  
 میں چار کرتی ہوں۔ میرے سب پیارے میرے پاس  
 ہوں، میرے بالکل قریب۔ سب کا بے تحاشا پیار ہو  
 اور میں ہوں۔ سچ کہتی ہوں صبا! عجیب سی ایک ہوس  
 ہے میرے اندر۔ اپنے جیسے کی ساری محبتیں جلدی  
 جلدی سمیٹ لینے کی۔  
 ثمن اٹھتی ہی روز واپس چلی گئی تھی۔ لالہ اور ماما کو  
 آج کل اس کی فکر پہلے سے بھی زیادہ رہنے لگی تھی۔  
 بعض مرتبہ دن میں وہ دو تین تین مرتبہ ثمن کو فون کیا  
 کرتیں۔ ثمن کو واپس گئے وہ بیٹھے ہو چکے تھے وہ  
 اپنے اتھناؤں کی تیاری میں مصروف تھی جب ثمن  
 نے اس سے اسے پیاس لاء ہو کر آنے کے لیے کہا۔  
 "چینیوں میں غم یہاں آجاتا صبا! بہت مزہ آئے  
 گا۔" اس کا لالہ دونوں کے پاس جانے کا قطعاً کوئی

ارادہ نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے فوراً ہی اسے منع کر  
 دیا۔  
 "آنا تو تمہیں بڑے گا۔ اب دیکھو میں کیا کرتی  
 ہوں۔" اس نے چٹخ کر آنے والے انداز میں کہا اور پھر  
 جو اس نے کہا وہ واقعی کر بھی دکھایا۔ وہ احتمالات کی  
 مصوفیت میں ثمن کا چٹخ بھول بھی چکی تھی، لیکن  
 اسے معلوم نہیں تھا کہ ثمن لالہ اور ڈیڈی سے یہ  
 وعدہ لے چکی ہے کہ وہ سمسٹر ریک میں صبا کو اس کے  
 پاس لاء ہو رہی ہیں گے۔  
 "یہ کیا بات ہوئی۔ میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا جانے  
 کو یہ اچھی زبردستی ہے۔" وہ اپنے جانے کی بات سن  
 کر چچی۔  
 "اتنے پیار سے من بھاری ہے اور تم غرے دکھا  
 رہی ہو۔ تمہارے جانے سے اس کا دل بیل جلتے  
 گا۔ یہاں پر بھی تو فائدہ ہی ہو۔ ذرا سامن کا خیال کر لو  
 گی تو اس میں تمہارا کیا نقصان ہے۔" لالہ کو اس کا  
 انکار سخت ناگوار گزر رہا تھا۔  
 "ارنٹنی بھی بڑے اصرار سے کہہ رہا تھا کہ صبا کو  
 بھیج دیں اور ثمن بھی تمہیں بہت مس کر رہی ہے۔"  
 ڈیڈی نے بھی سمجھا۔  
 "کو کیسی رہی؟" ڈیڈی نے اس کی فلاح کا نام  
 بتانے کے لیے لاء ہو کر فون کیا تو ثمن نے اس سے بھی  
 بات کی۔ وہ اپنی جیت پر بہت خوش تھی۔  
 "بہت ڈیل ہو تم، تم سے تو اب میں وہیں آکر  
 نمٹوں گی۔" اس نے اسے دھمکی دیتے ہوئے فون بند  
 کر دیا۔  
 "سامری دنیا کی فکر رہتی ہے اس لڑکی کو سوائے  
 اپنے، مجھے نہیں لگا کہ وہ اپنے کھانے پینے کا کچھ خاص  
 دھیان رکھتی ہوگی۔ اب تم جاری ہو تو ثمن کا اچھی  
 طرح خیال رکھنا چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے واپس  
 آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" لالہ جانتے جانتے  
 بھی اسے سمجھانا نہیں بھولیں۔ ارنٹنی اسے  
 ایئر پورٹ پر لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔  
 "وہ محترمہ کہاں ہیں جنہوں نے تلور شادی حکم  
 جاری کر کے مجھے یہاں بلا دیا ہے؟"

"وہ گھر تمہارے استقبال کا خاص اہتمام کر رہی  
 ہے۔ بہت زبردست قسم کی ڈشز تیار کی گئی ہیں  
 تمہارے لیے۔ صبح سے بچن میں مہمی ہوئی ہیں  
 محترمہ۔" ارنٹنی نے مسکراتے ہوئے اسے ثمن کی  
 مصوفیت سے آگاہ کیا۔ وہ لوگ گھر پہنچے تو ثمن پہلے ہی  
 سے اس کے استقبال کے لیے کھڑی نظر آئی۔ بڑی  
 بے ساختگی میں اس نے صبا کو گلے لگایا۔  
 "کتنی خوشی ہو رہی ہے مجھے تمہیں یہاں دیکھ کر۔"  
 میں پتا نہیں سکتی۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے  
 آئی تھی۔  
 "سہماؤں کی طرح بیٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں  
 ہے۔" اسے صوفے پر بیٹھ دیکھ کر اس نے نو کا اور پھر  
 اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔  
 "پہلے سارا گھر تو دیکھ لو۔ تم دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔  
 میں نے اسے اتنی اچھی طرح سجایا ہے۔ ارنٹنی کہتے  
 ہیں، تمہیں تو اس پر ڈرا کرنا ہوتا چاہیے تھا۔" وہ اسے  
 ڈائمنڈ روم کی طرف لے آئی، یہ وہاں سے بچن کا لالہ  
 ڈائمنڈ روم، بیڈ روم، دو لے وہاں موجود ایک ایک  
 چیز کی تفصیل بتاتے لگے۔  
 وہ اس گھر کی سچوٹ سے زیادہ ثمن کے چہرے کی  
 طرف دیکھ رہی تھی۔ جس پر بچی خوشی روشنی بن کر  
 جگمگا رہی تھی۔  
 اس کمرے کی کسی بھی دوسری چیز پر نظر پڑنے سے  
 پہلے اس کی نظر اس تصویر پر نظر پڑ گئی تھی جو بہت  
 خوب صورت ہے فریم میں جڑی بیڈ کے پیچھے والی  
 دیوار پر لگی ہوئی تھی۔ ان دونوں نے کمرے میں لگانے  
 کے لیے اپنی شادی کے دن کی تصویر کی جگہ اپنی مون کی  
 تصویریں میں سے ایک تصویر کا انتخاب کیا تھا۔ وہ  
 تصویر بہت خوب صورت تھی۔ ارنٹنی اور ثمن دونوں  
 ہی اس تصویر میں بہت خوب صورت اور خوش نظر آ  
 رہے تھے۔ ان دونوں کا انتخاب بہترین تھا۔ اس نے  
 ایک دم ہی تصویر پر سے اپنی نظریں ہٹا کر گردن مٹائی  
 تو آنکھوں کے سامنے وہی منظر آیا جس سے اس نے  
 نظر ہٹائی تھی۔ ارنٹنی اور ثمن ساتھ ساتھ کھڑے

تھے اتنے ہی خوش اور اتنے ہی خوب صورت جتنے کہ  
 تصویر میں لگ رہے تھے۔  
 "مہو گیا گھر کا معائنہ؟" وہ اس سے مخاطب ہوا۔ اس  
 نے جواباً مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔ اسے خود اس  
 بات کا احساس ہوا کہ اس وقت وہ منافقانہ انداز میں  
 ہنس رہی ہے۔  
 "میرا خیال ہے اب کھانا کھا لینا چاہیے۔ دیکھیں  
 تو سہی کہ ثمن صاحبہ صبح سے بچن میں قفس کر خالی  
 مجھے امپریس کر رہی ہیں یا واقعی کچھ ڈھنگ کی ڈشز  
 تیار بھی کی ہیں۔" ارنٹنی کی مخاطب دوبارہ وہی تھی۔  
 "کھانا بالکل تیار ہے۔ آپ دونوں حیران رہ جائیں  
 گے، میں نے اتنی مزے مزے کی چیزیں بنائی ہیں۔"  
 ثمن ارنٹنی کو جواب دیتی تیزی سے کمرے سے نکل  
 گئی تھی۔ وہ دونوں بھی کمرے سے باہر نکل آئے۔  
 "بہت خوش ہے ثمن تمہارے آنے پر۔"  
 میزبانی کی طرف آتے ہوئے ارنٹنی نے اس سے  
 کہا۔  
 "جب سے تمہارے آنے کا کنفرم ہوا، اس نے  
 اسی وقت سے تمہارا انتظار شروع کر دیا تھا۔ کل کتنے  
 گھنٹوں تک اس نے میرا سر کھلیا ہے۔ صبا آ رہی ہے،  
 اس سے یہ بات کہنی ہے کہ وہ بات بتاتی ہے اسے  
 یہ کھانا ہے، اس کے لیے وہ پکا رہا ہے، تمہارا ذکر کر کر  
 گئے اس نے مجھے اچھا خاصا ساڑا دیا تھا۔"  
 "آپ کو میرے ذکر سے چڑھوتی ہے؟" ارنٹنی کی  
 شوخی سے کی گئی بات کے اختتام پر اس نے ایک دم  
 پوچھا۔ ارنٹنی کو اس کے سوال پوچھنے کا یہ انداز بڑا  
 انجینی سارنگ اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھ دیا۔ وہ  
 بڑی سنجیدگی سے میزبانی سے نیچے اتر رہی تھی۔ اس  
 کی توجہ ارنٹنی کی طرف نہیں بلکہ میزبانی کی طرف  
 تھی۔ اس کی شوخی سے کئی گنی ایک بات کو اس نے  
 کس طرح لیا تھا اس کے جملے کے بانی سارے جیسے کو  
 نظر انداز کر کے اس نے صرف آخری بات پر توجہ دی  
 تھی۔ (باقی آئندہ)



”دو کیا ہوا آپ چپ کیوں ہو گئے؟ میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔ مجھے پتا ہے آپ کبھی مجھ سے چڑ نہیں سکتے۔“ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ وہ ثمن کے پاس کچن میں چلی گئی تھی جبکہ ارتضیٰ ابھی وہیں کھڑا ہوا تھا۔ صبا کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی جو اسے اجنبی لگی تھی؟

”ویسے تو میں پلین میں بھی کھانا کھا چکی ہوں۔ لیکن اب تم نے اتنی مزے مزے کی ڈشز بنائی ہیں تو دوبارہ کھانے میں بھی کچھ حرج نہیں۔“ اس نے اپنی پلیٹ میں رشین سلاؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

”تمہاری بہن صاحبہ خود تو چٹوری تھیں ہی مجھے بھی اپنا جیسا بنا دیا ہے۔ روز ناشتے میں یہ پراٹھا کھلاتی ہے مجھے آج کل پہلے سے بھی زیادہ پابندی سے ایکسرسائز اور جوگنگ کرنی پڑ رہی ہے۔“ ارتضیٰ اپنی کچھ دیر پہلے کی حیرت کو نظر انداز کر کے بڑے خوشگوار سے موڈ میں کھانا کھا رہا تھا۔

”تم بتاؤ صبا! یہ کوئی انصاف تو نہیں ہے۔ شوقین خود ہیں کھانے کے اور الزام مجھے دیتے ہیں۔ اب ناشتے کی میز پر میں نے ٹوسٹ، آلیٹ، مکھن اور جیم بھی رکھا ہوا ہوتا ہے، لیکن یہ اپنی مرضی سے اسے چھوڑ کر پراٹھا کھاتے ہیں تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔“ ثمن — مصنوعی غصے سے بولی۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے ثمن! آپ نہ کھایا کریں۔ یہ کہیں کہ اصل میں خود ہی کا دل چاہ رہا ہوتا ہے۔“ ثمن اس کے اپنی حمایت میں بولنے پر بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”ظفر بھائی اور آپ کے مقابلوں میں ضرور صبا آپ کا ساتھ دیا کرتی تھی۔ لیکن اگر بات میری اور آپ کی ہو تو صبا صرف اور صرف میرا ساتھ دے گی۔ ہے نا صبا؟“ ارتضیٰ سے کہتے کہتے اس نے ایک دم اس سے

پوچھا۔

”کیوں خواستواہ میں، میری ارتضیٰ بھائی کے ساتھ لڑائی کروانا چاہ رہی ہو اور اللہ نہ کرے کہ کبھی ایسی نوبت آئے جو مجھے آپ دونوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دینا پڑے۔“ ارتضیٰ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”صبا واقعی بڑی ہو گئی ہے ثمن! اسے سیاسی قسم کے بیانات دینے آ گئے ہیں۔“ ثمن بھی اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔

”میں سمجھتی تھی مردوں کی محبت بس شادی سے پہلے تک ہی ہوتی ہے۔ بیوی بننے کے بعد تو انہیں اپنی پسندیدہ ترین لڑکی میں بھی عیب نظر آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسا ہے نہیں صبا! کم از کم میرے ساتھ تو ایسا ہرگز نہیں ہے۔“ وہ لاؤنج کے کارپیٹ پر ویکيوم کلینر چلاتے ہوئے ثمن کی باتیں سن رہی تھی۔ ارتضیٰ کے آفس چلے جانے کے بعد ثمن کارپس کی صفائی کے لیے ویکيوم کلینر لگانے لگی تو اس نے ویکيوم کلینر اس کے ہاتھ سے چھین کر اسے صوفے پر بٹھا دیا تھا۔

”مجھے نوکروں کا کیا کام پسند نہیں آتا۔ جس محبت سے میں اپنے گھر کا خیال رکھوں گی ایسے کوئی نوکر تو کبھی نہیں رکھ سکتا۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے ایسی عورتوں پر جو اپنے گھروں کو ملازمین کے سپرد کر کے خود بے فکر ہو جاتی ہیں۔“ وہ اس کے ڈانٹنے اور یہ کہنے پر کہ یہ کام اسے خود کرنے کے بجائے کسی ملازم سے کروانا چاہیے، بہت سنجیدگی سے بولی۔

”اچھا جب تک میں ہوں تب تک تم یہ سارے کام میرے سپرد کر دو۔ میرے جانے کے بعد شوق سے اپنا گھر خود اپنے ہاتھوں سے سجا، سنوار لیا کرنا۔“ ڈرائنگ روم کی صفائی کے بعد وہ اب لاؤنج میں آ گئی۔

”ارتضیٰ کو جتنا اچھا میں شادی سے پہلے سمجھتی تھی وہ حقیقت میں اس سے بھی زیادہ اچھے ہیں۔ کبھی کبھی

تو مجھے خود اپنے آپ پر رشک آتا ہے۔ اتنی شدید محبت مجھ سے؟ ایسا غیر معمولی کیا ہے مجھ میں کبھی کبھی مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔ محبت کے کھو جانے کا ڈر، اس کے چھن جانے کا ڈر۔ پتا نہیں محبت اتنی وہمی کیوں ہوتی



ہے۔ لیکن صبا! مجھے واقعی ڈر لگتا ہے۔ ایسا کیوں لگتا ہے جیسے یہ محبت ایک روز مجھ سے چھن جائے گی۔“ وہ ثمن کی بات پر کھل کر ہنسی تھی۔

”تم میری سوچ سے بھی زیادہ جذباتی ہو۔ ارے احمق اگر کچھ نہ کچھ سوچنا بہت ہی ضروری ہے تو بجائے ان بے سرو پا باتوں کے اس کے بارے میں سوچ لیا کرو۔ جو ہم لوگوں کی زندگیوں میں آکر ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھیر دے گا۔“ ثمن کا موڈ ایک دم ہی بدل گیا وہ اب چہرے پر خوب صورت سی مسکراہٹ لیے شاید اسی کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

”اماں نے تو نام بھی سوچ لیا ہے۔ اگر لڑکا ہو تو معاذ اور لڑکی ہوئی تو ماہم۔ ویسے تمہیں کس کا انتظار ہے معاذ کا یا ماہم کا؟“

”میں دعا مانگتی ہوں کہ اللہ مجھے بیٹا دے، بالکل ارتضیٰ جیسا ہو وہ۔ اس کی شکل صورت عادتیں سب ان کے جیسی ہوں۔“

”پھر ارتضیٰ بھائی یہ دعا مانگتے ہوں گے کہ بیٹی ہو اور بالکل ثمن جیسی خوب صورت ہو“ اسی کے جیسی اچھی اور محبت کرنے والی ہو۔“ اس نے جواب میں فوراً اور بڑی بے ساختگی سے کہا تھا۔

”ہاں واقعی وہ یہی کہتے ہیں۔ حیرت ہو رہی ہے مجھے تمہارے درست انداز پر ویسے ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے اپنی ماں کی طرح بچپن ہی سے سنجیدہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ خالہ کی طرح شوخ و شریر ہونا چاہیے۔ اب تو تم ایسی نہیں ہو بچپن میں تم کتنی شریر اور باتونی تھیں صبا! مجھے ابھی بھی یاد ہے میں جب کبھی تم لوگوں کے پاس کراچی آتی تو تمہیں اتنا زیادہ اور مسلسل بولتا دیکھ کر مجھے کس قدر حیرت ہوتی تھی۔ ارتضیٰ کہتے ہیں ہمارے گھر میں ساری رونق صبا کی وجہ سے تھی۔ اس کی شرارتیں اتنی معصومانہ اور پیاری ہوتی تھیں کہ اس کی کسی بھی حرکت پر غصہ نہیں آتا تھا۔“ زندگی کا جو دور وہ اسے یاد دلانا چاہ رہی تھی اسے وہ یاد کرنا نہیں چاہتی تھی اسی

لے اس بات پر کوئی تبصرو کیے بغیر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”بس تو پھر میں یہ دعا مانگنا شروع کر دیتی ہوں کہ۔ پیارے اللہ میاں آپ ارتضیٰ بھائی اور ثمن میں سے جس کی بھی چاہیں دعا قبول کر لیں۔ اس لیے کہ میرا بھانجا ہو تو وہ ارتضیٰ بھائی جیسا اچھا ہو گا اور بھانجی ہوئی تو ثمن جیسی۔“

”ہاں یہ دعا ٹھیک رہے گی۔“ ثمن نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ صفائی کے اس کلام سے فارغ ہو چکی تو ثمن سے بولی۔

”جب اپنے گھر کی صفائیاں تم خود کرتی ہو تو پھر کھانا تو لازمی خود ہی پکاتی ہو گی۔ مجھے بتاؤ کیا پکانا ہے۔ تمہارے جیسا مزے کا تو نہیں پکا سکوں گی لیکن یقین کرو میں نے بہت سی چیزیں ماما اور اماں سے پکائی سیکھ لی ہیں۔ اچھی خاصی کلنگ کرنا آگئی ہے مجھے۔“

”میں نے تمہیں اس لیے نہیں بلایا تھا کہ مجھے ایک نوکرانی کی ضرورت تھی۔“ اس نے منہ بنا کر کہا تھا۔

”تم نے تو اس لیے نہیں بلایا لیکن اماں نے مجھے یہاں اسی لیے بھیجا ہے تمہاری خدمت کرنے کے لیے۔ ابھی تو میں تمہیں وہ سب چیزیں بنانا کر کھلاؤں گی، بلکہ ٹھنساؤں گی جو اماں نے تمہیں کھلانے کے لیے مجھے خاص تاکیدیں کی تھیں۔“ اس کا انداز ڈرانے والا تھا۔ ”اور تمہیں یہ تو پتا ہی نہیں ہے کہ وہ چیزیں کیا کیا ہیں۔ ان میں سے اکثر چیزیں دیسی گھی میں تیار کی جائیں گی۔“ اس نے اسے مزید ڈرایا تھا۔

”خدا کے لیے صبا! اتنی ڈراؤنی باتیں مت کرو۔ میں تو کھانے میں کارن آئل بھی اتنا تھوڑا سا ڈالتی ہوں، دیسی گھی کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”یہ بحث تم اماں سے کرنا۔ مجھے تو جو کام کرنے کو کہا گیا ہے میں وہی کروں گی۔ باقی تم جانو اور اماں۔“ وہ اسے ڈرا کر کچن میں چلی گئی تھی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد آئس کریم کا پروگرام

کے ساتھ  
ایسی  
ایک

ی قسم  
طرف

سے  
اپنی  
ع ہو  
ساتھ

لیوم  
تضی  
فائی

سیر

ت

تو

ی

ود

بر

ہ

ہ

ہ

ہ

ہ

ہ

ہ

ہ

ہ

ہ



بن گیا تھا۔ وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر لے آیا تو وہ دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے پوربچ میں آ گئیں۔ وہ ثمن سے ایک قدم پیچھے تھی۔ ثمن کو گاڑی کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے بڑی حسرت سے دیکھا۔ کتنا مالکانہ انداز تھا اس کا اور کیوں نہ ہوتا۔ اسے حق تھا اس جگہ بیٹھنے کا اور یہ حق اس گاڑی کے مالک نے اسے دیا تھا۔ اپنی لمحہ بھر کی اس سوچ پہ وہ شرمندہ ہو گئی۔ خود کو ملامت کرتے ہوئے وہ پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”ساری دنیا کے بچے آئس کریم کے شوقین ہوتے ہیں لیکن صبا تو آئس کریم کی دیوانی تھی۔ کچھ مت دو، بس اسے آئس کریم کھلائے جاؤ۔ میری پاکٹ منی کا بڑا حصہ اس کی آئس کریمز کی نذر ہو جایا کرتا تھا۔“ آئس کریم کھاتے ہوئے ارتضیٰ نے ثمن سے کہا۔

”کتنا اچھا وقت آپ لوگوں نے ساتھ گزارا ہے۔ آپ صبا اور ظفر بھائی۔ افسوس میں نے وہ خوب صورت وقت مس کر دیا۔ اتنا اچھا لگتا ہے مجھے جب آپ تینوں اپنے ایک ساتھ بتائے بچپن کی باتیں بتاتے ہیں۔“ ثمن کے لہجے میں بڑی حسرت سی تھی۔

”تم ہوتیں بھی تو الگ تھلگ بیٹھ کر خمرے ہی دکھایا کرتیں۔ کیوں صبا! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“ ارتضیٰ اسے ستا رہا تھا۔ وہ اپنی آئس کریم ختم کر چکی تھی۔

”صبا! اور آئس کریم منگواؤں تمہارے لیے؟“ ارتضیٰ کے پوچھنے پر اس نے نفی میں سر ہلادیا تھا۔

”کل رضا کے ہاں ڈنر پر جانا ہے، یاد ہے نا تمہیں؟“ واپسی میں گاڑی اشارٹ کرتے ہوئے ارتضیٰ نے ثمن سے کہا۔

”ہاں یاد ہے۔“ اسے جواب دے کر وہ صبا سے ناطب ہوئی۔

”ارتضیٰ کے دوست ہیں رضا بھائی۔ ہماری شادی بھی آئے تھے۔ ہو سکتا ہے تم نے انہیں دیکھا ہو؟“ ان کی مسرت ان سے بھی زیادہ بااخلاق اور ملنسار تھی۔ تم ان سے ملو گی تو تمہیں بھی وہ دونوں بہت پسند

آئیں گے۔“ اسے ارتضیٰ کے کسی دوست اور ان کی بیگم کے قصے میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ثمن کی باتوں پر اس نے محض سر ہلادیا۔

”کل صبا، ہم لوگوں کے ساتھ جائے گی تو ملے گی ان دونوں سے۔“ ارتضیٰ نے کہا تو ثمن سے تھا، لیکن ثمن کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ فوراً بولی۔

”آپ دونوں جائے گا۔ مجھے ایسے بن بلائے ساتھ لٹک کر جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں آرام سے گھر پر کوئی شاندار سی مووی دیکھوں گی، کافی پیوں گی اور ڈرائی فرائس کھاؤں گی۔“

”بن بلائے کیوں؟ رضائے خاص طور پر تمہارا نام لے کر تمہیں انوائٹ کیا ہے۔“ ارتضیٰ نے بیک ویو مرر میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج صبح آفس میں میری اس سے فون پر بات ہوئی تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ صبا آئی ہوئی ہے اور،“ اور انہوں نے کہا کہ اتنی مشہور و معروف شخصیت کو آپ ضرور ان کے گھر لے کر آئیں۔“ اس کے تسخرانہ انداز پر ارتضیٰ اور ثمن دونوں ہنس پڑے۔

”دیکھا کیسے قینچی کی طرح زبان چلتی ہے اس کی۔“ ارتضیٰ نے ہنستے ہوئے ثمن سے کہا۔ مگر اگلے روز ثمن ارتضیٰ بھی اسے ساتھ لے جانے پر بضد ہو گیا۔ ان دونوں کے اصرار پر اسے اٹھنا پڑا تھا۔ زبردستی جارہی تھی اس لیے تیار بھی بے دلی سے ہوئی تھی۔ ثمن البتہ خوب اچھی طرح تیار ہوئی تھی۔ رضا اور مسر رضا دونوں اس سے بڑی گرم جوشی سے ملے تھے۔

”ثمن نے تمہاری کم تعریفیں کی تھیں۔ تم اس کی تعریفوں سے زیادہ خوب صورت ہو۔“ فائزہ رضائے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔ فائزہ کے کمٹنٹس ان لوگوں سے کچھ فاصلے پر کھڑے ایک اور شخص نے بھی سن لیے تھے۔ بے ساختہ گردن موڑ کر اس نے پہلے فائزہ کو اور پھر اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ فائزہ کے بلند آواز میں دیے جانے والے ان کمٹنٹس پر اچھی خاصی شرمندہ ہو گئی تھی۔ اس وقت صبا، ثمن اور فائزہ ایک ساتھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ارتضیٰ ان دونوں کو فائزہ کے



ساتھ چھوڑ کر اپنے دوستوں میں جا کر بیٹھ گیا۔  
 ”سلام علیکم بھابھی! کیسی ہیں آپ؟“ وہ چلتا ہوا  
 ان لوگوں کے پاس آکر رک گیا تھا۔ اس کی مخاطب  
 ثمن تھی۔ یقیناً وہ لوگ ایک دوسرے کو پہلے سے  
 جانتے تھے۔ ثمن نے اس کے سلام کا بڑے پرtpاک  
 انداز میں جواب دیا تھا۔

”میں بالکل خیریت سے ہوں عامر! آپ کیسے  
 ہیں؟“ آپس میں رسمی قسم کے جملوں کے تبادلے کے  
 بعد ثمن کو اس کا تعارف کروانے کا خیال آیا تھا۔  
 ”یہ صبا ہے، میری چھوٹی بہن۔ کراچی سے آئی ہے  
 یہاں پر ہم لوگوں سے ملنے کے لیے۔“ عامر نے  
 مسکراتے ہوئے ہیلو کہا اس نے بھی جواباً ”رسمی سے  
 انداز میں مسکراتے ہوئے ہیلو کہہ دیا۔

”صرف ثمن کی بہن نہیں ہے، بلکہ ارتضیٰ بھائی  
 کی فرسٹ کزن بھی ہے۔“ فائزہ نے اس کی معلومات  
 میں مزید اضافہ کیا۔

”اور صبا! یہ عامر ہے۔ میرا خالہ زاد بھائی۔“ فائزہ  
 اس سے بولی۔ اس رسمی سے تعارف کے بعد وہ وہاں  
 سے چلا گیا۔ فائزہ اپنے باقی مہمانوں سے ملنے چلی گئی تو  
 ثمن اسے وہاں پر موجود اپنے باقی جاننے والوں سے  
 متعارف کروانے لگی۔

”مجھے امید ہے کہ تمہیں ہم لوگوں سے ملنا اچھا لگا  
 ہو گا۔“ واپسی میں ان لوگوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے  
 فائزہ نے اس سے کہا تھا۔

”مجھے آپ لوگوں سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوئی  
 ہے۔“ اب کی بار اس نے رسماً ”نہیں بلکہ دل سے یہ  
 بات کہی تھی۔ یہاں وہ بے دلی سے آئی تھی لیکن رضا  
 اور فائزہ کا رخلوص انداز اسے اچھا لگا تھا۔

”صبا تم بوری تو نہیں ہوئیں؟“ گاڑی ڈرائیو کرتے  
 ہوئے ارتضیٰ نے اس سے پوچھا۔

”بور تو نہیں ہوئی لیکن آپ ثمن صاحبہ کی خوش  
 اخلاقی اور مروت بگھارنے والی عادتوں کو تھوڑا کم  
 کروائیں۔ خدا جانے کون سی مسز تھیں۔ مجھے نام یاد  
 نہیں آ رہا۔ اتنا پوز کر کر کے اپنے آسٹریلیا جانے کا ذکر کر

رہی تھیں اور یہ اتنے سکون اور خاموشی سے ان کا  
 اترایا ہوا انداز دیکھ رہی تھی۔ اس سے یہ نہیں ہوا کہ  
 انہیں بتاتی کہ میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ وہیں  
 گزارا ہے۔“ ارتضیٰ اس کے شکایتی انداز پر قہقہہ لگا  
 کر ہنس دیا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا اگر میں انہیں یہ بات بتا دیتی  
 اونچھے لوگ کرتے ہیں اس طرح شو آف۔“ ثمن نے  
 بدبرانہ انداز میں کہا۔ ارتضیٰ دونوں بہنوں کی بحث و  
 تکرار سے محظوظ ہوتا خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ گھر  
 آکر جب وہ لوگ گاڑی سے اترے تو لاؤنج کی طرف  
 قدم بڑھاتے ہوئے ارتضیٰ اس سے بولا۔

”صبا! مجھے ثمن کی سب سے پیاری عادت یہی لگتی  
 ہے۔ اس کی سادگی۔ آپ بہت کچھ ہوں اور پھر اتنے  
 ہی سادہ بھی ہوں۔ ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔  
 کتنی خوب صورت ہے اس کی یہ بے نیازی اور سادگی  
 مجھے بے حد عزیز ہے۔“ ارتضیٰ نے ایک محبت بھری  
 نگاہ ثمن پر ڈال کر کہا۔ ثمن کے چہرے پر فخریہ  
 مسکراہٹ بگھڑ گئی۔ وہ ان دونوں کو شب بخیر کہہ کر اپنے  
 کمرے میں آکر لیٹی تو اسے نیند نہیں آئی۔

اسے یہاں آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اس دوران  
 اس نے ثمن کا بالکل اسی طرح خیال رکھا تھا جیسا اماں  
 نے اسے بدایتیں دے کر بھیجا تھا۔ وہ اسے مختلف  
 چیزیں پکا پکا کر کھلاتی اور ثمن ہزار خیرے دکھا کر انہیں  
 کھاتی۔ اس روز ارتضیٰ کے آفس سے آنے کے بعد  
 وہ تینوں ساتھ بیٹھ کر شام کی چائے پی رہے تھے جب  
 ارتضیٰ ثمن کو بتانے لگا۔

”آج عامر کا فون آیا تھا۔ اپنے گھر ڈنر پر انوائٹ کیا  
 ہے اس نے۔“

”ڈنر اور وہ بھی عامر کنجوس۔ خیریت تو ہے آپ نے  
 پوچھا نہیں یہ ڈنر کس خوشی میں دیا جا رہا ہے؟“ ثمن  
 اس اطلاع پر اچھی خاصی حیران نظر آ رہی تھی۔

”میں نے بھی بالکل اسی طرح اس سے حیرت کا  
 اظہار کیا تھا۔ کہہ رہا تھا تم لوگوں نے بلا وجہ مجھے بدنام کر  
 رکھا ہے۔ خود پر لگے اس ”کنجوس“ کے الزام سے



نجات حاصل کرنے ہی کے لیے ڈنر دے رہا ہوں۔“  
ار تفضی نے مسکراتے ہوئے عامر سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔

”ویسے ڈنر کی وجہ کوئی خاص نہیں ہے۔ بس قریبی دوستوں کو انوائٹ کیا ہے اس نے۔“

”یہاں سب ملنے والوں میں عامر کی کنجوسی مشہور ہے۔ رضا بھائی تو اسے اس کے منہ پر کنجوس کے لقب سے نوازتے ہیں۔ مگر وہ مجال ہے جو کوئی اثر لے اس بات کا۔ آج تک کبھی اس نے باقاعدگی سے اپنے گھر پر کسی کو کھانے پر انوائٹ نہیں کیا۔ ایسے ہی کوئی چلا جائے تو بڑی اچھی خاطر تواضع کرتا ہے۔“ ار تفضی کی بات سننے کے بعد ثمن اسے اس گفتگو کے پس منظر سے آگاہ کرنے لگی تھی۔ وہ چائے کے سپ لیتے ہوئے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”پھر آپ لوگ مجھ سے چلنے کے لیے اصرار کرتے ہیں۔ اس لیے میں ابھی سے بتا رہی ہوں کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ اس نے حفظاً مقدم کے طور پر پہلے ہی دو ٹوک انداز میں ان دونوں کو اپنے انکار سے آگاہ کیا۔ ار تفضی نے اس کا موڈ دیکھ کر چلنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ لیکن ثمن نے اگلے روز اسے ساتھ لے جانے کی بہت کوشش کی تھی۔ اسے یقیناً اس بات کی فکر تھی کہ صبا گھر پر اکیلی بور ہوگی۔

”بہت سے بہت آپ لوگ ڈھائی تین گھنٹوں میں واپس آجائیں گے۔ اس سے زیادہ دیر تو لگتی نہیں ہے اور اتنی تھوڑی سی دیر میں مجھے بور ہونے کا ذرا بھی ٹائم نہیں ملے گا۔“ اس نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان دونوں کی واپسی اس کی توقع سے بھی جلدی ہو گئی۔

”اتنی جلدی آگئے۔ ابھی تو میں نے بور ہونا اور آپ لوگوں کا انتظار کرنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔“ ثمن اسے گھورتے ہوئے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

”آپ کی ہی وجہ سے جلدی آئے ہیں۔ حالانکہ ابھی اٹھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اتنا مزہ آ رہا تھا باتوں

میں۔ رضا بھائی اتنے مزے مزے کے قصے سنا رہے تھے۔ چلتیں تو تم بھی انجوائے کرتیں۔“ ار تفضی بھی ثمن کے برابر میں بیٹھ گیا۔

”عامر نے بھی تمہارا پوچھا تھا۔“ ثمن کی اس بات پر اسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

”انہوں نے پوچھا ہو گا کہ صبا کیوں نہیں آئی؟ اسی کے اعزاز میں تو میں نے یہ ڈنر دیا تھا۔“ اس کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

”تمہارے سرخاب کے پر نہیں لگے جو وہ خاص طور پر تمہیں پوچھتا۔ یہ کہو کہ ہمارے سب جاننے والے بہت مہمان نواز اور بااخلاق لوگ ہیں اسی لیے تم جیسی سڑیل لڑکی کو اہمیت دیتے ہیں۔ جیسے ہی ہم لوگ اندر داخل ہوئے، سلام دعا کے بعد عامر نے اگلی بات یہی کہی تھی کہ ”بھابھی“ میں نے ار تفضی سے کہا تھا کہ آپ سب لوگ آئیے گا۔ یقیناً ”سب لوگوں سے مراد تم تھیں۔ خوا مخواہ مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔ سچی بات تو بتا نہیں سکتی تھی کہ میری بہن صاحبہ خود کو بڑی اونچی شخصیت سمجھتی ہیں۔“ ثمن اس کے استہزائیہ انداز پر چڑ گئی۔

”اچھی لگ رہی ہو، دونوں بہنیں لڑتے ہوئے۔“ ار تفضی بیوی آف کر کے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ ”دیکھا ثمن، انہیں کتنی تمنا ہے، ہم دونوں کو لڑتے ہوئے دیکھنے کی۔“

”تمہاری حرکتیں یہی رہیں تو بہت جلدی یہ تمنا پوری بھی ہو جائے گی۔“ ثمن غصے سے کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔ اس کا یہ غصہ کتنی دیر کا ہو گا یہ وہ جانتی تھی۔ اس لیے اطمینان سے سونے کے لیے کمرے میں آگئی۔

اس روز جب عامر ان کے گھر چلا آیا تو وہ خود اور اس کے گھر ہونے والی دعوت ایک مرتبہ پھر موضوع گفتگو بن گئے۔

”میں یہاں سے گزر رہا تھا سوچا آپ لوگوں سے بھی مل لوں۔“ اس کے آنے سے پہلے وہ تینوں لان میں بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے، ار تفضی نے اسے بھی



وہیں بٹھالیا۔  
 ”بہت اچھا سوچا آپ نے عامر! اور اب کھانا آپ  
 ہم لوگوں کے ساتھ کھا کر جائے گا۔“ کچھ دیر بعد ثمن  
 نے اندر آکر خاناں سے کھانا لگانے کے لیے کہا۔  
 ”مگر آپ کو سبزیاں پسند نہیں بھی ہیں۔ تب بھی  
 مہا کے ہاتھ کی بنی یہ ڈش ترائی ضرور کیجئے گا۔ اس نے  
 مجھے اس کی ریسپی نہیں بتائی پتا نہیں کس طرح یہ چیز  
 اور سبزیاں مکس کر کے اتنے مزے کی ڈش تیار کرتی  
 ہے۔“ کھانے کی میز پر ثمن کی یہ تعریف تو اسے زہر  
 لگی ہی تھی مزید غصہ اس وقت آیا جب عامر نے شامی  
 کبابوں کی ڈش کی طرف بڑھایا ہوا ہاتھ پیچھے ہٹا کر  
 سبزی کا باؤل اپنے سامنے کر لیا تھا۔ اس نے نہ براہ  
 راست اسے مخاطب کیا تھا نہ کسی خاص توجہ سے اس  
 کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے اس شخص سے  
 جڑی ہو رہی تھی۔

”صحیح تعریف کر رہی تھیں آپ یہ ڈش واقعی بہت  
 مزے کی ہے۔ اگرچہ میں وہ بجٹیرین نہیں لیکن یہ  
 سبزیاں مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔“ اس ڈش کے  
 نصیدے بھی ثمن نے ہی پڑھے تھے چنانچہ جوابی  
 تعریف بھی اسی سے کی گئی۔

کھانے کے بعد وہ لوگ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ  
 گئے۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ کتنی دیر بیٹھا اور پھر  
 کب واپس آگیا اسے بالکل پتا نہیں تھا وہ میگزین  
 پڑھتے پڑھتے ہی سو گئی۔

صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔

”آج خوب سوئیں تم۔“ وہ منہ دھو کر نیچے آئی تو  
 ثمن نے اس سے کہا۔ وہ دودھ کا گلاس لے کر ثمن کے  
 پاس واپس لاؤنج میں آگئی تھی۔

”کل رات تم اتنی جلدی کیوں سو گئی تھیں؟“

”ایک تو مجھے نیند آرہی تھی اور دوسرے تمہارے  
 مہمان آئے ہوئے تھے بلاوجہ اجنبی آدمی کے ساتھ  
 بیٹھ کر گفتگو کرنے کا میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔“  
 اس نے اخبار پڑھتے ہوئے جواب دیا۔

”ویسے صبا! مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ عامر سے

ار تفضی کی اچھی دوستی ہے مگر وہ اتنا فاسخ نہیں کہ یونہی  
 گزرتے گزرتے خواہ مخواہ ہمارے گھر آجائے جبکہ  
 پرسوں رات ہی تو ہم لوگوں کی ملاقات ہوئی تھی۔“ وہ  
 دودھ کا گلاس خالی کر چکی تھی۔ گلاس سینٹر ٹیبل پر رکھ  
 کر اس نے دوبارہ اخبار پر نظریں جمادیں اس نے ثمن  
 کی بات ان سنی کر دی تھی۔

”رات عامر کے جانے کے بعد میں نے یہی بات  
 ار تفضی سے کہی تو وہ ہنستے ہوئے کہنے لگے

”تم اب چونکی ہو۔ میں پرسوں رات عامر کے گھر  
 ہی چونک گیا تھا۔ ہم دونوں گاڑی سے اترے تو وہ کتنے  
 پر جوش طریقے سے ہمارا استقبال کرنے آیا تھا۔ لیکن  
 پھر ایک دم اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی تھی۔ کتنے  
 مایوس سے انداز میں اس نے تم سے کہا تھا کہ میں نے  
 سب لوگوں کو انوائٹ کیا تھا۔“ وہ اخبار پر سے نظریں  
 ہٹانے اور ثمن طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ ثمن یہ  
 سمجھ کر کہ اسے اس ذکر میں دلچسپی پیدا ہو رہی ہے مزید  
 تفصیل کے ساتھ ار تفضی کی کہی باتیں بتانے لگی۔



ار تفضی فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔ ”پروگرام تو  
 بہت اچھا ہے۔ اچھا چلو میں ثمن سے بات کر لوں پھر  
 تمہیں کنفرم کروں گا۔“ پھر الوداعی کلمات کہنے کے  
 بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔

”کس کا فون تھا؟“ ثمن نے اس سے پوچھا۔

”عامر کا تھا۔“ ار تفضی نے اسے بتایا۔ پھر ایک  
 شرارتی سی نگاہ صبا پر ڈال کر ثمن سے کہنے لگا۔

”پکنک کا پروگرام بنایا ہے اس نے کہہ رہا ہے دو  
 چھٹیاں اکٹھی آرہی ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر  
 کہیں گھومنے چلنا چاہیے۔ رضا اور فائزہ ہوں گے ہم  
 لوگ ہوں گے اور وہ خود۔“ اس کی بات سن کر ثمن  
 کے چہرے پر بھی شوخ سی مسکراہٹ ابھری۔

”پھر کیا خیال ہے صبا! چلو گی پکنک پر؟“ وہ  
 مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے اس سے پوچھ رہا تھا۔  
 اسے اس شخص کے چہرے کی مسکراہٹ بھی اتنی بری



نہیں لگی تھی جتنی اس وقت لگ رہی تھی۔

”بے چارہ نوکری پیشہ آدمی ہے۔ میرے اور رضا کی طرح بزنس میں نہیں۔ مہینے میں ایک ہی بار تنخواہ ملتی ہے غریب کو۔ اب اگر تم پکنک پر نہیں گئیں تو لامحالہ اسے کوئی تیسرا پروگرام ترتیب دینا پڑے گا اور یہ اضافی بوجھ اس کی جیب برداشت نہیں کر پائے گی۔“ وہ نگاہوں میں شوخی اور شرارت لیے اسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ پلیٹ میز پر سچ کر ایک جھٹکے سے صوفے پر سے اٹھ گئی۔

”کیا ہوا صبا؟“ ثمن اسے یوں غصے سے اٹھتا دیکھ کر حیران ہو گئی۔ اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور ارتضیٰ بھی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ شوخی اور شرارت کی جگہ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی تھی۔

”میں تمہارے بلانے پر یہاں اس لیے نہیں آئی تھی ثمن! کہ تم لوگ میرے لیے کوئی بندہ ڈھونڈو اور پھر زبردستی اس کے ساتھ میرا تعلق جوڑنے کی کوشش کرو۔“ اس کی آواز اچھی خاصی بلند تھی۔

”کیا ہو گیا ہے صبا تمہیں۔ ارتضیٰ تو یونہی مذاق کر رہے تھے۔ کیا تمہیں مذاق سمجھنا بھی نہیں آتا؟“ ثمن کے چہرے پر ناگواری پھیلی۔ اسے صبا کا یہ بد تمیز انداز بہت برا لگا تھا۔

”اس قسم کا مذاق میں کسی کا بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ارتضیٰ بھائی کا بھی نہیں۔ آپ دونوں میاں بیوی کو رشتے کروانے کا اتنا ہی شوق ہے تو کوئی میرج بیورو کھول لیں۔ اپنے لیے اپنی پسند کا بندہ میں خود ڈھونڈ لوں گی۔“ اس بار اس کی آواز تو بلند نہیں تھی لیکن لہجہ ہنوز بد تمیز اور گستاخ تھا۔ وہ ان دونوں پر نظر ڈالے بغیر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ کتنی دیر تک وہ غصے سے کھولتی رہی تھی۔ بہت دیر تک بیڈ پر بیٹھے رہنے کے بعد وہ خود کو پرسکون کرنے کے لیے واش روم میں آ گئی۔ کافی دیر تک چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتے رہنے کے بعد جب اس نے محسوس کیا کہ اس کا اشتعال اب

کم ہو گیا ہے تو وہ واپس کمرے میں آ گئی۔ ارتضیٰ تو نہیں لیکن وہ توقع کر رہی تھی کہ وہ اس کے پیچھے ضرور آئے گی۔ لیکن اب جبکہ کئی گھنٹے گزر چکے تھے اور وہ نہیں آئی تو اسے یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ثمن اس سے ناراض ہے۔ اس نے کچھ دیر پہلے کا سارا واقعہ یاد کیا۔ اسے خود پر سے یوں اختیار کھودینے پر سخت تاسف ہوا۔

اس نے کبھی ارتضیٰ سے مس لی ہو نہیں کیا تھا پھر آج کیوں؟ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے بہت رونا آ رہا تھا۔ ساری رات وہ تکیے میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس کی آنکھ نہیں لگی تھی۔ صبح ہو چکی تھی۔ بستر سے اٹھ کر وہ کھڑکی کے پاس آئی تو نظریں لان میں ایک سرساز کرتے ارتضیٰ سے ٹکرائیں۔ وہ دوپٹہ اوڑھ کر کمرے سے باہر نکلی۔ ثمن شاید ابھی جاگی نہیں تھی۔ وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ وہ لان میں آ گئی۔ ارتضیٰ کی اس کی طرف پشت تھی اس لیے اس نے اسے آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”السلام علیکم ارتضیٰ بھائی!“ اسے ارتضیٰ کا سامنا کرنے کے خیال سے شرمندگی ہو رہی تھی اسی لیے پیچھے سے ہی آہستگی سلام کیا تھا۔ وہ اس کی آواز سن کر چونکنے والے انداز میں بے ساختہ مڑا۔

”وعلیکم السلام۔“ اس کے چہرے کے تاثرات نارمل تھے۔ سلام کا جواب اس نے معمول کے انداز میں دیا تھا۔

”سوری ارتضیٰ بھائی! میں نے رات آپ کے ساتھ بہت بد تمیزی کی۔ مجھے اس طرح مس لی ہو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ثمن ٹھیک کہہ رہی تھی مجھے واقعی مذاق سمجھنا نہیں آتا اتنی معمولی سی بات پر میں خوا مخواہ چڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں دوبارہ سے آنسو آنے لگے۔ ارتضیٰ نے اس کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے اس کی بات سنی۔ پھر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لان چیمبرز کی طرف آ گیا۔

”بیٹھو۔“ اس نے کہا۔



کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ وجہ کہاں پائی جاتی ہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے ار تفضی بھائی! آپ بالکل غلط سمجھ رہے ہیں۔“ اس نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اسے یقین دلانا چاہا۔

”بات تو کچھ ایسی ہی لگ رہی ہے مس صبا شفیق! چلو تم نہیں بتانا چاہ رہیں تو رہنے دو۔ اب کی بار کراچی آؤں گا تو خود ہی وجہ ڈھونڈ نکالوں گا۔ میرا خیال ہے وہ وجہ تمہاری یونیورسٹی میں پائی جاتی ہوگی۔ تب ہی میں سوچا کرتا تھا کہ صبا یونیورسٹی جا کر اتنی بدل کیوں گئی ہے۔ اتنی کھوئی کھوئی اور الگ الگ کیوں رہنے لگی ہے۔“ وہ اب کی بار کھل کر ہنس دیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب و لہجے تو وہ اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔

”اب تم خواجہ خواہ اپنی انرجی ضائع کرو گی۔ جھوٹ بولو گی اور میں یقین نہیں کروں گا۔ تمہاری انرجی بھی ضائع ہوگی اور جھوٹ بولنے پر گناہ الگ ملے گا۔ ایسا کرتے ہیں اس بات کو ہمیں ختم کر دیتے ہیں۔ کسی اور ٹاپک پر بات کرتے ہیں؟“

”آپ نے مجھے معاف کر دیا نا؟ سچ بتائیں ار تفضی بھائی! آپ کے دل میں میری طرف سے کوئی بدگمانی تو نہیں؟“ ار تفضی نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اسی وقت شمن لان میں چلی آئی۔ ان دونوں کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر اسے بہت تعجب ہوا۔ رات صبا کے رویے پر غصہ آنے کے ساتھ ساتھ اسے ار تفضی کے سامنے سخت شرمندگی بھی ہوئی تھی۔ رات اسی شرمندگی میں وہ اس سے کوئی بات کہے بغیر ہی سو گئی تھی۔ وہ ان دونوں کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

”آپ کے کپڑے میں نے نکال دیے ہیں۔“ وہ ار تفضی سے مخاطب تھی۔ ار تفضی نے جواب میں ”اچھا“ کہا تو وہ فوراً واپس مڑ گئی۔ اس نے صبا کی طرف بالکل بھی نہیں دیکھا۔ اسے مکمل طور پر نظر انداز کر کے اپنی ناراضی کا اظہار کرتی وہ اندر چلی گئی تھی۔

”شمن مجھ سے بہت زیادہ خفا ہے۔ آپ اس سے

کئی وہ خود بھی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”مما کہتی ہیں صبا! بعض دفعہ بہت بد تمیز اور منہ بٹ ہو جاتی ہے۔ پھر اسے اس بات کا بھی احساس نہیں رہتا کہ جس سے وہ بات کر رہی ہے وہ عمر اور رشتے میں اس سے بڑا ہے۔“ وہ اس سے نظریں ملائے بغیر سر جھکا کر بول رہی تھی۔ اس کے لہجے میں دھمک اور خود اپنے لیے بہت سا غصہ تھا۔

”مجھے رات کو ہی اپنی بد تمیزی کا احساس ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں اتنی وقت آپ سے آکر معافی مانگوں۔ لیکن میری ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ۔۔۔“ اس کی آنکھوں سے ہتے آنسو اس کی گود میں گر رہے تھے۔ اس نے ایک بار بھی ار تفضی کی طرف نہیں دیکھا۔

”میں نے کچھ نہیں سوچا صبا! مجھے نہ تم پر غصہ آیا اور نہ ہی میں تم سے ناراض ہوں۔ ہاں مجھے حیرت ہوئی تھی۔ میں تمہارے رویے پر حیران ہوا تھا اور ابھی بھی میری حیرت دور نہیں ہوئی ہے۔“ اس نے اپنی سنجیدگی اور بردباری سے اسے جواب دیا۔

”تمہیں کیا بات بری لگی میں سمجھ نہیں پایا۔“

”بس مجھے وہ اچھے نہیں لگتے۔ اس دن جب وہ گھر آئے تھے تب شمن نے اسی طرح کی باتیں کی تھیں، جیسی کل آپ کر رہے تھے۔ یہی کہ وہ میری وجہ سے گھر پر آئے تھے، انہوں نے میری وجہ سے اپنے گھر پر انداز کیا تھا۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ آپ کے دوست بہت اچھے ہیں ار تفضی بھائی! لیکن ضروری تو نہیں کہ وہ مجھے بھی اچھے لگیں۔“ ار تفضی کے چہرے پر سے سنجیدگی غائب ہو گئی۔ اس کے بولنے کا انداز اتنا سادہ اور معصومانہ تھا کہ وہ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ بشکل چھپایا۔

”تمہیں وہ اچھے نہیں لگے، تو پھر وہ کون ہے جو تمہیں اچھا لگتا ہے؟“ اس نے گھبرا کر ار تفضی کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی بوکھلاہٹ کو محفوظ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”بلا وجہ تو کوئی برا نہیں لگتا۔ اس برا لگنے کے پیچھے



”جی ار تفضی بھائی! میں دیکھ رہی ہوں ابھی۔“ اپنی آواز میں بشارت اور تازگی پیدا کرنے کی کوشش کرنے کے باوجود اسے ایسا لگا جیسے اس کے لفظ رورے ہیں۔

”یہ پنک سوٹ دیکھو کیسا لگ رہا ہے؟“ ثمن نے اسے اشارے سے ایک سوٹ دکھایا۔

”ہاں واقعی، یہ بہت پیارا لگ رہا ہے۔ بہت خوب صورت اور منفرد پرنٹ ہے۔“ اس نے فوراً ”ثمن سے اتفاق کرتے ہوئے سیلز مین سے وہ پنک سوٹ نکالنے کے لیے کہا۔ کوئی فرق نہیں پڑتا اگر وہ اسٹ سوٹ کی جگہ پنک لے لے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا اگر جو چیز اس نے پسند کی وہ ار تفضی، ثمن کو دے رہا ہے۔ اس کی تو زندگی کا سب سے اولین خواب، سب سے بڑی خواہش، ار تفضی نے اس سے چھین کر ثمن کو دے دی تھی۔ وہ جب اتنی بڑی بات پر سمجھوتا کر سکتی ہے تو اس معمولی سے سوٹ پر کیوں نہیں۔ اس نے خوشی خوشی وہ شاپر اپنے ہاتھ میں لیا۔ جس میں وہ پنک سوٹ رکھا ہوا تھا اور جسے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آگ لگا دے۔ اس کے بعد بھی وہ لوگ کافی دیر تک شاپنگ کرتے رہے تھے۔



”اب کتنے دنوں تک میں تمہیں یاد کر کر کے اداس ہوا کروں گی۔“ ایمرپورٹ پر اسے رخصت کرنے ار تفضی کے ساتھ ثمن بھی آئی تھی۔ وہ اس کے جانے پر بہت اداس نظر آرہی تھی۔

”اتنی جلدی تمہاری چھٹیاں ختم ہو گئیں، پتا ہی میں چلا۔ دل چاہ رہا ہے ابھی بھی تمہیں جانے نہ دیں۔“ ثمن اس کے گال چومتے ہوئے بولی۔

”اتنی میری یاد آتی ہے تو کراچی آجاؤ۔ ار تفضی بھائی! جب لاہور میں کام مکمل ہو جائے گا، وہ تب واپس جائیں گے۔“ اس نے بظاہر بڑی سنجیدگی اور اپنائیت سے اسے مشورہ دیا۔ اس بات پر ثمن کی خاموشی لازمی تھی۔ ار تفضی اسے خاموش دیکھ کر ہنس پڑا تھا۔

”دیکھا ار تفضی بھائی! یہ پکڑی گئی میرا نمبر اس نے

آپ کے بعد رکھا ہے۔ آپ کے بغیر یہ کبھی کراچی نہیں آئے گی، مگر منہ سے یہ بات قبولے کی نہیں۔“ ثمن نے ہنستے ہوئے ار تفضی سے کہہ رہی تھی۔ انداز سراسر ثمن کو چھیڑنے والا تھا۔

”ہر محبت کی اپنی الگ جگہ اور الگ مقام ہوتا ہے۔ جو ار تفضی ہیں وہ کوئی نہیں ہو سکتا اور جو تم ہو وہ بھی کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔“

”صبا تیار رہو۔ بس اب رونے دھونے کا سیشن شروع ہونے والا ہے۔“ ثمن کو آنسو روکتے دیکھ کر ار تفضی نے اس سے کہا۔

”جی نہیں، میں کوئی نہیں رو رہی۔“ اس نے غفل سے ار تفضی کی طرف دیکھا۔

”اپنا خیال رکھنا صبا!“ اس نے دوبارہ صبا کی طرف دیکھا۔

”میں تو اپنا خیال رکھ ہی لوں گی۔ تم اپنا خیال ذرا اچھی طرح رکھنا۔ نہیں تو اب کی بار میرے بجائے اماں آئیں گی تمہارا خیال رکھنے کے لیے۔“ اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔



وہ ماما کی گود میں سر رکھے انہیں اپنے لاہور کے قیام کی تفصیلات سنارہی تھی۔

”کتنے دنوں بعد آج آپ نے مجھے اس طرح اپنے پاس لٹایا ہے ماما!“ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹی ہوئی تھی۔ ماما اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے ہنسنے لگیں۔

”اتنی بڑی ہو گئی ہو۔ ابھی تک ماما کی گود چاہیے۔ کل کو تمہاری شادی کروں گی پھر ماما کی گود کہاں سے آئے گی؟“

”مجھے تو میری ماما کی گود ہمیشہ چاہیے۔ ساری زندگی۔ جب میں بوڑھی ہو جاؤں گی نا تب بھی۔“ اس نے شادی کے ذکر پر برا سامنہ بنا کر کہا۔

”ماما! ثمن نے اپنا گھراٹا خوب صورت سجایا ہے۔“ ثمن، ار تفضی بھائی کے ساتھ بہت خوش ہے ماما



چومتے ہوئے بے ساختہ کہا۔

”یہ تو بالکل ارتضیٰ کا بچپن ہے مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے وقت پیچھے کی طرف سفر کر گیا ہے اور ارتضیٰ پھر سے میری گود میں آ گیا ہے۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے معاذ کو اپنی گود میں لیا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اتنے چھوٹے بچے کو اٹھایا تھا اس کے چھوٹے چھوٹے اور نازک سے ہاتھ پاؤں اسے کنفیوز کر رہے تھے بڑی احتیاط سے اس نے اسے گود میں لیا تھا۔ ماما اس کے ڈرے ہوئے انداز پر ہنس دیں۔ پھر مسکراتے ہوئے وہ اسے سمجھانے لگیں کہ اتنے چھوٹے بچوں کو کس طرح اٹھایا جاتا ہے۔

بہت آہستگی سے اس نے معاذ کا ہاتھ چوما تو وہ ایک بہت ہی مختلف سے احساس سے دوچار ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس ننھے سے وجود میں سے محبت کی بہت طاقت ور شعاعیں نکل رہی ہیں اور وہ طاقت ور شعاعیں سیدھی اس کے دل پر پڑ رہی ہیں۔ اس کا دل چاہا وہ اسے خوب بھینچ کر پیار کرے۔ محبت کا یہ کیسا احساس جاگا تھا اس کے دل میں۔ کیا اس لیے کہ وہ ارتضیٰ کا بیٹا تھا یا پھر اس لیے کہ وہ ثمن کا بیٹا تھا اس کی بہن کا بیٹا تھا؟ اس کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔



وہ یونیورسٹی سے آ کر بیگ اور دوپٹہ کمرے میں اچھالتی سیدھی ثمن کے کمرے میں آ گئی تھی۔ ارتضیٰ عقیقہ کے اگلے روز واپس چلا گیا تھا جبکہ ثمن ابھی یہیں تھی۔ معاذ جاگا ہوا ثمن کے پاس لیٹا تھا۔ وہ خاموشی سے لیٹی ایک ٹک اسی کو دیکھ رہی تھی۔

”ایسے نمکنکی باندھ کر کیوں دیکھ رہی ہو میرے بھانجے کو۔ کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟“ وہ دوسری طرف سے آ کر بیڈ پر چڑھ گئی اور فوراً ہی معاذ کو گود میں اٹھالیا۔ ثمن جواباً ”صرف مسکرائی تھی۔“

”تم ابھی اتنی خاموشی سے لیٹ کر معاذ کو دیکھتے

ارتضیٰ بھائی اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔“ اس کی بات سن کر ”ہاں“ مجھے پتا ہے یہ بات۔“ اس کی بات نے کہا تھا۔

مرثاری سے مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

اس لیے تو میں اس کی دوری خوشی خوشی برداشت کر رہی ہوں ورنہ اسے خود سے دور بھیجنے کا اب مجھ میں حوصلہ نہیں مگر جب بیٹی اپنے گھر میں اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہوتی ہے نا پھر چاہے وہ ماں کو مہینوں اپنی شکل نہ دکھائے ماں کا دل مطمئن رہتا ہے۔ ثمن یہاں میرے پاس رہتی میری خواہش تو یہی تھی۔ پھر اب جبکہ وہ پریگنٹ ہے اس وقت تو میری شدید خواہش ہے کہ وہ میرے پاس رہے اور میں خود اس کا خیال رکھوں۔

جن سے بہت محبت ہوتی ہے نا صبا! پھر ان کی خوشی ہی میں ہم اپنی خوشی ڈھونڈتے ہیں۔ چاہے ان کی اس خوشی میں ہمارے لیے کوئی تکلیف اور آزمائش ہی کیوں نہ ہو۔ ”محبت کی جو تعریف ماما سے بتا رہی تھی وہ اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟ محبت میں اتنا حوصلہ اور اتنا صبر کیسے آ سکتا ہے؟ اس کی سوچ شاید ابھی خام ہے۔ وہ ابھی امیجیور ہے۔ اس نے دنیا کو صحیح سے دیکھنا اور سمجھنا شروع نہیں کیا۔ شاید آنے والے وقت میں وہ محبت کی اس تعریف کو سمجھ جائے۔ محبت اسے ضد کے بجائے صبر کرنا سکھا دے۔“



وہ ایک بہت ہی روشن اور چمکیلی صبح تھی جب معاذ پیدا ہوا۔ کتنا پیارا تھا وہ۔ گول مٹول سا خوب صحت مندان کے گھر میں خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔ اماں کے خوشی کے مارے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ بابا سارے خاندان میں مٹھائی تقسیم کرواتے پھر رہے تھے۔ ثمن ماں بن کر اور بھی پروقا رہی اور حسین رہی تھی۔ اللہ نے اس کی دعا قبول کر لی تھی۔ اسے بیٹا دے دیا تھا جو شکل و صورت میں بالکل اپنے باپ جیسا لگ رہا تھا۔ اماں نے معاذ کو گود میں لے کر



میری دوستی کروادیں۔ "تمن کو اس نے کبھی غصے میں نہیں دیکھا تھا اور اب جب وہ پہلی مرتبہ غصے میں نظر آ رہی تھی تو وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔

"جا کر سوری بول دو۔ وہ تم سے زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہ سکتی۔" ار تفضی کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔ میں نے اس سے بد تمیزی کی ہوتی تو وہ بہت آسانی سے مجھے معاف کر دیتی۔ لیکن میں نے تو آپ سے بد تمیزی کی ہے اور اس بات پر وہ مجھے اتنی آسانی سے معاف نہیں کرے گی۔" وہ ار تفضی سے براہ راست یہ نہ کہہ سکی کہ وہ تم سے اتنی شدید محبت کرتی ہے کہ ہر اس شخص سے نفرت کرتی ہے جو تمہارے خلاف بولے جو تمہارے خلاف سوچے۔ لیکن ار تفضی اس کی بات میں چھپی یہ بات سمجھ چکا تھا۔ اسی لیے مسکراتے ہوئے بولا۔

"آؤ تمہاری بہن صاحبہ سے صلح کروادوں۔" وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے اندر آ گئے۔ تمن کچن میں تھی۔ ار تفضی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی تھی جو اس کے پیچھے کچن میں آتی صبا کو دیکھ کر فوراً ہی غائب بھی ہو گئی تھی۔

"تم کچن میں کیوں آ گئیں۔ ہم نے کراچی سے یہ جو ملازمہ بلواری رکھی ہے اس سے کام کراؤ۔" تمن نے ایک نظر ار تفضی کو دیکھا اور پھر ایک نظر اس کے پیچھے خاموش کھڑی صبا کو پھر کچھ کہے بغیر اس نے اپنی نظریں ان دونوں پر سے ہٹالیں اور دوبارہ انڈے پھینکنے لگی۔ ار تفضی نے اسے اشارے سے اس کے پاس جانے کو کہا تو وہ فوراً اس کے پاس آ گئی۔

"لاؤ تمن! آلیٹ میں بنا دوں۔" تمن نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔ "بہت شکریہ میں خود بنا لوں گی۔ آپ زحمت نہ کریں۔"

"آئم سوری تمن! پلیز مجھے معاف کر دو۔" وہ ملتجیانہ انداز میں بولی مگر تمن پر بظاہر اس سوری کا کوئی اثر ہوتا نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے بے چارگی سے ار تفضی کی طرف دیکھا۔

"تمن میرا خیال ہے تمہیں صبا کے ساتھ مزید

ناراضی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ وہ پہلے ہی ہر زیادہ شرمندہ ہے۔ میرے حساب سے اس قہر کو ختم کر دیا جانا چاہیے۔" وہ سنجیدگی سے بولتا ہوا تمن کے پاس آ گیا تھا۔

"میں اس سے ناراض نہیں ہوں۔ بس مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میری بہن اتنی بد تمیز ہے۔" اس نے ایک تاسف بھری نگاہ صبا پر ڈالتے ہوئے کہا۔ صبا کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر بھینکنے لگیں۔ جو کبھی ناراض نہ ہوتے ہوں وہ اگر کبھی ناراض ہو جائیں تو انہیں منانا اس قدر مشکل ہوتا ہے یہ بات اسے پہلی مرتبہ چلی تھی۔

"کون کہتا ہے صبا بد تمیز ہے۔ تھوڑی سی آؤٹ اسپو کن اور جذباتی ہے، مگر بد تمیز ہر گز نہیں ہے۔" ار تفضی نے ہمیشہ کی طرح جھٹ اس کی طرف داری کی۔

"آپ بلا وجہ اس کے حمایتی مت بنیں۔" ار تفضی کے ساتھ خفگی کا اظہار کرتے کرتے اس کی صبا پر نظر پڑی تو ایک دم ہی سارا غصہ اور ناراضی بھول گئی۔ اس کی آنکھیں جو آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں انہوں نے اس کا غصہ یکلخت ہی ختم کر دیا۔

"صبا! تم رو کیوں رہی ہو۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

"ناراض نہیں ہو۔ پھر اتنی دیر سے اس طرح سپاٹ انداز میں اسے اسے کر کے کیوں بات کر رہی ہو؟" اس کے شکوہ پر ار تفضی کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"چلو دونوں بہنوں کی صلح تو ہوئی۔ اب تم دونوں آپس میں گلے شکوے کرو۔ میں تیار ہونے جا رہا ہوں۔" اس کے کچن سے نکل جانے کے بعد ان دونوں نے دوبارہ ایک دوسرے کی طرف بغور دیکھا۔

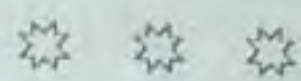
"خود ہی بد تمیزی کرتی ہو۔ پھر مظلوم سی شکل بنا کر رونے بھی کھڑی ہو جاتی ہو۔" وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرنے لگی۔

"میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی صبا! اگر



چاہوں تو بھی نہیں۔ ”کچھ پل وہ اس طرح اس کے کندھے پر سر رکھ کر کھڑی رہی۔ چند لمحوں کے بعد وہ خود ہی اس کے کندھے پر سے سر اٹھا کر اس سے الگ ہو گئی۔

پھر صرف اسی دن نہیں بلکہ آنے والے دنوں میں بھی ثمن اور ارتضیٰ نے اس رات کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ اس روز کے بعد ان دونوں میں سے کسی نے بھی عامر کے بارے میں بھی اس سے کوئی بات نہیں کی۔



اس کے واپس جانے سے دو دن پہلے ارتضیٰ اور ثمن اسے شاپنگ کروانے لے گئے تھے۔

”ہم دنوں نے آپس میں طے کیا تھا کہ صبا کو جاتے وقت کوئی زبردست سا گفٹ دیں گے۔ پھر ثمن کہنے لگی کہ بجائے خود خریدنے کے اگر ہم صبا کو اس کی مرضی کی چیز دلوائیں تو زیادہ اچھا رہے گا۔ چنانچہ تمہیں شاپنگ کے لیے لے کر جایا جا رہا ہے اور اس بات کی میری طرف سے تمہیں کھلی اجازت ہے کہ تم جو دل چاہے خرید لینا۔“ گھر سے نکلنے وقت ارتضیٰ نے اس سے کہا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے ارتضیٰ بھائی! میں تو اتنی دیر سے یہی سمجھ رہی تھی کہ ہم لوگ کہیں گھومنے جا رہے ہیں۔ پلیز آپ یہ شاپنگ واپنگ رہنے دیں۔“ اس نے منع کرنا چاہا۔

”تو صبا شفیق اتنی بڑی ہو گئی ہیں کہ انہیں مجھ سے ٹکلف کرنا آگیا ہے۔“ ارتضیٰ نے بیک ویو مرر میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم کتنی بھی بڑی ہو جاؤ۔ میرے لیے تو وہی چھوٹی سی صبا ہی رہو گی وہ صبا جو مجھ سے پوچھ پوچھ کر اپنا اسکول کا کام کرتی تھی۔“ ثمن جو اس کی باتوں کو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی اچنبھے سے بولی۔

”روزانہ آپ اسے ہوم ورک کراتے تھے؟“

اور نہیں تو کیا پوچھو اس سے ارتضیٰ بڑے مزے سے کہنے لگا۔

”ہمیشہ بچی ہی تو سمجھا مجھے۔ کبھی سوچا ہی نہیں کہ وہ لڑکی جسے آپ اب تک بچی سمجھتے ہیں وہ بڑی ہو چکی ہے۔ کھلونوں سے بہلنے والا وقت تو کب کا پیچھے رہ گیا زندگی میں اس نے کچھ خواب دیکھے تھے۔ اس کے وہ سارے خواب تنکا تنکا کر کے آپ ہی نے بکھیرے ہیں۔“ وہ خاموشی سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

ارتضیٰ، ثمن کو اس کے بچپن کے مختلف واقعات مزے لے لے کر سنا رہا تھا اور وہ بڑی اٹھماک سے انہیں سن رہی تھی۔ ساتھ ہنستی بھی جا رہی تھی۔ یقیناً ”وہ ان باتوں کو بہت انجوائے کر رہی تھی۔ پھر شاپنگ سینٹر سے مختلف چیزوں کی شاپنگ کرتے وہ لوگ اب ایک کپڑوں کی دکان میں کھڑے تھے۔“

”کوئی خوب صورت سا سوٹ پسند کرو اپنے لیے۔“ ثمن کے کہنے پر اس نے ادھر ادھر نظریں گھمائیں تو خود بخود ہی اس کی نگاہیں ایک سفید رنگ کے لباس پر جا کر ٹھہر گئیں۔

”ثمن! یہ سوٹ تم خرید لو۔“ قبل اس کے کہ وہ اس سوٹ کی طرف اشارہ کرتی ارتضیٰ نے اسے ہاتھ میں لیتے ہوئے ثمن سے کہا۔

”لیکن میں اپنے لیے تو شاپنگ کرنے نہیں آئی تھی۔“ ثمن ایک قدم آگے بڑھا کر ارتضیٰ کے برابر جا کر کھڑی ہو گئی اور سوٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”بس تم یہ لے لو۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔“ وہ قطعیت بھرے انداز میں بولا پھر اس پر سے نظریں ہٹا کر صبا سے پوچھنے لگا۔

”کیوں صبا! پسند آیا تمہیں کوئی سوٹ؟“ ارتضیٰ نے جیسے ہی سوٹ کو ثمن کے لیے پسند کیا اس نے فوراً ”اپنی نظریں اس سوٹ پر سے ہٹا لی تھیں وہ اب غائب دماغی سے ارد گرد نظریں دوڑاتی جیسے کوئی سوٹ پسند کرنا چاہ رہی تھی۔“



ہوئے کیا سوچ رہی تھیں؟

”بتاؤں گی تو تم ہنسو گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں معاذ کے بارے میں سوچ رہی تھی صبا! وہ جب چلنا شروع کرے گا تو کیسا لگے گا اس کا وہ چھوٹا سا ہلکا قدم کیسا ہو گا۔ وہ تھوڑا سا چل کر لڑکھڑا کر گرنے لگے گا میں جلدی سے اسے تھام لوں گی، گرنے سے بچالوں گی، پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ لے کر اسے چلاتے ہوئے اس کا چلنے کا شوق پورا کراؤں گی۔“ اس کے تصورات کی دنیا صبا کے بے ساختہ سے قہقہے نے ختم کر ڈالی۔

”پھر وہ اور بڑا ہو گا اسکول سے کالج اور پھر کالج سے یونیورسٹی میں پہنچ جائے گا۔ اپنی کسی خوب صورت سی کلاس فیلو کے ساتھ اس کا زبردست قسم کا فیئر چلے گا۔ تم روایتی ماؤں کی طرح ولن کا کردار ادا کرتے ہوئے یہ شادی نہیں ہو سکتی“ کا اعلان کرو گی۔ میں ایسے موقع پر اپنے بھانجے کی حمایت کروں گی۔ پھر اگر تمہاری مخالفت کے باوجود بھی یہ شادی ہو گئی تو تم اپنی بہو کا جینا دو بھر کر دو گی۔ ثمن تم ظالم اور خطرناک قسم کی ساس بن کر کتنی پیاری لگو گی۔“ وہ اپنی باتوں کو انجوائے کرتے ہوئے بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ ثمن بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”حد ہے صبا! میں اتنی سنجیدگی سے بات کر رہی تھی اور تم کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔“ وہ دونوں مل کر ہنس رہی تھیں۔



”صبا! یہ سوپ ثمن کو دے آؤ۔“ ممانے ثمن کے لیے سوپ تیار کر کے اس سے کہا تھا۔ وہ خود اب رات کے کھانے کے لیے ڈیڈی کی پسندیدہ فروٹ سلاد بنانے میں مصروف ہو گئی تھیں۔

”اس سے کہنا بغیر خیرے دکھائے سارا سوپ پینا ہے۔“ ٹرے ہاتھ میں اٹھا کر کچن سے نکلتے ہوئے اس نے ممانے کی بات سنی اور سر ہلاتے ہوئے ثمن کے کمرے میں آ گئی۔ وہ کمرے میں آئی تو ثمن کسی سے

فون پر باتیں کر رہی تھی۔

”بہت مزہ آرہا ہے مجھے یہاں پر۔ سب ایسے خیرے اٹھا رہے ہیں میرے جیسے میں کوئی وی آئی پی ہوں۔ ابھی ابھی صبا کمرے میں آئی ہے، میرے لیے ٹرے میں کچھ لے کر۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”ابھی ایک ہفتہ تو ہوا ہے آپ کو گئے ہوئے رہیں تھوڑے دن کے لیے، اچھا ہے میری اہمیت پتا چل رہی ہو گی۔ میرا فی الحال واپسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں یہاں بہت انجوائے کر رہی ہوں۔“ اس نے ثمن کے سامنے لا کر ٹرے رکھ دی پھر ایک نظر معاذ پر ڈالی وہ کٹ میں لیٹا بے خبر سو رہا تھا۔

”اچھا اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ مجھے سوپ پینا ہے۔“ پھر خدا حافظ کہتے ہوئے ثمن نے فون بند کر دیا۔

”ار تفضی کا فون تھا۔ مجھ سے واپس آنے کے لیے کہہ رہے تھے۔“ ثمن نے سوپ کا پیالہ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس سے کہا۔

”دیکھو ذرا“ مجھے گھر کی سجاوٹ اور شاہنگز کا لالچ دے کر بلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی اس نے بہت خاموشی سے ثمن کے خوشی سے جھلملاتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

”تم سوپ پیو ثمن! ممانے کہا ہے سارا سوپ پینا ہے تمہیں۔ میں کچن میں جا رہی ہوں۔ ممانے ڈیڈی کے لیے فروٹ سلاد بنا رہی ہیں، تھوڑی ان کی ہیلپ کراؤں۔“ ثمن نے چیخ منہ میں لے جاتے ہوئے سر ہلا کر گویا اسے جانے کی اجازت دی۔ وہ کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آ گئی۔

”ثمن! آج دوپہر میں جب تم مجھ سے اپنے خواب شیئر کر رہی تھیں تو میں انہیں اتنے ہی پیار سے سن رہی تھی جتنے پیار سے تم انہیں سنارہی تھیں۔ مجھے ایک پل کے لیے بھی تمہارے خوابوں سے حد محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ میرے بہن کے خواب تھے، پھر تم نے میرے خوابوں کے ساتھ ایسا کیوں کیا ثمن؟



اجاڑ ڈالے ناں تم نے میرے وہ سارے خواب۔ وہ خواب جو میں اپنی زندگی کے سترہ سالوں تک دیکھتی رہی۔

مجھے یہ بات یاد آتی ہے کہ تم ہی وہ لڑکی ہو جس نے میرے خواب مجھ سے چھین لیے، تو پھر مجھے تم سے نفرت بھی محسوس ہوتی ہے اور تم سے تمہارے خواب چھین لینے کا دل بھی چاہتا ہے اور جب تمہیں اپنی بہن کی نظر سے دیکھتی ہوں تو تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو، تم پر پیار آتا ہے اور ار تفضی غضنفر کے ساتھ دیکھتی ہوں کہ اس کے حوالے سے دیکھتی ہوں، تم اس کی محبوبہ ہو، اس کی بیوی ہو، اس کے بچے کی ماں ہو۔ تو مجھے تم سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ دیکھ کر اس کے بارے میں اتنے استحقاق کے ساتھ بولتا دیکھ کر آج بھی مجھے اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے۔ اتنی ہی اذیت جتنی اول روز ہوئی تھی۔ وہ ماما کے پاس کچن میں آگئی تھی۔



ثمن، ار تفضی سے آنے کے لیے منع کرنے کے باوجود دو دن بعد ہی لاہور چلی گئی تھی۔ اماں، ثمن کے ساتھ گئی تھیں۔ پہلے اگر انہیں صرف ثمن کی فکر رہا کرتی تھی تو اب فکر کرنے کے لیے معاذ کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد گھر میں ہر طرف سناٹا پھیل گیا تھا۔



ار تفضی کالاہور میں کام ختم ہو گیا تھا۔ وہ لوگ کراچی واپس آ گئے۔ معاذ اب گیارہ ماہ کا ہو چکا تھا۔ اس کی پہلی سالگرہ آنے میں صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا۔ بلا کا ضدی اور شرارتی تھا وہ۔ سب گھر والوں کو نچائے رکھتا تھا۔ اس کی شرارتوں اور شور شرابے سے گھر میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی تھی۔ وہ ایک اکیلا بچہ تھا اور لاڈ اٹھانے والے بہت۔ اماں خوش ہو ہو کر اپنے بچوں کو دیکھتی تھیں۔ ان کا خاندان مکمل ہو گیا تھا،

صرف ظفر کی کمی تھی۔ باقی ان کے سب بچے ان کی نگاہوں کے سامنے تھے۔

”عامر کی شادی ہو گئی پچھلے مہینے۔“ معاذ کو کچھ مڑی کھلاتے ہوئے ثمن نے اسے مخاطب کیا۔ وہ معاذ کے ساتھ بلا کس سے کھیلنے میں مصروف تھی۔

”کون عامر؟“ اسے واقعی یاد نہیں آیا تھا۔

”زیادہ بنو مت۔ وہ فائزہ کا کزن۔ اب یہ مت کہنا کہ کون فائزہ۔“ ثمن نے کسی قدر ناراض لہجے میں کہا۔

”اچھا وہ ہاں یاد آ گیا مجھے، بہت مبارک ہو۔“ اس کے لیے جیسے اس بات میں کہیں افسوس کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ ”کس سے ہوئی اس کی شادی۔ وہ جو لڑکیاں اس کے پیچھے قطار لگائے کھڑی رہا کرتی تھیں ان ہی میں سے کسی سے ہوئی ہے یا کوئی اور ہے۔“ اپنی اسی مصروفیت کے ساتھ اس نے بغیر سر اٹھائے پوچھا۔

”کزن ہے اس کی، بہت پیاری ہے۔ فائن آرٹس میں گریجویشن کر رہا ہے اس نے۔ اسلام آباد میں ہوا تھا اس کا ولیمہ، ہم لوگ بھی گئے تھے۔ اتنا شاندار پل ہے ان دونوں کا ولیمہ والے دن عامر گرے سوٹ میں بے حد ہینڈ سم لگ رہا تھا حالانکہ کسی سے جیلس ہونا اچھی بات نہیں لیکن پھر بھی مجھے اس کی بیوی سے اتنی جیلسی ہو رہی تھی۔“ ثمن نے بہت دکھ بھرے انداز میں اسے تفصیلات سنائیں۔

”تم کیوں جیلس ہو رہی تھیں؟۔ وہ ار تفضی بھائی سے زیادہ ہینڈ سم تو نہیں لگ رہا ہو گا۔“

”بلا وجہ اتراؤ مت۔ سب پتا ہے تمہیں۔ اتنا اچھا لگتا تھا عامر مجھے تمہارے لیے فائزہ نے مجھ سے تمہارے اور عامر کے رشتے کے بارے میں ایک بار بات بھی کی تھی۔ جب تم لاہور، ہم لوگوں کے پاس رہے واپس آ گئی تھیں اس کے کچھ دنوں بعد ظاہری بات ہے عامر نے اس سے یہ بات کرنے کے لیے کہا ہر گ۔

میرے ہاں کرنے کی دیر تھی، عامر فوراً اپنے



پیرس کو یہاں کراچی رشتہ مانگنے کے لیے بھیج دیتا۔  
انتادل دکھا میرا اس کو منع کرتے ہوئے۔ مگر تم جو اتنی  
شدت کے ساتھ اس کے بارے میں ناپسندیدگی ظاہر  
کر آئی تھیں تو میں بات آگے کیسے بڑھا سکتی تھی۔  
شمن نے بہت غصے سے اسے گھورتے ہوئے ساری  
بات بتائی۔ وہ شمن کی باتیں سن تو رہی تھیں مگر کسی  
خاص توجہ کے بغیر۔

”صبا! تم مجھے سچ سچ بتاؤ۔ عامر کو ناپسند کرنے کی  
اصل وجہ کیا تھی؟ تمہارا اس رات کا رد عمل میرے  
لیے بہت حیرت انگیز تھا۔ اتنی شدت سے تم نے اس  
بارے میں اپنی ناگواری کا اظہار کیا تھا کہ مجھے یوں لگا  
جیسے تم کسی کو پسند کرتی ہو۔ تب اس بارے میں مزید  
بات کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ارتضیٰ سے  
بھی میری کبھی اس بارے میں بات نہیں ہوئی۔ شاید  
میری طرح انہوں نے بھی دانستہ اس بات کو انکسور  
کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ میں نے سوچا تھا کچھ دنوں  
بعد تم سے پوچھوں گی۔ لیکن پھر معاذ کے ہونے کے  
بعد تو میں ہر بات ہی بھول گئی۔ یہ تو پچھلے مہینے جو اس  
کے ولیمہ کا کارڈ آیا اور پھر ہم لوگ وہاں گئے تو مجھے وہ  
بھولی ہوئی بات یاد آئی۔“ وہ معاذ کو کھانا کھلا چکی تھی۔  
نیپکن سے اس کا منہ صاف کرنے کے بعد اب وہ  
مکمل توجہ کے ساتھ اسی کو دیکھ رہی تھی۔

”کیا واقعی کوئی ہے جسے تم پسند کرتی ہو یا پھر یہ محض  
میرا وہم ہے؟۔ دیکھو سچ سچ بتانا۔ اگر تم نے مجھ سے  
جھوٹ بولا اور پھر بعد میں مجھے سچ بات کہیں اور سے  
بتا چلی تو میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں میں نے تم سے  
ارتضیٰ کے بارے میں ہر بات شیئر کی تھی۔ کی تھی کیا  
ابھی بھی کرتی ہوں۔ جب میں تمہیں اپنی ہر بات بتاتی  
ہوں تو پھر یہ میرا حق ہے کہ تم بھی مجھ سے کچھ مت  
چھپاؤ۔“

”تم مجھے ہر بات اس لیے بتاتی تھیں کیونکہ  
تمہارے پاس بتانے کے لیے بہت ساری باتیں  
تھیں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ کاش تمہاری طرح کی

کوئی لواشتوری میری بھی ہوتی۔ ایک ہینڈ سم سائبند جو  
دل و جان سے مجھ پر فدا ہو رہا ہے اور جسے دیکھ کر میرا  
دل تیز تیز دھڑکنا شروع کر دیتا ہو۔ افسوس میرے پاس  
تمہیں سنانے کے لیے کوئی حسین اور رنگین کہانی  
نہیں ہے۔“ وہ شگفتگی سے ہنس دی۔

”پھر وہ تمہیں اتنا برا کیوں لگا تھا؟ وہ ہینڈ سم بندہ دل و  
جان سے فدا ہو تو رہا تھا تم پر۔“ شمن نے جرح کی۔  
”تمہیں سڈنی میں اپنا کلاس فیلو جو بہت جینٹل  
تھا، بہت ہینڈ سم تھا اور تمہیں بہت پسند بھی کرتا تھا  
کیوں اچھا تمہیں لگتا تھا؟ اور وہ تمہارے انکل کا بیٹا جو  
صرف تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے تم لوگوں کے  
گھر آیا کرتا تھا، کتنا کوالیفائیڈ تھا وہ، پھر کیوں تم نے  
اسے ناپسند کیا، کیوں نہیں تم نے اس کی محبت قبول کر  
لی تھی شمن؟“ وہ بہت مدلل انداز میں بولی۔ شمن  
لا جواب ہو جانے والے انداز میں خاموشی سے اسے  
دیکھ رہی تھی۔

”ہر اچھا شخص جو مجھے پسند بھی کر رہا ہو ضروری  
نہیں کہ میں بھی اسے پسند کرنے لگوں اور یہ بھی  
ضروری نہیں کہ اس ناپسندیدگی کے پیچھے کوئی نہ کوئی  
وجہ بھی ہو۔ ایسے ہی میرے پاس بھی اسے ناپسند  
کرنے کی کوئی وجہ نہیں سوائے اس کے کہ وہ وہ نہیں  
جسے دیکھ کر میرا دل تیز دھڑکنے لگے یا شاید کچھ پل کے  
لیے دھڑکنا ہی بھول جائے۔“ شمن کے پاس اب بحث  
کرنے کے لیے کوئی پوائنٹ نہیں بچا تھا۔

معاذ کی پہلی سالگرہ آنے میں چند دن رہ گئے تھے۔  
گھر میں سب کی خواہش تھی کہ سالگرہ کی تقریب  
خوب شاندار طریقے سے منعقد کی جائے۔ گھر میں کئی  
دن پہلے سے فنکشن کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔  
شمن کو ظفر کے اس موقع پر دور ہونے پر بہت رنج تھا۔  
”وہیے فرمائشیں کر کر کے معاذ کی تصویریں اور  
مووی منگواتے رہتے ہیں۔ دیکھوں تو سہی میرا بھانجا  
کتنا بڑا ہو گیا اور اب جب اسی لاڈلے بھانجے کی



سالگرہ ہے تو انہیں تحفہ بھیجنا تو دور کی بات فون پر مبارک باد دینا بھی یاد نہیں رہا۔ ”وہ ماما سے گلے شکوے کرنے میں مصروف تھی۔

ان دونوں سے کچھ فاصلے پر بیٹھا، ار تفضی بظاہر معاذ کے ساتھ کھیلتا ہوا اس گفتگو کو لاپرواہی سے سن رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک شوخ سی مسکراہٹ چھپی ہوئی تھی۔ ظفر نے اپنے آنے کی اطلاع صرف اس کو دی تھی۔ یقیناً ”وہ اس طرح اچانک پہنچ کر سب کو سر پر اندر دینا چاہتا تھا“ تھوڑی دیر بعد جب وہ معاذ کو ثمن کی گود میں دے کر یہ کہتا ہوا کہ ”میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ گھر سے گاڑی لے کر نکلا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ظفر کو لینے ایر پورٹ جا رہا ہے۔

ظفر کو ایک دم سے اپنے سامنے دیکھ کر سب ہی بہت خوش ہوئے، مگر ثمن کی خوشی تو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ گھر میں پہلے ہی سے خوشیوں نے قدم جما رکھے تھے، ان خوشیوں اور رونقوں کو ظفر کی آمد نے کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

وہ تیار ہو کر ثمن کے کمرے میں آئی تو وہ بھی تیار ہو چکی تھی۔ پریل کلر کی خوب کام سے بھری ہوئی قیمتی ساڑھی پہنے وہ ہمیشہ سے بھی بڑھ کر حسین لگ رہی تھی۔

”بہت خوب صورت لگ رہی ہو تم۔ یہ سیٹ اس ساڑھی کے ساتھ بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ اندر آکر اسے دیکھتے ہوئے اس نے بے ساختہ تعریف کی۔

”تم بھی تو بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ لیکن تم نے بال کیوں نہیں کھولے۔ ان کپڑوں کے ساتھ بال کھولتیں تو زیادہ اچھا لگتا۔“ وہ معاذ کو تیار کرنے میں مصروف تھی۔ اس کی تیاری کو غور سے دیکھنے کے لیے اس نے سر اوپر اٹھایا تھا۔

”اماں نے منع کر دیا یار! انہیں لگتا ہے کہ کہیں میرے حسیں بالوں کو کسی کا نظر نہ لگ جائے۔“

”لوگوں کو اور کوئی کام تھوڑی ہے دنیا میں۔ وہ بے چارے اتنے فارغ ہیں کہ میرے بالوں کی خوب صورتی پر خوب غور و فکر بھی کریں گے اور پھر انہیں نظر بھی لگائیں گے۔“ معاذ، ثمن کی گود میں اچھل کود رہا تھا، اسے ثمن کی تیاری کی فکر لاحق ہوئی، لیکن وہ اپنی تیاری کے خراب ہو جانے کے بارے میں ذرا بھی متفکر نہیں تھی۔

”میرا بیٹا میری گود میں آکر خوش ہو رہا ہے اور میرا یہ سوچ کر اسے خود سے دور کر دوں کہ کہیں میری ساڑھی خراب نہ ہو جائے۔“ اس نے معاذ کے ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

معاذ کے لیے وہ ہمیشہ ایسی ہی دیوانگی دکھاتی تھی، آج تو یہ دیوانگی ہمیشہ سے بھی بڑھ کر نظر آرہی تھی۔ بہت دلچسپی سے ماں بیٹے کی محبت دیکھ رہی تھی۔ کبھی اس کے ہاتھ چومتی، کبھی گال، کبھی ماتھا اور اسے جیسے ماں کے اس لمس سے بہت تسکین مل رہی تھی، خوب کھلکھلا کر ہنستے ہوئے وہ اپنی خوشی کا اظہار کرتا تھا۔

”تم تو ایسے پیار کر رہی ہو ثمن جیسے یہ تم سے کہیں دور جانے والا ہے۔“ وہ اس کی بے تابی اور والہانہ انداز دیکھ کر کہے بنا رہ نہ سکی۔

”اللہ نہ کرے جو کبھی معاذ مجھ سے دور ہو۔“ ثمن کو اس کی بات پسند نہیں آئی۔

”میں اپنے بیٹے کو کبھی خود سے دور نہیں جاؤں گی۔ اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گی۔ پڑھنے کے لیے بھی باہر نہیں بھیجوں گی۔“ وہ اسے اسی انداز سے

پیار کرتے ہوئے اس سے بولی۔ اسی وقت کمرے دروازہ کھول کر ار تفضی اندر آیا۔ ایک بہت ہی بھرپور نگاہ اس نے ثمن پر ڈالی، صبا کی موجودگی کی وجہ سے منہ سے تو کچھ نہیں بولا، لیکن اس کی نگاہوں کی ستارے

چمک بتا رہی تھی کہ وہ اسے اس روپ میں بہت پیار لگ رہی ہے۔



بالکل شہزادہ لگ رہا ہے۔ "اس نے ارتضیٰ کی توجہ بیٹے کی طرف مبذول کروائی وہ اس کے کہنے سے پہلے ہی معاذ کو دیکھ چکا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر اس کے گل جوئے۔

"میں اپنی ماما کو بتاؤ کہ وہ خود بھی بالکل شہزادی لگ رہی ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ ثمن ان سکنس بربری طرح جھینپ گئی تھی۔

"صبا! تم ہم تینوں کی ایک تصویر تو کھینچو ذرا جلدی سے پھر میں کیک لینے جاؤں گا۔" اس نے سائنڈ نیبل پر رکھا کیمرو اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ایک ساتھ کھڑے ہو گئے، معاذ کو ثمن نے گود میں اٹھالیا۔

"صبا! تصویر بہت اچھی آئی چاہیے۔ تمہاری فوٹو گرافی کا امتحان ہے آج۔" اس نے کیمرو آنکھ سے لگایا تو ارتضیٰ بولا۔ ثمن اور ارتضیٰ کے چہروں پر تو مسکراہٹ تھی ہی، معاذ بھی خوب کھلکھلا رہا تھا۔ اس نے تصویر کھینچ لی۔ ارتضیٰ رینگ نیبل سے گاڑی کی چابی اور والٹ اٹھانے لگا تو ثمن بولی۔

"میں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔ مجھے ماما کے اور اپنے لیے گجرے خریدنے ہیں۔" ارتضیٰ نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"تم بھی آ جاؤ صبا! ابھی تو کوئی بھی مہمان نہیں آیا فنکشن شروع ہونے میں خاصا وقت ہے ابھی۔"

معاذ کو گود میں اٹھا کر ارتضیٰ کے پیچھے جاتے ہوئے وہ اس سے بولی۔ معاذ کے لیے وہ بہترین سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوتی تھی۔ ارتضیٰ کے ساتھ مل کر اس نے خوب ساری بیکریز چھانی تھیں، اپنی پسند کا کیک بنوانے کے لیے۔

"تم لوگ بیٹھو میں کیک لے کر آتا ہوں۔" بیکری کے پاس لا کر گاڑی روکتے ہوئے وہ ان لوگوں سے بولا پھر وہ اندر چلا گیا اور یہ دونوں اس کا انتظار کرنے لگیں۔

"صبا! دیکھو وہ سامنے جو لڑکا گجرے بیچ رہا ہے اس کے گجرے کتنے خوب صورت اور بالکل فریش لگ

رہے ہیں۔" ثمن نے اسے وہ لڑکا دکھایا جو سگنل بند ہونے پر ہر گاڑی کے پاس جا کر اس میں بیٹھے لوگوں سے اپنے گجرے خریدنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"میں اس سے گجرے لے کر آتی ہوں۔ اتنے خوب صورت گجرے کسی دوکان پر ملنے مشکل ہیں۔" ان لوگوں کی گاڑی سروس روڈ پر بیکری کے سامنے پارک ہوئی ہوئی تھی اور وہ لڑکا سامنے روڈ پر ادھر سے ادھر بھاگتا گجرے بیچ رہا تھا۔

"بھئی ارتضیٰ بھائی آجائیں گے، تم ان سے منگوا لینا۔ خود کہاں جاؤ گی اس کے پیچھے۔" اس نے اسے منع کرنا چاہا۔

"دو منٹ لگیں گے یار۔ یہ گئی اور یہ آئی۔" وہ اس کی بات ان سنی کر کے گاڑی سے اتر گئی۔ وہ کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فٹ پاتھ سے اتر کر روڈ کے کنارے پر کھڑے ہو کر ہی ثمن نے اس لڑکے کو آواز دی تھی۔ اس نے ثمن کی آواز سن لی تھی، وہ روڈ کے دوسری طرف تھا۔ وہ ثمن کی طرف آنے لگا مگر اس کے پیچھے سے پہلے سامنے سے ایک انتہائی تیز رفتار بس ثمن تک پہنچ گئی۔ وہ بس اسٹاپ نہیں تھا، بس اس جگہ لا کر روکنے کا کوئی جواز نہیں تھا اور وہ بھی اتنی تیز رفتاری سے۔ اس نے ثمن کو روڈ پر گرتے دیکھا، بس کے ٹائر اسے کھلتے ہوئے کچھ دور جا کر کے تھے۔

"ثمن۔" اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ اس کا بیگ اس کی گود سے پھسل کر سیٹ پر گر گیا۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر دیوانہ وار اس کی طرف بھاگی۔ صرف اسی نے یہ منظر نہیں دیکھا تھا، بیکری سے کیک کاڈبہ ہاتھ میں لے کر نکلتے ہوئے ارتضیٰ نے بھی اسے گرتے اور بس کے نیچے آ کر کھلے جاتے دیکھا تھا۔ کیک کاڈبہ اس کے ہاتھوں سے گر گیا تھا۔ وہ اندھا دھند بھاگا۔ صبا سے بھی پہلے وہ اس تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے کہاں کہاں سے خون بہہ رہا تھا پتا نہیں چل رہا تھا مگر وہ پوری کی پوری خون میں نہائی ہوئی تھی۔



”ٹمن آنکھیں کھولو دیکھو کچھ نہیں ہوا۔ ابھی ہم ہسپتال پہنچ جائیں گے۔“ وہ پاگلوں کی طرح اسے ہتھوڑ کر بولا پھر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر تیزی سے واپس گاڑی کی طرف آیا۔ اس کے جسم سے بے شمار ہوتا خون اسے ہر اسٹاپ کر رہا تھا۔ اس کی قمیص اور اس کے ہاتھ ٹمن کے خون سے پورے پورے بیگ گئے تھے۔ اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر اس نے بہت تیز رفتاری سے گاڑی دوڑائی تھی۔ اس رفتار سے اس نے زندگی میں کبھی گاڑی نہیں چلائی تھی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر وہ ٹمن کا سراپنی گود میں رکھ کر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”آپ گاڑی تیز کیوں نہیں چلا رہے۔“ وہ روتے ہوئے چلا رہی تھی۔

”ٹمن! آنکھیں کھولو پلین۔“ وہ اس کی بند آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”یہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہی ار تفضی بھائی! اس سے کہیں یہ آنکھیں کھولے۔“ وہ اپنے حواس کھو رہی تھی۔

”ٹمن! پلین آنکھیں کھولو۔ دیکھو ابھی ہمیں معاذ کی سالگرہ کا فنکشن کرنا ہے۔ گھر پر مہمان آنا شروع ہو گئے ہوں گے۔“ اس کا ہاتھ ٹمن کے سینے پر بالکل دل کے پاس رکھا تھا۔ اسے وہاں خاموشی کا احساس کیوں ہوا تھا۔ گھبرا کر اس نے اپنا ہاتھ وہاں سے اٹھالیا۔

”یہ کچھ بولتی کیوں نہیں ہے۔“ اس نے اپنے ذہن میں بھیکے ہاتھوں کو خوفزدہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی گود میں سر رکھے وہ بالکل خاموش تھی، آنکھیں بند کیے جیسے اب کبھی کچھ نہیں بولے گی۔

وہ لوگ ہسپتال پہنچ گئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح اوپر اوپر دیکھ رہی تھی۔ اسے نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ کچھ سنائی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر نے آکر ٹمن کو دیکھا۔ وہ منتظر تھی کہ ابھی وہ اسے ٹرٹمنٹ دینا شروع کرے گا، ان لوگوں سے کہے گا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ مگر وہ اسے ٹرٹمنٹ نہیں دے رہا تھا۔ وہ ان لوگوں سے ”فکر نہ کریں“ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔

وہ کہہ رہا ہے کہ ٹمن مر گئی ہے۔ وہ راستے ہی میں مر چکی تھی۔

اس کی گود میں سر رکھے رکھے ہی وہ مر چکی تھی۔ ار تفضی نے خالی خالی نگاہوں کے ساتھ بڑی بے یقینی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اٹنے قدموں چلتی ٹمن اور ار تفضی سے بہت دور ہٹ گئی تھی۔ پھر اس نے ار تفضی کو ٹمن کے اوپر جھک کر چیخ کر روتے سنا۔ اس نے بھیچ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اسے لگا کہ ابھی وہ آنکھیں کھولے گی تو سب ٹھیک ہو گا۔ ٹمن اس کے پاس کھڑی مسکرا رہی ہو گی۔

”دیکھا کیسا ڈرایا میں نے تم لوگوں کو۔“ اس کے پاس آکر کوئی کچھ بولا تو تھا مگر وہ ٹمن نہیں تھی۔ پتا نہیں وہ کون تھی شاید کوئی نرس، وہ اس کے ہاتھوں میں بہت سے زیورات پکڑا رہی تھی۔ جڑاؤ ہار سونے کے کنگین، انگوٹھیاں، سونے کی چین پتا نہیں کیا کیا چیزیں تھیں۔ اس نے ان سب چیزوں کو تعجب سے دیکھنے لگی۔

### ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے معروف ناول

- \* دل بھولوں کی بستی ————— محبت عبد اللہ ————— 400/-
- \* جو پہلے تو جہاں سے گزرتے ————— ماہا ملک ————— 150/-
- \* وہ خنطی سی دیوانی سی ————— آسیہ سلیمانی ————— 400/-
- \* طائر لاہوتی ————— رفعت سرور ————— 550/-
- \* ایمان اُمید اور محبت ————— عمیرہ احمد ————— 180/-
- \* خواتین کا گھریلو انسائیکلو پیڈیا ————— 600/-

خوبصورت سڈرک، آفٹ پیپر، خوبصورت چھپائی، دیدہ زیب منبوطہ جلد

### شائع ہو گئے ہیں

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی

لاہور میونسپلٹی

- لاہور اکیڈمی • سلطان نیوز ایجنسی
- عظیم اینڈ سنز • اسلام آباد کتب خانہ

راولپنڈی میونسپلٹی • اشرف بک ایجنسی



اس نے ڈیڈی اور بابا کو لوریوں میں انا دیکھا تو بھاگتی ہوئی ان کے پاس آگئی۔

”ڈیڈی! من کو یہاں سے لے چلیں، یہ ہاسپٹل بالکل اچھا نہیں ہے۔ یہاں کے ڈاکٹر پتا نہیں کیسے ہیں۔ وہ من کو ٹریٹمنٹ نہیں دے رہے۔“ ڈیڈی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، وہ زار و قطار رو رہے تھے۔ بابا نے آگے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ لیکن بولے وہ بھی کچھ نہیں۔ ”چلو صبا۔“ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں سے لے آیا۔ وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ راستے بھر وہ خاموش رہی۔ گاڑی ان کے گھر کے پاس آکر رکی تو باہر سے ہی اسے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ اسے گھر کے اندر قدم رکھتے خوف آیا۔ وہ گاڑی سے اتر گئی مگر گھر کے اندر جانے کے بجائے لان کے آخری کونے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن یہاں پر بھی رونے کی بہت تیز آوازیں اس کے کانوں میں آرہی تھیں۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں، تھوڑی تھوڑی دیر بعد گاڑیوں سے اتر کر مختلف لوگ ان کے گھر میں آ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ لان میں بھی بہت سے لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔

مما فون پر من کے ایکسیڈنٹ کا سن کر ہی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اماں غم سے نڈھال ایک طرف ساکت بیٹھی تھیں۔ ان کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور لبوں پر مسلسل بس ایک ہی جملہ تھا۔ ”من! یہ وقت تو میرے جانے کا تھا نا۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا۔ تمہیں اپنی بوڑھی دادی پر ذرا رحم نہیں آیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ اس صدمے کو سہہ بھی سکتی ہے یا نہیں۔“ ڈیڈی ایک طرف بیٹھے بلک بلک کر روتے بیٹی کے آخری سفر کی تیاریاں دیکھ رہے تھے۔ بابا ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ان کے کندھے کے گرد اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں دلاسا دینے کی کوشش کرتے وہ خود بھی روئے چلے جا رہے تھے۔

ایر تفضی ضبط کی آخری حد پر پہنچا خاموشی سے لوگوں کے عزیمتی جملے سن رہا تھا۔ اس کے لب بالکل خاموش

تھے اور اس کی آنکھیں بالکل ویران اور خیر۔ ظفر آج صبح جس بہن کو خوش کرنے کے لیے اسے سربراہ دینے اچانک یہاں پہنچا تھا، اس وقت اسی بہن کو آنکھیں بند کر کے گہری نیند سوتا دیکھ رہا تھا۔

کیا تقدیر اتنی سفاک ہوتی ہے۔ ہنستے چہروں سے یوں لمحہ بھر میں مسکان چھین لیتی ہے۔

کیا تقدیر اسے آج یہاں اس لیے لائی تھی کہ وہ بہن کے مرجانے پر لوگوں کی ہمدردانہ نظریں دیکھے، عزیمتی الفاظ سنے اور اپنے ماں باپ اور دادی کو عمر کی ان انتہاؤں پر سنبھالے۔ یہ سوچے کہ اسے رونا نہیں اسے سب کو سنبھالنا ہے۔ بابا کو، ڈیڈی کو، ماما کو، دادی کو، ایر تفضی کو اور صبا کو۔

لیکن صبا وہ کہاں ہے؟ اسے اچانک صبا کا خیال آیا۔ ماما کے پاس ڈاکٹر اور اپنی چند رشتے دار خواتین کو چھوڑ کر وہ صبا کی تلاش میں آیا۔ یہاں وہاں اس کی تلاش میں نظریں دوڑا تا وہ گھر کے پچھلے حصے میں آگیا تھا۔ صبا اسے وہاں نظر آگئی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ خود بھی اسے آنا دیکھ کر اس کے پاس آگئی۔

”ظفر بھائی! من اپنے اور ماما کے لیے گھر لے گئی ہے۔“

”اسے گجروں نے نہیں، موت نے بلایا تھا صبا!“ ظفر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بے اختیار اس نے صبا کو گلے سے لگا لیا۔

”صبا! من چلی گئی، ہمیں چھوڑ کر۔“ وہ ٹپ کر اس کے بازوؤں میں سے نکلی اور بھاگتی ہوئی وہیں پچھلے طرف سے کھلنے والا دروازہ کھول کر گھر کے اندر آگئی۔ ظفر بھی اس کے پیچھے اندر آگیا۔

وہاں بہت سے لوگ تھے، لاؤنج لوگوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا ظفر، ماما کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہے، مگر وہ اس سے سنبھالی نہیں جا رہی تھیں۔ ان کی چیخیں گھر کے در و دیوار کو ہلارہی تھیں۔ اور لاؤنج کے بیچوں بیچ وہ لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند کیے وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ ہلکی سی آہٹ سے بھی



سوتے سوتے اٹھ جلیا کرتی تھی اور آج اتنے شور میں وہ اتنے سکون سے سو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئی تھیں۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ ثمن بھی اس روز انس ہاؤس اور ممبائی کے ساتھ اسی پلین میں ہوتی۔“

وہ مرجاتی پھر یہ سب نہ ہوتا جو آج ہوا۔ وہ آج اس شخص کی دلہن بنی بیٹھی ہے جسے میں نے اپنی زندگی سے بھی پرہ کر چاہا ہے۔ ”اس کے منہ سے چیخ نہیں نکل سکی تھی۔“

وہاں جتنے لوگ رو رہے تھے، بین کر رہے تھے، ان کی وہ سب آوازیں اس روتی ہوئی آواز کے آگے دب گئی تھیں۔ اسے اب لاؤنج میں سوائے ثمن کے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں وہاں تنہا تھیں۔ اسے اب کہیں پر بھی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی سوائے اپنی اس روتی ہوئی آواز کے۔ وہ ثمن کے بالکل پاس آگئی تھی۔ پھر اس نے دیکھا سوتے سوتے ایک دم ثمن نے اپنی آنکھیں کھول دی ہیں۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی ہے۔

”تمہیں میرا آنا برا لگا تھا نا!۔ تم سوچتی تھیں کہ ثمن یہاں پر کیوں آگئی ہے اس کے آنے سے پہلے ہم سب کتنے خوش رہا کرتے تھے، میں جا رہی ہوں صبا! اب تم لوگ دوبارہ سے خوش رہنے لگو گے۔ میں تو بس اپنی زندگی کے یہ چند آخری سال تم لوگوں کے ساتھ گزارنے آئی تھی۔ تم لوگوں کے درمیان تھوڑا سا وقت گزارنا چاہتی تھی میں۔ اتنی سی بات پر تم اتنا دکھی ہوتی تھیں۔“

میں اس محبت سے دستبردار ہو گئی ہوں۔ اب میں کبھی تمہاری بچپن کی محبت پر اپنا حق نہیں جتاؤں گی۔ تمہاری محبت صرف تمہاری ہے۔“

اس نے رونا چاہا مگر اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں نکل سکا۔ وہ جس طرح بول نہیں سکتی تھی، اسی طرح رو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے دیکھا چند لوگ ثمن کے پاس آئے، وہ اسے وہاں سے اٹھانے لگے۔ اس نے آگے بڑھ کر ان لوگوں کو روکنا چاہا۔ مگر اس کے

پاؤں زمین کے اندر دھنس چکے تھے، وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتی تھی۔

وہاں موجود ہر فرد کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس کی آنکھیں رونا ہی بھول چکی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جم گئے تھے۔ آنسو بن کر بہنے والا پانی برف بن کر اس کی آنکھوں میں جم گیا تھا۔

”میرے اللہ، کس کی نظر کھا گئی میرے بچوں کی خوشیوں کو۔ میرے دل کو چین نہیں آتا مولا۔ کتنی دعائیں مانگی تھیں میں نے اپنے بچوں کی خوشیوں کے لیے۔ کیا میری کوئی دعا بھی قبول نہیں ہوئی تھی۔“ اماں اپنا کلیجہ پیٹ پیٹ کر روئے چلی جا رہی تھیں۔ ڈیڈی ان کے پاس بیٹھے سر جھکائے آنسو بہا رہے تھے۔

”اماں! آپ کی پیاری ثمن کی خوشیوں کو میری نظر لگی ہے۔ ہاں اماں! میری میں اپنی بہن کی خوشیوں سے جل گئی تھی۔ کم ظرف اور حاسد ہو گئی تھی۔ اسے میری آہ لگی ہے۔ جس رات اس نے اپنی نئی زندگی کا آغاز آپ سب کی دعاؤں کے ساتھ کیا تھا، اس رات میں سارا وقت اپنی بہن کو یہ دعائیں دیتی رہی تھی۔ اللہ سے شکوے کرتی رہی تھی۔ میرے آنسو اور میری آہیں کھا گئیں اس کی خوشیوں کو۔ شاید اس رات میرے لیے در قبولیت کھلا ہوا تھا اور میں نے قبولیت کی گھڑی میں اپنی بہن کے لیے موت مانگی تھی۔ میرا دل چاہا تھا میں اسے اس کی سچ سے اٹھا کر کہیں غائب کر دوں اور خود اس کی جگہ وہاں بیٹھ جاؤں۔ آپ لوگوں کی دعاؤں میں وہ اثر نہیں تھا جو میری بد دعاؤں میں تھا۔ دیکھیں وہ واقعی غائب ہو گئی ہے۔ اب مجھے کبھی بھی یہ نہیں کہنا پڑے گا کہ ثمن تم یہاں پر کیوں آگئی ہو۔ اس رات میری سب بد دعائیں عرش پر اٹھالی گئی تھیں، دیکھیں ان کی قبولیت میں دو سال کا عرصہ بھی نہیں لگا۔ پندرہ دن باقی ہیں نا ابھی اس کی شادی کی دو سہ سال لگ رہے ہیں۔ کتنے تھوڑے سے دن کی خوشی ملی تھی اسے۔ میں اپنے ہر عمل اور ہر بات کا جواز ڈھونڈ کر لے آؤں۔ مگر اس بات کا کیا جواز ڈھونڈوں؟“



اس کی آنکھوں سے ایک آنسو نہیں گر رہا۔

\*\*\*

سوئم والے دن قبرستان سے فاتحہ پڑھ کر آنے کے بعد ار تفضی نے اپنی تین دنوں کی خاموشی توڑ دی تھی۔ وہ اماں کی گود میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح ہلک ہلک کر رونے لگا۔

”وہ کہتی تھی میں زندگی کے ہر دکھ اور ہر سکھ میں تمہارا ساتھ نبھاؤں گی۔ ساری دنیا تمہارا ساتھ چھوڑ دے میں نہیں چھوڑوں گی۔ آج ساری دنیا میرے ساتھ ہے اور وہ ہمیشہ ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے والی نہیں ہے۔ کتنی جھوٹی تھی ثمن، کتنے جھوٹے وعدے کیے تھے اس نے مجھ سے۔“ اماں اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے خود بھی رو رہی تھیں۔

”میرے بیٹے کی قسمت بھی میری جیسی ہے۔ میں بھی بن ماں کے پلا تھانا، اماں! دیکھیں وہ بھی بن ماں کے پلے گا۔ اس نے کہا تھا ہم معاذ کو پہلے دن اسکول چھوڑنے ایک ساتھ جائیں گے۔ اب جب وہ پہلے دن اسکول جائے گا تو اس کا دوسرا ہاتھ کون پکڑے گا؟“

”بن ماں کا بچہ!“ معاذ کے لیے یہ لفظ سننا کتنا اذیت ناک تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہوا، وہ ار تفضی سے کہنا چاہتی تھی۔

”ممت بولو معاذ کے لیے یہ لفظ۔“ اسے اچانک ہی معاذ کا خیال آیا تھا۔ اسے وہ تین دنوں سے بھولی بیٹھی تھی۔ ان تین دنوں میں کس نے اس کا خیال رکھا۔ کون اس کی دیکھ بھال کرتا رہا، اسے بالکل نہیں پتا تھا۔ وہ بابا کی گود میں بیٹھا بڑے مزے سے ان کے گلاسز سے کھیل رہا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ اس کا کتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ تقدیر نے اس معصوم سے وہ چیز چھین لی جس کی اسے سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

ار تفضی کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ کچھ تین راتوں سے نہیں سویا۔ وہ آج پہلی مرتبہ ار تفضی غصہ کو سو فیصد ثمن کے حوالے سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی بہن کا محبوب ہے، اس کا شوہر ہے۔ اس کے

\*\*\*

غم کی جو یہ سفاک اور ہولناک آندھی چلی تھی اور جو اس گھر کے سب سکھ اور ساری خوشیاں اڑا لے گئی تھی۔ ان میں کسی کو کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

ار تفضی نے تو کمرے سے ہی نہیں نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ بابا اور ڈیڈی تعزیت کے لیے آنے والوں سے مل رہے تھے۔ ظفر، ماما کے ساتھ ہاسپٹل میں تھا۔ اس کی کزنز نے دو تین بار اسے مخاطب کرنے اور وہاں سے اٹھانے کی کوشش کی، مگر وہ جیسے انہیں سن ہی نہیں رہی تھی۔ ماما، شام کے وقت ہاسپٹل سے واپس آئی تھیں۔ ظفر انہیں سہارا دے کر اندر لایا تھا۔ صرف ایک دن میں وہ بہت بوڑھی اور بہت کمزور ہو گئی تھی۔

ڈیڈی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھایا تھا۔

”سب مجھ سے کہہ رہے ہیں صبر کرو، مگر میں کیسے صبر کروں شفیق! میری کم عمر اور معصوم بیٹی منوں مٹی تلے جاسوئی ہے۔ میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں۔ وہ میرے وجود کا حصہ تھی۔ کسی کے جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر پھینک دو اور اس سے کہو کہ اسے بھول جائے، صبر کر لے۔ اولاد کیا بھول جانے والی چیز ہوتی ہے کہ کچھ عرصہ بعد صبر آجائے۔“ وہ ڈیڈی کے کندھے پر سر رکھ کر سسک رہی تھیں۔

اسے ایسا لگا جیسے ثمن کے ساتھ ساتھ ماما اور ڈیڈی بھی مر گئے ہیں۔

اس کے ساکت وجود میں یک دم حرکت پیدا ہوئی تھی۔ وہ اٹھی اور بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔ وضو کر کے اس نے جائے نماز بچھائی۔

جب میری بد دعاؤں میں اتنا اثر ہے تو دعاؤں میں کیوں نہیں؟

”ثمن کو واپس بھیج دے میرے اللہ، اس کی جگہ مجھے بلا لے۔ موت کے فرشتے کو اس گھر سے ایک زندگی چاہیے تھی نا۔ تو میری زندگی ثمن کو دے دے۔ اور اس کی موت مجھے۔“ دعا مانگتے مانگتے اسے احساس ہوا کہ اس کے لفظ بالکل بے جان سے ہیں،



بیٹے کا باپ ہے۔ ار تفضی سے اس کا ہر رشتہ صرف اور صرف ثمن کے حوالے سے ہے۔ اگر ثمن کو بیچ میں سے ہٹا دو تو اس کا اس شخص سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ آج اسے دیکھ کر نہ کھو دینے کا دکھ ہوا تھا اور نہ حاصل کر لینے کی جستجو۔ وہ اسے یاد کر کے اس قدر سوگوار تھا۔ وہ اس شخص کے دکھ کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کر سکتی تھی۔ اسے پتا تھا یہ شخص اس کی بہن سے کتنی بے تحاشا محبت کرتا تھا۔

وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آگئی، اس نے کمرے کے درو دیوار کی طرف دیکھا۔ اس بیڈ کی طرف دیکھا جس پر بے شمار راتیں ان دونوں نے ساتھ سو کر گزاری تھیں۔ وہ بیڈ سوگوار تھا۔ وہ درو دیوار سوگوار تھے۔ حالانکہ وہ تو اس کی شادی سے پہلے کی بات تھی۔ دو سال پہلے کی بات تھی جب وہ اس کمرے میں رہا کرتی، پھر یہ کمرہ آج اچانک اس کی جدائی میں کیوں غمگین ہو گیا تھا۔ لیکن وہ کمرہ اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ پچھلے دو سالوں سے اس کی کمی محسوس کر رہا ہے۔ کمرے کی مالکن کو یہ بات آج پتا چلی تھی۔

”مجھے میرے کمرے میں تو سکون سے رہنے دو۔ اس گھر میں آتے ہی تم نے مجھ سے میری ہر چیز چھین لی۔“ اس کے کمرے نے اسے اسی کی کہی ایک بات یاد دلائی۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ وہ ٹیرس پر آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا تھا۔ بات بات پر رو پڑنے والی صبا شفیق یونا بھول گئی تھی۔ جو برف اس کی آنکھوں میں جمی تھی اسے اب کبھی نہیں پگھلنا تھا۔ وہ جانتی تھی موسموں کی کوئی سختی اور کوئی پیش اب اس برف کو پگھلا نہیں سکتی تھی۔ اس کے اندر ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ سامنے سڑک پر بہت سے لوگ آتے جاتے نظر آرہے تھے مگر وہ کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔ بس یہ سوچ رہی تھی۔

”کیا زندگی نے کبھی ان لوگوں کو آزمایا نہیں۔ مجھے تو زندگی نے بڑی بے رحمی سے آزمایا ہے۔ مجھے میرے پیروں پر کھڑے رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔“

\*\*\*

ریشماں اسے ناشتے کے لیے بلانے آئی تھی۔ وہ ڈائننگ روم میں آگئی۔ وہاں ماما، ڈیڈی، ار تفضی اور ظفر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی ناشتہ شروع نہیں کیا تھا۔ وہ تینوں خاموشی سے ناشتے کی میز کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہاں بیٹھا ہر فرد زندہ لاش نظر آ رہا تھا۔ وہ سب لوگ ایک دوسرے کی وجہ سے وہاں بیٹھے تھے۔ اور ایک دوسرے ہی کے لیے ناشتہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”ماما! آپ کچھ بھی نہیں کھا رہیں۔ یہ آلیٹ تو کھالیں۔“ ظفر ان کے برابر والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ان کی پلیٹ میں وہ آلیٹ ڈالنے لگا تو انہوں نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔

”میں لے لوں گی ظفر! جب سانس لینی نہیں چھوڑی تو کھانا کھانا بھی نہیں چھوڑوں گی۔ تم میری فکر مت کرو۔“ ان کے لفظوں میں بہت درد تھا۔

معاذ جاگ گیا تھا، ریشماں اسے ماما کے کمرے سے اٹھا کر وہیں لے آئی تھی۔ ڈیڈی نے اسے اپنی گود میں بٹھالیا تھا۔ مگر وہ دو تین سیکنڈ میں ہی ان کی گود سے نیچے اتر کر کارپٹ پر بیٹھ کر کھیلنے لگا تھا۔

”رات، ثمن میرے پاس آئی تھی۔“ ماما کسی سے بھی مخاطب ہوئے بغیر آہستہ سے بولیں۔

”مجھ سے کہہ رہی تھی، ماما! قبر میں بہت اندھیرا ہے، مجھے اکیلے بہت ڈر لگتا ہے۔ آپ میرے پاس آجائیں۔“

”ار تفضی! تمہیں پتا ہے نا، وہ کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ڈر جاتی تھی۔ کوئی پیچھے سے آکر اسے اچانک آواز دے تو وہ چونک جاتی تھی۔ اور اندھیرے سے کتنا ڈر لگتا تھا۔ کبھی لائٹ چلی جاتی تو اکیلے سونے کے لیے اپنے کمرے میں بھی نہیں جاتی تھی۔“ بابا بے بسی اور غم کی تصویر بنے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ار تفضی نے اپنا سر اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ چائے کے



کپ پر نظریں جمائے جیسے ان کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔

سب کی توجہ مہما کی طرف تھی، اس کی بھی تھی۔ لیکن پھر اچانک اس کی نظر معاذ پر پڑ گئی۔ وہ کارپٹ پر کھیلے ہوئے ان لوگوں سے تھوڑا دور چلا گیا تھا۔ کونے میں رکھی چھوٹی سی ٹیبل کو پکڑ کر وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ کھڑے ہونے کے بعد وہ فخریہ انداز میں اپنے اس کارنامے پر مسکرایا۔ پھر میز پر سے اپنے دونوں ہاتھ اس نے ہٹا دیے اور آگے کی طرف بغیر کسی سہارے کے ایک قدم بڑھایا۔ وہ چیزوں کا سہارا لے کر کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ گھٹنوں، گھٹنوں اور چیزیں پکڑ کر چلنے بھی لگا تھا۔ مگر بغیر کسی سہارے کے یہ اس کا پہلا قدم تھا۔ اور اس پہلے قدم کے بعد وہ اگلے پل فوراً نیچے گر گیا تھا۔

اس کے پہلے قدم پر اسے تھام لینے والی ماں آج یہاں نہیں تھی۔ ورنہ کیا وہ یوں کرتا۔ وہ کیا اسے بھاگتے ہوئے جا کر پکڑ نہ لیتی؟ اسے اپنے قدم کا توازن کس قدر انتظار تھا۔ یوں ایک دم گر پڑنے پر چوٹ تو نہیں لگی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی رونے لگا تھا شاید اپنی کوشش کی ناکامی پر۔ مہما پر سے سب کی توجہ ہٹ گئی تھی۔ وہ ہی سب سے پہلے بھاگ کے اس کے پاس گئی تھیں، باقی سب بھی اٹھ کر اس کے پاس چلے گئے تھے۔ صرف صبا اور ارتضیٰ میز پر بیٹھے رہے۔ مگر نظریں ان دونوں کی بھی ادھر ہی تھیں۔ مہما اسے گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اماں، معاذ کے رونے کی آواز سن کر اپنے کمرے سے نکل آئی تھیں۔ سب اس کے گرد جمع ہو گئے، اسے بہلانے لگے پھر ظفر اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی خاطر اسے گھر سے باہر لے گیا۔

”چلو معاذ! باہر چلتے ہیں۔“ باہر چلنے والی بات وہ خوب سمجھا کرتا تھا۔ اسی لیے فوراً اس کی گود میں چڑھ گیا تھا۔

”ہر ماں اپنے بچے کے پیچھے اتنی ہی دیوانی ہوتی ہے۔ اتنی ہی پاگل ہوتی ہے۔ یہ رشتہ ہی ایسا ہے۔“ وہ

بغیر ناشتہ کیے میز پر سے اٹھ گئی۔

”کہاں جائے وہ؟ کس جگہ؟ وہ کون سی جگہ ہوگی جہاں جا کر دل کو سکون ملے گا۔“ وہ گھر کے مختلف حصوں میں چکراتی پھر رہی تھی۔

”ڈھونڈا کرو گی اب تم نمٹن کو۔ آوازیں دیا کرو گی اسے۔“ وہ سیڑھیوں پر گر پڑنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔

”تم نے کہا تھا نمٹن کہ تم مجھ سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتیں۔ اگر چاہو تو بھی نہیں۔“ اس کے لبوں سے سرگوشی نما آواز نکلی۔

”نہیں ہوں بابا میں تم سے ناراض اب کب تک یہ رونی صورت بنائے رکھوں گی۔“ اس نے اپنے گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔

”نمٹن ابھی جب تم مجھ سے ناراض ہوئیں تو اتنی اجنبی لگ رہی تھیں۔ مجھے تمہاری ناراضی سے بہت ڈر لگا۔ ایسا لگ رہا تھا میں تمہیں منا ہی نہیں پاؤں گی۔ اس طرح ناراض مت ہوا کرو نمٹن۔“ اس کے دل کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ گھٹنوں پر سر رکھے ”تم اس طرح ناراض مت ہوا کرو نمٹن!“ کہے چلی جا رہی تھی۔

”صبا!“ اس کے کانوں نے ڈیڈی کی آواز سنی۔ کتنے دنوں بعد آج ڈیڈی نے اسے آواز دی۔ اس نے گھٹنوں پر سے سر اٹھایا۔ ”یہاں دھوپ میں کیوں آکر بیٹھ گئیں۔ کتنی گرمی ہو رہی ہے۔ یہاں۔“ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ یہاں سب سے چھپ کر اکیلی بیٹھی رو رہی ہے، مگر اس کی آنکھیں تو بالکل خشک تھیں۔ وہ رو نہیں رہی تھی تو کیا ہوا۔ وہ ان کی بیٹی تھی۔ کیا اس کی آنکھوں سے جھانکتا ملال اور کرب دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ۔۔۔؟“ انہوں نے اسے بڑے پیار سے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

”اس طرح اکیلی کیوں بیٹھ گئیں بیٹا! اندر اپنی مہما ماں کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ۔“ ان کے لہجے میں اس کے لیے پیار کے ساتھ ساتھ تشویش بھی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ ڈیڈی کے سینے پر سر رکھ کر بہت سا روئے۔ ان



ادھر ادھر کے قصے سناتے رہے تھے اور وہ خود میں ان دونوں سے نگاہیں ملانے کا حوصلہ نہ پا کر سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔



ظفر وہ پانچ تصویریں ڈولپ کروا کر لے آیا تھا جو اس روز فنکشن شروع ہونے سے پہلے کھینچی گئی تھیں۔ ان میں چار تصویریں معاذ کی تھیں۔ وہ چاروں تصویریں ظفر نے کھینچی تھیں۔ اور پانچویں تصویر وہ تھی جو زندگی کے اس کھر سے رخصت ہونے سے پینتالیس منٹ پہلے کھینچی گئی تھی۔ جس طرح کیمرہ کی آنکھ بہت سے خوب صورت منظروں کو ہمیشہ کے لیے قید کر سکتی ہے، کاش اسی طرح وقت بھی قید کیا جاسکتا۔

وہ تصویر اس سے بھی بڑھ کر اچھی آئی تھی، جتنی کہ اس سے فرمائش کی گئی تھی۔

ار تفتی نے اس تصویر پر صرف ایک نظر ڈالی اور فوراً وہاں سے اٹھ گیا۔ اس نے تصویر اپنے ہاتھ میں بھی نہیں لی تھی۔ وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔ ماما اس تصویر کو چومتے ہوئے رو رہی تھیں۔ پھر ماما کے کہنے پر ظفر نے وہ تصویر اندارج کروائی تھی، اور بہت خوبصورت سے فریم میں جڑوا کر ماما ہی کی خواہش پر اسے لاؤنج میں لگا دیا تھا۔ ماما گھنٹوں بیٹھ کر اس تصویر کو تکتی رہتی تھیں۔



رات کے دو بج رہے تھے، وہ جاگی ہوئی تھی۔ معاذ کے رونے کی ہلکی سی آواز اس کے کمرے تک پہنچ رہی تھی۔ مگر وہ بے حس سے انداز میں لیٹی چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ معاذ کو گود میں اٹھا کر ماما اس کے کمرے میں آگئی تھیں۔

”شکر ہے صبا! تم جاگی ہوئی ہو، ذرا دیکھو اسے شاید تمہارے پاس آکر چپ ہو جائے۔ میں کتنی دیر سے اسے بہلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا یہ اتنا رو کیوں رہا ہے۔ پتا نہیں یہ بھوک کی وجہ

سے بوچھے۔

”ڈیڈی! زندگی اتنی بے رحم کیوں ہوتی ہے؟“  
”آپ چلیں ڈیڈی میں آرہی ہوں۔“ اس نے ان سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

ڈیڈی سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گئے تھے۔ وہ مردہ قدموں سے چلتے ہوئے اندر آگئی۔ ماما کے کمرے کے پاس آئی تو دروازہ کھلا ہوا نظر آیا۔

”بلیجہ! ہمیں اپنے بچوں کی خاطر خود کو سنبھالنا ہوگا۔ اگر ہم یوں ہمت ہار گئے تو ہمارے بچوں کا کیا ہوگا۔ تم نے صبا کو دیکھا ہے۔ کیسی مر جھا گئی ہے۔ میری بیٹی۔ ابھی جس طرح وہ تنہا اور اداس بیٹھی تھی، میرے دل کو کچھ ہوا تھا اسے دیکھ کر۔“ ڈیڈی ماما کو سمجھا رہے تھے۔ ماما ان کی نگاہ اس پر پڑی۔

”آجاؤ صبا۔“ انہوں نے اس کی خاطر مسکرانے کی کوشش کی تو وہ اپنی نظروں میں مزید گرنے لگی۔ ماما نے بھی اتنے دنوں بعد اسے توجہ سے دیکھا تھا۔ کچھ کہے بغیر انہوں نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ ماما کے پاس بیڈ پر آگئی۔ ڈیڈی بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا اور ماما کا دل بہلانے کے لیے وہ معاذ کی کسی تازہ ترین شرارت کا ذکر بڑے پر لطف انداز میں کر رہے تھے۔ اس کا ضمیر اسے کچھ دے رہا تھا۔  
”ڈیڈی! آپ اور ماما سمجھ رہے ہیں صبا کو ثمن کے مرنے کا بہت دکھ ہے۔“ غم کی انتہا پر پہنچ کر اس کی آنکھیں منجمد ہو گئی ہیں۔

”آپ دونوں کو پتا ہی نہیں کہ وہ غم کی وجہ سے نہیں ضمیر کی چیخ کی وجہ سے خاموش ہو گئی ہے۔ اس لیے کہ یہ خواہش اس نے بارہا کی تھی، ثمن کے کہیں چلے جانے کی خواہش، اس کے غائب ہو جانے کی خواہش، اس کے مرجانے کی دعائیں مانگی تھیں اس نے۔ اور اب جب کہ وہ واقعی مر گئی تو صبا شفیق احساس جرم میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اتنی جس شاید اس میں باقی ہے کہ وہ اپنے گناہوں پر نادم ہو سکے۔ مگر یہ بات وہ آپ دونوں کو بتائے گی نہیں۔ اس میں اتنی اخلاقی جرات نہیں کہ اپنی بد صورت شکل آپ لوگوں کو دکھاسکے۔“ ڈیڈی



اس کے رونے کی شدت میں اچانک ہی کمی آگئی تھی۔ رو تو وہ ابھی بھی رہا تھا۔ مگر اب رونے میں ضد اور غصے کی جگہ شکوے نے لے لی تھی۔  
”کہاں چلی گئی تھیں مجھے چھوڑ کر؟“ وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر سسکیاں لے رہا تھا۔

When the Glorious Sun Is Set,  
When The Grass With Dew Is Wet

اس کی سسکیوں کی آواز آنا بھی بند ہو گئی تھی۔ ”مما“ بھی رونا بھول کر صبا کی آواز میں کھو گئی تھیں۔ وہ ایک ٹک صبا کو دیکھ رہی تھیں۔ کتنی ملتی تھی اس کی آواز شمن سے۔

”صبا چپ مت ہو۔ یو نہی گنگناتی رہو۔ تمہاری آواز میں مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی ہے۔“ ان کی آنکھیں اس سے اتجا کر رہی تھیں۔ انہوں نے کتنی مرتبہ اسے یہی نظم گنگناتے سنا تھا۔

شمن کے چالیسویں کے بعد ظفر واپس چلا گیا تھا۔ اس کے سپروائزر کا فون آیا تھا۔ اس کا پی ایچ ڈی آخری مراحل میں تھا۔ اتنے دن یہاں رکنے سے اس کا بہت حرج ہو گیا تھا۔

سب نے بڑے چوٹے اور ہمت سے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔



زندگی کسی کے لیے نہیں رکتی، کسی کے نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جن لوگوں کے ہونے سے لگتا ہے کہ زندگی ان ہی کے دم سے ہے، یہ نہیں ہوں گے تو زندگی ہی نہیں ہوگی۔ جب وہ نہیں ہوتے زندگی تب بھی ہوتی ہے۔ وہ اس طرح چلتی رہتی ہے۔ وہ زندہ رہ کر زندگی سے منہ نہیں پھیر سکتے تھے۔ دل کرب اور درد سے بھرے تھے۔ آنکھیں ملول اور افسردہ تھیں مگر انہیں پھر بھی زندگی کی طرف واپس تو آنا تھا۔

ار تفضی آفس جانے لگا تھا۔ اس نے خود کو پہلے کی طرح مصروف کر لیا تھا کہ شمن کی یاد تو ہر جگہ اس کے

سے رو رہا ہے۔ یا اس کے کہیں درد ہو رہا ہے۔ میں نے فیڈر منہ میں دینے کی کوشش کی مگر اس نے نہیں لیا۔ ”ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں“ روتے ہوئے معاذ کو اور اس کی فیڈر کو انہوں نے اس کی گود میں ڈال دیا۔ اور خود بھی بیڈ پر اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ اتنے دنوں سے معاذ کو ممما ہی سنبھال رہی تھیں۔ آج پتا نہیں اسے کیا ہوا تھا۔ جو وہ یوں چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔

”تم میں کیا ہے صبا! میرا دل خود بخود تمہاری طرف کھینچا ہے۔“ اسے اس ننھے سے وجود میں سے بڑی آواز سی خوشبو آئی۔ اس نے اسے بھیج کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ جس طرح اس بچے کی ماں کا دل اس کی طرف کھینچتا تھا، اسی طرح اس کا دل اس بچے کی طرف کھینچنے لگا تھا۔ وہ اسے سینے سے لگا کر چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ چپ ہو نہیں رہا تھا۔

”اسے دودھ پلاؤ شاید بھوک کی وجہ سے ہی رو رہا ہے۔“ ممما کے کہنے پر اس نے فیڈر اٹھا کر اسے دودھ پلانے کی کوشش کی۔ مگر اس نے روتے ہوئے ہاتھ مار کر فیڈر دور پھینک دی۔

”اسے ماں کی ہڑک ہو رہی ہے۔ دن میں بچہ کسی کے پاس بھی رہ لے رات میں اسے ماں کی گود ہی چاہیے ہوتی ہے۔ وہ بول نہیں سکتا تو کیا ہوا، ڈھونڈ تو رہا ہوگا اسے۔“ ممما بولتے بولتے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھیں۔ اسے یاد آیا، شمن، معاذ کو گود میں لے کر ٹھلایا کرتی تھی۔

وہ اسے گود میں لے کر کھڑی ہو گئی۔ اسے اپنے کندھے سے لگا کر کمرے میں ٹھلنے لگی، اپنا ایک ہاتھ وہ بڑی آہستگی سے اس کی کمر پر پھیر رہی تھی۔ اور دوسرا اس کے بالوں پر، لیکن شمن اسے ٹھلاتے وقت کچھ گنگناتی بھی تو تھی۔

”کیا...؟ صبا کو اچھی طرح یاد تھا وہ کیا گنگناتی تھی۔ اس نے بہت آہستہ اور بڑے کومل اور مدھم مدھم انداز میں گنگناتا شروع کر دیا تھا۔

Twinkle Twinkle Little Star  
How I Wonder What You Are



اس نے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھاگ کر اس کی طرف آتا تھا اور وہ اسے نظر انداز نہیں کر پاتی تھی۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے لفظ بولنے شروع کر دیے تھے۔ ماما کو ماما بڑا صاف بولتا تھا۔ باقی اس کی بولی ایسی تھی جو صرف ماما کی اور اس کی سمجھ میں آتی تھی۔

رات کو ماما اور معاذ اس کے کمرے ہی میں سونے لگے تھے۔ رات کو وہ ماما سے نہیں بٹھلتا تھا۔ جب ضد میں آیا ہوتا تو ماما سے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی تھیں۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر ٹھلاتی، اسے بڑے پیار سے بٹھلاتی۔ کتنی راتیں ماما اور اس نے مل کر معاذ کے لیے جاگی تھیں۔

”نمن چلی گئی، میرا ار تفضی تمہارہ گیا، معاذ سے اس کی ماں چھن گئی۔ میں کس کس بات کا غم کروں۔ میرے بچوں سے ان کی خوشیاں چھن گئی ہیں۔ اب جینے کا دل نہیں چاہتا غصہ بہت جی لیا۔“ بابا اور ڈیڈی کافی دیر تک اماں کا دل بٹھانے کے لیے ان کے پاس بیٹھے رہے تھے۔ وہ اپنے دکھ بیٹوں کے ساتھ بانٹ کر پرسکون ہو گئی تھیں۔ بہت دنوں بعد انہوں نے کسی کے ساتھ اتنی طویل گفتگو کی تھی۔ اپنے سارے دکھ درد ہلکے کر کے وہ اتنی پرسکون ہوئیں کہ اس رات کو صبح ہونے پر کسی کے جگانے سے بھی نہیں اٹھیں۔

نمن کا غم اماں نے اپنے دل سے ایسا لگایا تھا کہ اس کے مرنے کے صرف سات مہینے بعد خود بھی ابدی نیند سو گئی تھیں۔



زمین نے رنج کے گرد اپنا ایک اور چکر مکمل کر لیا تھا۔ دن رات کی گردش میں وہ دن ایک مرتبہ پھر پلٹ کر ان لوگوں کی زندگیوں میں آ گیا تھا۔ وہ دن جب ایک ہنستی مسکراتی زندگی اس گھر سے رخصت ہو گئی تھی۔ یہ دن ان سب کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ لیکن پھر بھی انہیں اس دن خوشی منانی تھی۔ دل پر جس کے جو بھی گزر رہی تھی وہ لوگ اس کا ایک دوسرے سے اظہار نہیں کر رہے تھے۔ آپس میں ایک

ساتھ تھی۔ ماسٹرز کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں، جب نمن اور ار تفضی واپس کراچی آئے۔ ان دنوں اس کے امتحان چل رہے تھے۔ معاذ کی سالگرہ سے چند دن پہلے وہ پریکٹیکل سے فارغ ہوئی تھی۔ وہ اب ماسٹرز کرنے کے لیے دوبارہ یونیورسٹی جوائن کرنا نہیں چاہتی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اسے یہ بات یاد بھی نہیں رہی تھی کہ یونیورسٹی میں اس کی MS.c کی کلاسز شروع ہونے والی ہیں۔ ڈیڈی نے اسے یہ بات یاد دلانی اس نے ان سے ”ڈیڈی میرا MS.c کرنے کا موڈ نہیں۔“ کہہ کر انکار کر دیا تو وہ خاموش ہو گئے۔ انہوں نے اس سے مزید اصرار نہیں کیا تھا۔ مگر بابا نے

اسے یونیورسٹی جانے پر مجبور کیا تھا۔

”بابا! میرا دل نہیں چاہتا۔ بڑھنے میں اب میرا دل نہیں لگے گا۔“ اس نے سر جھکا کر بے بسی سے کہا تو وہ مشفقانہ انداز میں اسے سمجھانے لگے۔

”مجھے پتا ہے بیٹا! کہ تمہارا دل نہیں چاہ رہا، مگر بعض کام دل کی مرضی کے خلاف کرنے پڑ جاتے ہیں نا، کسی بہت اپنے کے لیے۔ اس کی خوشی کے لیے۔ تم اس طرح دنیا سے کنارہ کر کے الگ تھلگ بیٹھی رہیں تو یسویہ اور شفیق کیسے خود کو نارمل کر پائیں گے۔

ہمیں اس گھر میں زندگی واپس لانی ہے۔ زندگی کو پہلے جیسا بنانا ہے، خوشیوں اور امنگوں سے بھرا ہوا۔“

”بابا! اب زندگی کبھی پہلے جیسی نہیں ہو سکے گی۔“

اس نے ان کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی پشت پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے رہے۔ اس نے بابا کی بات مان لی تھی، ان کا مان رکھ لیا تھا۔

وہ ہر روز خود کو زبردستی گھسیٹ کر یونیورسٹی لاتی تھی۔ کلاس کے دوران وہ لیکچر کے بمشکل چند پوائنٹس ہی نوٹ کر پاتی۔ ماما اور ڈیڈی اسے یونیورسٹی جاتا دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔ مگر نہ اس کی مستقل قسم کی خاموشی ان کے لیے تشویش کا باعث بنتی جا رہی تھی۔ وہ یونیورسٹی سے آتی تو معاذ لپک کر اس کے پاس آ جاتا۔ اسے گود میں اٹھانے سے کتراتا



دوسرے سے جھوٹ بولتے وہ سب خود کو خوش ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بابا ویسا ہی ایک آرڈر کر کے آئے تھے جیسا پہلی سالگرہ پر شمن نے کیا تھا۔ ممانے کھانے کا بہترین انتظام کیا تھا۔ ڈیڈی نے نوکروں کو ساتھ لگا کر ڈاننگ روم کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ غباروں اور چھالروں سے سجایا تھا۔ ان سب نے معاذ کے لیے تحفوں کا بھر لگایا تھا۔ ظفر نے بھی عین سالگرہ کے دن تحفہ بھیجا تھا۔ ایک کے کاٹے وقت بابا نے ار تفضی سے کہا کہ وہ معاذ کا ہاتھ پکڑ کر ایک کٹوائے۔

”مما! آپ اور ڈیڈی کٹوائیجئے۔“ اس نے ممانے سے نظریں چراتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

ایک کاچھوٹا سا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے ممانے کو روک نہیں پائی تھیں۔ بہت مزے سے ایک کھاتا ہوا معاذ ان کو روٹا دیکھ کر بڑا حیران نظر آ رہا تھا۔ بابا، ڈیڈی اور ار تفضی سب انہیں چپ کرانے میں مصروف تھے۔ معاذ کی توجہ اب غباروں کی طرف تھی۔ صبانے اسے کارپٹ پر بٹھا کر بہت سارے غبارے اس کے گرد جمع کر دیے۔ وہ اتنے سارے رنگین غباروں کو دیکھ کر بہت خوش تھا۔ وہ بظاہر اس کے ساتھ بیٹھی تھی، مگر اس کی توجہ سامنے صوفے پر بیٹھے بابا، ممانے، ڈیڈی اور ار تفضی کی طرف تھی۔

”صبا!۔“ کسی نے اسے بہت زور سے آواز دی۔ وہ بری طرح جوگی۔

”کیا ہوا صبا! میں اتنی دیر سے تمہیں آواز دے رہا ہوں۔“ ار تفضی فلور کشن پر ممانے کے سامنے بیٹھا تھا۔ بابا اور ڈیڈی ان کے پاس صوفے پر بیٹھے تھے وہیں بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر ار تفضی نے اسے آواز دی تھی۔ صبا کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔ اس کے آواز دینے پر اس نے اسے دیکھ تو لیا تھا، مگر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی بات سن تو رہی ہے، مگر سمجھ نہیں رہی۔

”صبا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔؟“ وہ ممانے کو

چھوڑ کر فوراً اس کے پاس آیا تھا۔ بابا اور ڈیڈی ہنوز ممانے کی دل جوگی میں لگے تھے۔ وہ بڑے تشویش بھرے انداز میں اس کو دیکھ رہا تھا۔

”میں تمہاری طبیعت کے بارے میں پوچھ رہا ہوں صبا!“ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے اپنا سوال دہرایا۔

”میں ٹھیک ہوں ار تفضی بھائی!“ اس نے معاذ پر نظریں مرکوز رکھتے ہوئے آہستگی سے جواب دیا۔

”جب رونا آئے تو رو لینا چاہیے۔ نہ رونا بہادری نہیں۔ غم اپنے اندر جمع کرتے رہنے سے دل پر بہت بوجھ پڑ جاتا ہے۔ تم ممانے اور ڈیڈی کی وجہ سے نہیں روئیں ان کے سامنے نہیں روئیں مگر میرے سامنے تم رو سکتی ہو۔ اگر شمن یاد آ رہی ہے تو رولو صبا! مجھے پتا ہے تم دونوں ایک دوسرے کی بہن سے زیادہ دوست تھیں۔“

”بہت محبت کرتی تھی وہ تم سے۔ تم اس محبت کو مس کرتی ہو صبا!“ شمن کے بارے میں اس طرح سے اس ایک سال میں ار تفضی نے گھر کے کسی فرد سے بات نہیں کی تھی۔ مگر اس وقت صبا کے چہرے پر موجود تاثرات نے اسے شمن کے بارے میں اتنا زیادہ بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیسی لگی تھی وہ اس پل ار تفضی کو۔ جیسے اس کی زندگی سے ہر امید، ہر آس اور ہر خوشی کو باہر نکال دیا گیا ہو۔ یوں جیسے اس کے پاس زندگی میں کچھ بچا ہی نہ ہو۔ وہ اسے کیسے بتانی کہ وہ کیوں نہیں روتی۔ وہ کیسے کہتی کہ اس سے رویا نہیں جاتا۔ وہ رونا چاہتی ہے، مگر اس کا ضمیر اسے رونے نہیں دیتا۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

”مجھ سے اس کے بارے میں بات نہیں کی جاتی۔“ اسے کچھ تو کہنا تھا۔

”اس حادثے کو قبول کر لو صبا! ہم سب کو اس کے بغیر رہنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ مان لینی ہوگی یہ بات کہ وہ اب کبھی یہاں آئے گی بھی نہیں۔“ وہ ہمیشہ ہی کی



طرح کے پیار بھرے انداز میں اسے سمجھانے لگا۔



روز کی طرح رات کو ماما اور معاذ اس کے کمرے میں تھے۔ وہ روزانہ کی بہ نسبت آج جلدی سو گیا تھا۔ ماما نے سوتے ہوئے معاذ پر ایک شفقت بھری نگاہ ڈالی، پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”تمہیں نیند تو نہیں آرہی صبا؟“ اس نے ماما کی طرف نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں دیکھا۔ ان کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہتی ہیں۔ اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ معاذ ان دونوں کے بیچ میں لیٹا ہوا تھا۔

”صبا! ماں اور بیٹی کا رشتہ دوستی کا رشتہ بھی ہوتا ہے۔ ماں بیٹی سے ہر بات دوستوں کی طرح کرتی ہے اور بیٹی بھی دوستوں کی طرح ماں سے اپنی ہر کیفیت شیئر کرتی ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت متانت اور بردباری سے بولیں۔ اسی لیے بے ساختگی میں اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”کیا بات ہے ماما؟“

”صبا! میں چاہتی ہوں آج ہم دوستوں کی طرح باتیں کریں۔ میں تم سے تمہاری زندگی کے سب سے اہم فیصلے کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے دھیمے لہجے میں بولیں۔

”ہم لوگ تمہاری شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ بہت سے رشتے ہیں ہمارے سامنے مگر تمہاری زندگی کے فیصلے کا اختیار تمہارے ہی پاس ہونا چاہیے۔ اگر تم کسی کو اس حوالے سے پسند کرتی ہو۔ تو

تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔“ وہ جواب میں چند لمحوں تک کچھ بول نہیں سکی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے ماما! میری زندگی میں ایسا کوئی بھی نہیں۔“ وہ جھوٹ بول بھی نہیں رہی تھی۔ جو کچھ اس کی زندگی میں تھا تو وہ اس کا ماضی تھا۔ اب نہ اس کی زندگی میں نہ اس کے دل میں نہ اس کی

سوچوں میں کہیں پر بھی کوئی نہیں تھا۔

”پھر کیا ہم لوگ اپنی مرضی سے تمہارے لیے کسی کو چن سکتے ہیں؟ کیا تم ہمیں یہ حق دے رہی ہو؟“ ان کی آنکھوں میں بڑی امید بھری چمک ابھری تھی۔ ایسے جیسے اس کے جواب نے انہیں بڑی خوشی دے دی ہو۔ اس نے سر اثبات میں ہلادیا تھا۔

”اگر ہم تمہاری شادی ار ترضی کے ساتھ کر دیں تو۔۔۔؟“ اسے جیسے ایک دم کرنٹ لگا۔ وہ پوری کی پوری ہل گئی۔

”تم مجھے خود غرض مت سمجھو صبا! یہ بات میں اس لیے نہیں کہہ رہی کہ تم ہمیشہ معاذ کی ماں کا رول ادا کرتی رہو۔ اس کی پرورش کرو، اس میں کوئی شک نہیں کہ تم سے بہتر معاذ کا خیال کوئی نہیں رکھ سکتا۔ کل کو اگر ار ترضی نے دو سری شادی کر لی تو وہ دو سری لڑکی چاہے کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، تمہاری طرح اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکے گی۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔ لیکن میرے تم سے ار ترضی سے شادی کے بارے میں کہنے کی وجہ یہ ہرگز نہیں۔ سچ تو یہ ہے صبا! کہ ار ترضی سے بہتر تمہارے لیے کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ تمہیں سمجھتا ہے، تمہارے مزاج کو سمجھتا ہے۔ اس نے میری ایک بیٹی کو اتنا سکھی رکھا ہے کہ میں اپنی دو سری بیٹی بہت خوشی سے اسے دے سکتی ہوں۔ یہ صرف میری خواہش نہیں ہے۔ تمہارے ڈیڈی اور غصنفر بھائی کی بھی یہی خواہش ہے۔ تم ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رہو گی۔ معاذ کو ماں کا پیار مل جائے گا ہمیشہ کے لیے۔ ار ترضی کا گھر پھر سے آباد ہو جائے گا۔“

وہ بہت سنجیدگی سے اسے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں ماما!“ کتنی دیر بعد وہ خود کو بوتلنے پر آمادہ کر پائی، اس سے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔

”صبا! ار ترضی بہت اچھا ہے۔ وہ میری نظروں کے



ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔ میرا یقین کرو تمہیں! اس نے چلاتے ہوئے اس سے یہ بات کہنی چاہی مگر وہ اس کی بات نے بغیر وہاں سے غائب ہو گئی تھی اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ ماما دوسری طرف کروٹ لیے شاید سوچکی تھیں۔ معاذ بھی گہری نیند سو رہا تھا۔



”کیا ہو گیا ہے بابا آپ کو! صبا کے بارے میں ایسی کوئی بات میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی۔“ ار تفسی نے بابا کے منہ سے یہ بات سنتے ہی بغیر ایک لمحہ کی دیر لگائے فوراً انکار کر دیا۔

”سوچی نہیں تھی تو اب سوچی جاسکتی ہے۔ تم اسے بچی سمجھتے ہو۔ مگر اب وہ بچی ہے نہیں۔“ بابا اس کے دو ٹوک انکار پر کچھ جھنجھلا کر بولے تھے۔

”کب تک شہنا زندگی گزارو گے۔ کبھی نہ کبھی تو تمہیں اپنے لیے کوئی فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ تو وہ لڑکی صبا کیوں نہیں ہو سکتی۔ ہمارے گھر کی روایتیں واپس آجائیں گی۔ معاذ کو ماں کا پیار مل جائے گا۔“ اس نے ان کی ساری بات بہت خاموشی سے سنی۔ جیسے ہی وہ چپ ہوئے وہ بولنا شروع ہو گیا۔

”سب سے پہلے تو بابا! آپ اپنا یہ خوف دور کر لیں کہ میں معاذ کے لیے کوئی سوئیلی ماں لے کر آنے والا ہوں بالکل بے فکر رہیں آپ۔ دوسری بات صبا کے بارے میں۔“ وہ ایک پل کو خاموش ہوا پھر اسی مستحکم اور فیصلہ کن انداز میں دوبارہ بولنے لگا۔

”اگر آپ کے کہنے پر اس بات کو ذہن سے نکال بھی دوں کہ میں نے صبا کے لیے اس انداز سے کبھی نہیں سوچا اور یہ کہ وہ اب اتنی چھوٹی نہیں ہے جتنا میں اسے سمجھتا ہوں۔ تب بھی بابا! میں یہ فیصلہ کبھی نہیں کروں گا۔ میں اتنا خود غرض کبھی نہیں ہو سکتا کہ اس سے محض اس لیے شادی کر لوں کہ میرے بیٹے کو ماں کا سا پیار مل جائے۔ اس کا حق ہے زندگی کی خوشیوں پر۔ کوئی ایسا شخص جو اسے سچا پیار دے۔“

سامنے تل کر بڑا ہوا ہے۔ میں نے اس میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔ تمہاری تو خود اس کے ساتھ کتنی زیادہ انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ میرا دل کہتا ہے تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گی۔“ ان کا لہجہ التجائیہ ہو گیا تھا۔

”ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا ماما! میں نے ار تفسی بھائی کے بارے میں کبھی اس طرح نہیں سوچا۔ دوستی اور انڈر اسٹینڈنگ کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان کے ساتھ شادی کر لوں میں نے انہیں کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔ میں نے ہمیشہ انہیں شمن کے حوالے سے دیکھا ہے۔ اور میں کسی اور حوالے سے انہیں رکھنا چاہتی بھی نہیں ہوں۔“ اس کا لہجہ بہت بے لچک اور سخت تھا۔ وہ اس موضوع پر مزید ایک لفظ بھی نہیں سنا چاہتی تھی۔

”باقی جن پر پوزلز کا آپ ابھی ذکر کر رہی تھیں۔ ان میں سے آپ لوگ جسے چاہیں میرے لیے منتخب کر لیں۔ میں آپ لوگوں کے کسی فیصلے پر اعتراض نہیں کروں گی۔ لیکن پلیز ماما! یہ بات مجھ سے دوبارہ مت کیجئے گا۔ مجھے ایسی بات سوچتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔“ ماما اس کا دو ٹوک انداز دیکھ کر خاموش ہو گئی تھیں۔

وہ آنکھیں بند کر کے سونے لیٹ گئی۔ آنکھیں بند کرتے ہی وہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

”کیوں منع کر دیا تم نے ماما کو؟ انہوں نے وہی بات تو کی تھی جو تمہاری بھی خواہش تھی اور جس کے پورا ہونے کے لیے ہی تم نے میرے مرنے کی دعا مانگی تھی۔ مت انکار کرو ماما کو یہ تو تمہاری بچپن کی خواہش ہے۔ محبت نہ مرتی ہے نہ ختم ہوتی ہے وہ اب بھی ضرور تمہارے دل میں کسی نہ کسی جگہ موجود ہوگی۔ آگے بڑھو اور پالو اپنی محبت تمہیں تمہاری محبت مل جائے اسی لیے تو میں یہاں سے چلی گئی تھی۔“ وہ طنزیہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اسے نشتر چھو رہی تھی۔ جو کام اس نے زندگی میں کبھی اس کے ساتھ نہیں کیا تھا اب بڑی سفاکی سے کر رہی تھی۔ وہ سسک اٹھی۔

”نہیں شمن! تم بالکل غلط سوچتی ہو۔ میں نے



تک صبا کی بات تھی، اس کے لیے تین چار پوز آئے ہوئے تھے۔ جب اس نے فیصلہ ممان اور ڈیڈی پر چھوڑ دیا تو انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ ان پر غور کرنا شروع کر دیا۔ ممان خاندان میں شادی کرنے کے حق میں تھیں۔

”خاندان کے لوگوں کے بارے میں سب بتا ہوتا ہے، کسی چھان بین کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک دوسرے کی اچھائی، برائی سب پہلے سے معلوم ہوتی ہے۔“ ممان کی اس بات سے بابا نے بھی اتفاق کیا تھا۔ خاندان میں سے آئے دورشتوں میں سے انہیں سفیر فیروز کا رشتہ زیادہ پسند تھا۔

سفیر کراچی سے B.E کرنے کے بعد کینیڈا MS کرنے کے لیے چلا گیا تھا۔ اسے وہیں پر بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔ اس نے تجربہ کے طور پر وہاں جاب کر لی تھی۔ مستقبل میں اس کا پاکستان واپس آنے اور اپنی ذاتی انجینئرنگ فرم اسٹیبلس کرنے کا ارادہ تھا۔ ممان اور ڈیڈی کے پاس اس رشتے کو دوسرے رشتوں پر ترجیح دینے کی کئی وجوہات تھیں۔ سب سے بڑی اور اہم وجہ فیروز خالد کے گھر کا ماحول تھا۔ وہ اور ان کی بیوی دونوں بہت پڑھے لکھے اور وضع دار قسم کے لوگ تھے۔

ممان صبا کو شادی کر کے اتنی دور کینیڈا بھیجنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں مگر یہ سن کر کہ سفیر ایک آدھ سال میں کراچی واپس آنے کا ارادہ رکھتا ہے، اس رشتے کی طرف سے ہر طرح مطمئن ہو گئی تھیں۔



اس کی اور ظفر کی شادی کی تاریخیں آگے پیچھے رکھی گئی تھیں۔ ظفر کی شادی اس کی شادی سے ایک ہفتہ پہلے تھی۔ ایسا ظفر کی خواہش پر کیا گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ صبا اس کی شادی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کر سکے، ورنہ پہلے ان لوگوں کا دونوں کی ساتھ شادی کرنے کا پروگرام تھا۔ ظفر شادی سے ایک مہینہ پہلے کراچی آ گیا تھا۔ اپنی شادی سے زیادہ وہ صبا کی شادی کی

آپ کو بتا ہے ناں صبا مجھے کتنی عزیز ہے۔ میں کسی دوسرے کو اس پر زیادتی کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ خود کیسے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کر سکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے زندگی میں سچی محبت ملے۔ اسے زندگی میں سب کچھ ملے۔“ بابا بے بسی اور مایوسی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ اسے قائل نہیں کر پائیں گے، انہیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا۔

”پہلی آپ ہمارے گھر کی خوشیوں کی بات کر رہے تھے بابا! ہمارے گھر کی خوشیاں صبا اور ظفر کی شادیاں کر کے بھی تو لوٹ سکتی ہیں۔ ظفر امریکہ میں بہت اچھی طرح سیٹ ہے، اس کی یونیورسٹی میں جاب بہت اچھی چل رہی ہے۔ اس سے اس بارے میں بات کر کے اس کی شادی کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔ صبا کا ایم ایس سی مکمل ہو گیا ہے۔ اس میں کس بات کی کمی ہے جو اس کے لیے کوئی اچھا رشتہ نہ مل سکے۔ ان دونوں کی شادی کر کے ہمارے گھر کی رونقیں لوٹ آئیں گی۔“ وہ ان کی مایوسی محسوس کر کے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ کر انہیں اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔



ان دونوں کے اتنی سختی سے اس بات کو رد کر دینے کے بعد دوبارہ اس ذکر کی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔ ہاں صبا اور ظفر کی شادی کے سلسلے میں اب سب نے بڑی سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ ظفر کو University of Dallas میں جاب آفر ہوئی تو اس نے ممان اور ڈیڈی کی اجازت سے اس آفر کو قبول کر لیا۔

ممان نے اس سے فون پر اس بارے میں بات کی تو اس نے اپنی شادی کا فیصلہ کلی طور پر ممان پر چھوڑ دیا۔ ممان کی کالج کی دوست تھیں رضوانہ آنٹی، ان کی بیٹی عاصمہ، ممان کو بہت پسند تھی۔ ممان کی پسند کو گھر کے باقی افراد نے بھی پسند کیا تھا۔ یوں ایک خوبصورت سی شام عاصمہ کو انکو بھی یہنا کر یہ رشتہ پکا کر دیا گیا تھا۔ جہاں



تیار یوں میں مصروف تھا۔ ار تفضی تو پہلے ہی اس کی شادی کی تیاریوں میں بہت پر جوش طریقے سے حصہ لے رہا تھا۔ شادی کی تقریباً تمام شاپنگ ممانے ار تفضی کے ساتھ کی تھی۔ سفیر بھی شادی سے آٹھ دن پہلے کراچی آگیا تھا۔ ظفر کے ویسے کے اگلے دن اسے مایوں بٹھایا گیا تھا۔

اس رات ار تفضی اس کے کمرے میں آیا۔ ظفر اور عاصم پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔

”یہ تمہاری شادی کا تحفہ۔“ وہ ڈبا دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ اس میں جیولری ہے۔ ”ایک بار ہم یونہی باتیں کر رہے تھے تو ثمن نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں شادی پر تحفے میں ڈائمنڈ کاسیٹ دینا چاہتی ہے اور ساتھ ہی تمہیں اور تمہارے شوہر کو ہنی مون کے لیے ہوائی جہاز کا ریٹرن ٹکٹ بھی۔ اب دوسرے والے تحفے کی تو کوئی ضرورت ہے نہیں۔ میرا خیال ہے تمہارا ہنی مون نیا گرافال کی خوبصورتیوں کو سراہتے ہوئے گزرنا ہے۔“ وہ بڑے ہلکے پھلکے انداز میں اسے ثمن کی اس کے بارے میں کہی گئی ایک بات بتا رہا تھا۔

”جلدی سے کھول کر دیکھو صبا! پتا تو چلے ار تفضی بھائی کی چوائس کیسی ہے۔“ عاصم سیٹ دیکھنے کے لیے بڑی متجسس نظر آ رہی تھی۔ وہ بظاہر عاصم کے ساتھ سیٹ دیکھنے لگی تھی لیکن اندر ہی اندر ار تفضی کی باتوں نے اسے بہت ڈسٹرب کیا تھا۔ اس وقت جب کہ وہ کوئی تکلیف دہ بات سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اسے یہ بتا رہا تھا کہ ثمن اس کے لیے کیا کیا سوچا کرتی تھی۔ وہ اس کے لیے کیا کیا خواب دیکھا کرتی تھی۔ اس کے لیے صبا شفیق کے لیے جو اس سے۔۔۔ اس سے آگے سوچنے کی اس کی ہمت نہیں تھی۔

”یہ تمہاری چچی شادی کے بعد بھی اپنے سارے مسئلے لے کر تمہارے پاس آیا کرے گی۔ سفیر تو دیکھنا چند مہینوں میں ہی تم سے چڑنے لگے گا۔“ ظفر بہت عرصے بعد اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کے موڈ میں

تھا۔

”صبا اب میرے ساتھ اپنی کوئی بات شیئر نہیں کرتی۔ بہت بڑی ہو گئی ہے صبا۔ اس نے مجھ سے اپنی فیلنگز چھپانی سیکھ لی ہیں۔“ ار تفضی نے ظفر سے شکوہ کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

”یہ اطلاع میرے لیے تو بڑی خوش آئند ہے یعنی میں یہ توقع رکھ سکتا ہوں کہ اب اگر کبھی میں اور تم کسی مقابلے میں آمنے سامنے آئے تو یہ میرے جعفر اپنے سکے بھائی کو فیور کرے گی۔“ ظفر آج واقعی بالکل پرانے موڈ میں تھا۔ شاید وہ اسے ہنسنا چاہتا تھا۔ جو وقت گزر چکا تھا اسے کچھ دیر کے لیے واپس لانا چاہتا تھا۔

کافی دیر تک وہ تینوں اس کے کمرے میں بیٹھے رہے۔

وہ اس کی چھیڑ چھاڑ کے جواب میں بجائے لڑنے کے مسکرا رہی تھی۔ وہ بھائی کی خواہش پوری کرنا چاہتی تھی مگر اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا اور بحث کرنے والی صبا کو وہ کہاں سے ڈھونڈ کر لاتی۔ وہ صبا تو عرصہ ہوا کہیں کھو گئی تھی۔



نکاح کے وقت اس کے پاس بہت سے لوگ تھے۔ اس کے بالکل قریب ماما بیٹھی تھیں۔ وہاں ظفر بھی تھا، بابا بھی تھے۔ ان سب کے باوجود اس نے اپنے چاروں طرف ایک وجود کو تلاشتا تھا۔

”ثمن! تم کہاں ہو۔ آؤ دیکھو تمہاری صبا آج دلہن بنی ہے۔ آج اس کی شادی ہے۔ اب تو یقین کر لو کہ صبا تم سے کچھ بھی چھیننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تم سے حسد نہیں کرتی تھی وہ تمہاری خوشیوں سے نہیں جلتی تھی دیکھ لو اس نے تمہاری کسی چیز پر اپنا حق نہیں

جتایا۔ وہ اس گھر سے رخصت ہو رہی ہے سب کچھ چھوڑ کر تمہاری کسی بھی چیز پر نگاہ ڈالے بغیر۔ یقین آگیا ناں تمہیں کہ صبا نے کبھی تمہاری جگہ نہیں لینی



چاہی تھی۔ تمہاری جگہ کل بھی تمہاری تھی اور آج بھی تمہاری ہے۔" اس کے روئیں روئیں نے ثمن کو بے آواز پکارا تھا۔

اسے رخصت کرتے وقت ممالے گلے لگا کر کتنی دیر تک روتی رہی تھیں۔ ڈیڈی کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ "صبا! تم بہت یاد آؤ گی۔" ار تفضی کے لہجے میں بھی اداسیاں گھلی ہوئی تھیں۔ اپنے سرال میں پہلا قدم رکھتے ہوئے اس نے خود سے ایک عہد لیا۔ یہ کہ وہ اپنے شوہر کی ہمیشہ وفادار رہے گی۔ یہ کہ وہ ایک بہت اچھی بیوی بنے گی۔ سرال میں اس کا بڑے شاندار طریقے سے استقبال کیا گیا تھا۔ وہ واقعی اپنے ساس سر کی لاڈلی بہو لگ رہی تھی۔ علینا اور طلحہ بھی خاصے خوش نظر آ رہے تھے۔

اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے ذہن میں اس وقت سوائے اپنے شوہر کے کسی کا خیال نہیں تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا لیکن وہ محسوس کر سکتی تھی کہ وہ ایک ایک قدم اٹھاتا اسی کی طرف آ رہا ہے۔ وہ بیڈ کے پاس آ کر رک گیا۔ وہ اس سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا اور بہت گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر اس کی نگاہوں کی پیش محسوس کر رہی تھی۔ چند سیکنڈ وہ اسی طرح کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر اس نے بغیر کچھ کہے ایک نیلے رنگ کا مخملی جیولری کیس اس کے پاس بیڈ پر رکھ دیا۔ وہ ابھی اس کی اس حرکت پر ہی حیران ہو رہی تھی کہ وہ اس کے پاس سے ہٹ گیا۔

اس نے بے ساختہ اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر پہلی مرتبہ اس کی طرف دیکھا۔ اس کی صبا کی طرف پشت تھی۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھایا اور پھر اس کی طرف دیکھے بنا سلائیڈنگ ڈور کھول کر باہر بالکونی میں چلا گیا۔ بالکونی میں جانے کے بعد اس نے سلائیڈنگ ڈور واپس بند نہیں کیا تھا۔ بالکونی میں مکمل اندھیرا تھا مگر کمرہ تو پوری طرح روشن تھا۔ وہ اسے بہت آرام سے دیکھ سکتی تھی اور وہ اسے دیکھ بھی

رہی تھی۔ وہ ریٹنگ پر بازو ٹکائے اسموکنگ کر رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی سفیر کے روئے کو۔ اسے یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ کھڑے کھڑے تھک گیا تو کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رات کا باقی حصہ اس نے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہوئے گزارا۔ وہ ویسے ہی بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی جبکہ وہ اس کی طرف بالکل بھی متوجہ نہیں تھا۔ صبح کے قریب اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور وہ کرسی سے ٹیک لگائے لگائے ہی سو گیا تھا۔ اذان ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ جب اچانک اس کی آنکھ کھلی وہ آہستگی سے بیڈ پر سے اٹھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر وہ آہستہ آہستہ اپنی ساری جیولری اتار رہی تھی۔ کسی لڑکی کے ساتھ شادی کی پہلی رات اس کا شوہر ایسا سلوک کرے اور وہ روئے بھی نہ کتنی ناممکن بات ہے یہ۔ اس نے اپنی آنکھوں کو آئینے میں بغور دیکھا۔ ان میں ہلکی سی بھی نمی نہیں تھی۔ یوں جیسے اسے اس بات کا احساس ہی نہیں کہ اس کی انسلٹ کی گئی ہے اس کے وقار کو بھیس پہنچائی گئی ہے۔ جیولری اتارنے کے بعد وہ ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ اس نے کپڑے بدلے پھر وضو کیا۔ جائے نماز اسے ڈریسنگ روم میں رکھی مل گئی تھی۔ وہ سر پر نماز کے لیے دوپٹہ اوڑھتی ڈریسنگ روم سے باہر نکلی تو نظریں سیدھی سفیر پر پڑیں۔ وہ کمرے میں واپس آچکا تھا۔ وہ اس کے بالکل سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے بھی کچھ چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"مجھے نماز پڑھنی ہے، قبلہ کس طرف ہے؟"

اس نے سفیر کی طرف دیکھتے ہوئے بہت عام سے اور جذبات سے عاری انداز میں پوچھا۔ وہ بہت بری طرح چونک گیا۔

اس کے پاس آکر اس نے جائے نماز اس کے ہاتھ سے لی اور خود ہی بچھا دی۔ وہ جائے نماز بچھا کر مٹا تو وہ فوراً "نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ وہ واپس صوفے پر بیٹھ گیا۔



نماز پڑھ کر جائے نماز تہہ کرتے ہوئے وہ واپس مڑی تو سفیر کو اپنی ہی طرف دیکھتا ہوا پایا۔ وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔ سفیر نے اسے اشارے سے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

”میں جو باتیں تم سے کرنے والا ہوں وہ تمہارے لیے یقیناً بہت تکلیف دہ ہوں گی مگر جھوٹ اور منافقت سے میں سخت نفرت کرتا ہوں۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

”کل رات تم مجھے بہت بری لگ رہی تھیں لیکن اس وقت تمہیں دیکھ کر مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اس سارے قصے میں میرے علاوہ اگر کسی پر ظلم ہوا ہے تو وہ تم ہو۔ تمہارا اور تمہاری فیملی کا کوئی قصور نہیں۔ تم لوگوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس قصے کے اصل مجرم میرے والدین ہیں۔“ وہ بہت صاف گوئی سے بولا۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”پاپا کہتے ہیں انہوں نے آج سے کئی سال پہلے تمہیں اپنی بہو کے طور پر پسند کر لیا تھا۔ ہم لوگ تمہارے گھر کسی فنکشن میں گئے تھے تب ممی نے مجھے تمہیں دکھاتے ہوئے بتایا تھا۔ اس وقت میری زندگی میں ایسا کوئی نہیں تھا جس کی وجہ سے میں تمہارے لیے انکار کر دیتا۔ مجھے بھی تم اچھی لگی تھیں۔ میری رضامندی لینے کے بعد ممی نے تمہارے گھر والوں سے رشتے کی بات کی مگر تمہارے گھر والوں نے انکار کر دیا۔ میرے حساب سے وہ بات وہیں ختم ہو گئی تھی مگر میں جانتا نہیں تھا کہ یہ بات ختم نہیں ہوئی ہے۔“ اس کے لہجے میں غصہ چھلکنے لگا تھا۔

”پھر میں ماسٹرز کرنے کینیڈا چلا گیا۔ وہاں مجھے مارگریٹ ملی۔ وہ بھی میری طرح سول انجینئر تھی۔ یونیورسٹی میں میرے ساتھ ایم ایس کر رہی تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ خوبصورتی سے میں بے شک بہت سی لڑکیوں کی متاثر ہوا ہوں گا مگر

محبت مجھے صرف مارگریٹ سے ہوئی۔ وہ ایک انگریز فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے والد اپنے بزنس کی وجہ سے برسوں پہلے انگلینڈ چھوڑ کر کینیڈا میٹل ہو گئے تھے۔ بہت کمزور و بوسم کی انگلش فیملی سے تعلق ہے اس کا۔ ان کے ہاں بہت سی ایسی باتیں بری سمجھی جاتی ہیں جنہیں مغربی کلچر میں برائی سمجھا نہیں جاتا۔ میں نے اسے پرپوز کیا۔ اور جب اس نے میرے پرپوزل کا ہاں یا نہ میں جواب دینے کا فیصلہ اپنے والدین پر چھوڑا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ مجھے اپنے پیرئرس سے ملوانے لے گئی۔ وہ لوگ مجھ سے ملے اور میں انہیں پسند آ گیا۔

وہ لوگ چاہتے تھے کہ مجھ سے شادی کے لیے ان کی بیٹی اپنا مذہب نہ بدلے مگر میں نے مارگریٹ سے صاف کہہ دیا کہ اگر وہ واقعی مجھ سے محبت کرتی ہے اور شادی کرنا چاہتی ہے تو اسے مسلمان ہونا ہو گا۔ وہ مجھ سے اتنی زیادہ محبت کرنے لگی تھی کہ یہ بات مان گئی۔ اس نے اپنے والدین کو بھی منالیا۔ میں جانتا تھا میرے اس فیصلے سے میرے والدین کو اختلاف ہو گا۔ وہ ایک انگریز لڑکی کو چاہے وہ کتنی ہی اچھی فیملی سے تعلق کیوں نہ رکھتی ہو، بہو بنانے کے لیے خوشی خوشی تیار نہیں ہو سکتے۔ ممی پاپا کے ساتھ ہم بہن بھائیوں کے ہمیشہ دوستانہ تعلقات رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں ہماری زندگی کا ہر فیصلہ خود کرنے کی آزادی دی تھی۔ ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میرا خیال تھا کہ تھوڑی بہت بحث و تکرار کے بعد میں انہیں منالوں گا۔ میں نے پاپا کو فون پر مارگریٹ کے بارے میں بتایا تو وہ غصے سے پاگل ہو گئے۔

میں نے انہیں قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانے اور میں انہیں ناراض کر کے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے ممی پاپا کو بھی اپنے پاکستان آنے کا بتا دیا اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ والدین بھی کبھی اولاد کے خلاف اس طرح کی سازش کر سکتے ہیں، میں

سوچ بھی تمہارے تاریخ بھی تھا، اسی مارگریٹ میرے قبول کیا سمیٹ شادی ہم نے ایئر پور ہی میں جیسے کوئی مجھے

پلان سو جگہ سٹ ہمارے ہونے میں اب مجھے میری حیرت سب مجھ سے اپنے سے اس

کی بیٹی منع کر بولے

ان کی کریر



سے صبا سے زیادہ کوئی لڑکی اچھی نہیں لگی۔ ہاں اگر تم کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کی بات کرتے تو ہم اس بارے میں سوچ سکتے تھے۔“

میں مجھے کسی انتہائی فیصلے سے باز رکھنے کے لیے جذباتی بلیک میلنگ میں مصروف تھیں۔

”تمہارے ہاتھ میں ہے ہماری عزت۔ میں مانتی ہوں تمہارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ میں نے کوشش کی تھی تمہارے پیار کو سمجھانے کی مگر تم جانتے ہو انہیں وہ کس قدر ضدی ہیں۔ میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ نہیں مانے۔“ انہوں نے آنسو بہاتے ہوئے مجھ سے التجا کی۔ میں انہیں دنیا کے سامنے ذلیل کرنے کا حوصلہ نہیں کر پایا۔

میں نے چپ چاپ شادی کر لی۔ مجھے یہ بات سوچتے ہوئے شرم آتی ہے کہ اب میں سمیعہ کا سامنا کیسے کروں گا۔

کل رات تمہیں گھر لانے کے بعد ایک مرتبہ پھر میں میرے پاس آ گئیں۔ وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑے رو رہی تھیں۔

”سفیر! میں تمہیں اپنی محبت کا واسطہ دے کر کہہ رہی ہوں، ہمیں اس کے والدین کے سامنے شرمندہ مت کروانا۔ پلیز اسے کچھ بھی مت بتانا۔“ انہیں پتا تھا میں بہت غصے میں ہوں۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر اور آنسو بہا کر میرے غصے پر بند باندھنے کی کوشش کی تھی۔

عورت کا حسن مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے،

سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے بتائے بغیر تمہارے گھر رشتے کی بات کی اور جھٹ پٹ شادی کی تاریخ بھی طے کر لی۔ میں انہیں ہر قیمت پر منالینا چاہتا تھا، اسی لیے میں نے اپنے پاکستان آنے سے پہلے مارگریٹ سے باقاعدہ اسلام قبول کرنے کے لیے کہا۔ میرے ساتھ اسلامک سینٹر جا کر اس نے باقاعدہ اسلام قبول کیا۔ وہ اب مسلمان ہو چکی ہے۔ اس کا نیا نام سمیعہ ہے۔ اسے پتا تھا میں اپنے والدین کو ہماری شادی کے لیے منانے جا رہا ہوں۔ وہ بہت خوش تھی۔ ہم نے مستقبل کے کتنے حسین خواب دیکھے تھے۔ ایئر پورٹ پر وہ مجھے سی آف کرنے آئی تھی۔ گھر پہنچتے ہی میں حیران رہ گیا۔ یہاں ایسی تیاریاں ہو رہی تھیں جیسے کوئی شادی ہونے والی ہے۔

مجھے تھوڑی ہی دیر میں حقیقت پتا چلی گئی، ان کا پلان سو فیصد کامیاب رہا تھا۔ شادی کے کارڈز سب جگہ بٹ چکے تھے۔ دوسرے شہروں سے کتنے رشتے دار ہمارے گھر میری آمد سے پہلے میری شادی میں شریک ہونے کے لیے موجود تھے۔ گھر میں اتنے مہمان تھے کہ میں اپنے باپ سے لڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ سب لوگ مجھے میری شادی کی مبارکباد دے رہے تھے اور میں حیرت سے سب سن اور دیکھ رہا تھا۔ ساری زندگی مجھے سب کچھ دینے کے بعد کس طرح میرے والدین نے مجھ سے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین کر اپنے ہر احسان کی قیمت وصول کر لی تھی۔ میں نے پیار سے اس ظلم پر احتجاج کیا تو وہ دو ٹوک انداز میں بولے۔

”ہم نے تمہاری رضامندی کے بعد شفیق سے اس کی بیٹی کے رشتے کی بات کی تھی۔“

”لیکن وہ بات تو تب ہی ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے منع کر دیا تھا۔“ میں مشتعل ہوا تو وہ بے نیازی سے بولے۔

”انہوں نے منع نہیں کیا تھا۔ صرف یہ کہا تھا کہ ان کی بیٹی ابھی چھوٹی ہے، وہ اس کی شادی چند سال بعد

ادارہ خواتین ڈائجسٹ لٹریچر سے بہنوں کے لیے عید کا تحفہ ہے

## 4 خوبصورت و مقبول ناول

★ میر خواب بڑھ ریزہ ہانک 300/- \* لامرسل حبیب احمد 180/-  
★ اک دیا جلائے کھانا بابا 300/- \* شہر دل کے دروازے شاد جوی 250/-  
جادوں و ناول ایک ساتھ مستخوانے پر ڈاک خرچ فرمایا  
• خوبصورت مروت • خوبصورت چھائی • مضبوط جلد • آفٹ پیسر

شکایات ہوا گئے ہیں

آج بھی قریبی بکسٹال سے حاصل فرمائیں



میں یقین تھا۔" وہ اب براہ راست اس کی طرف دیکھ  
تھا۔ اس کی خوب صورتی کا ذکر اس نے بہت  
خرانہ انداز میں کیا تھا۔

"صحیح سوچا تھا انہوں نے اپنے حساب سے۔ تم  
بہت خوبصورت ہو۔ جو لڑکی بغیر کسی میک اپ  
رہناؤ سنگھار کے سر پر دوپٹہ اوڑھے اس قدر حسین  
رہی ہے اس کی خوبصورتی میں شک کی کوئی  
خجانش ہی نہیں رہ جاتی۔ تم بہت خوبصورت ہو، اعلا  
لیم یافتہ ہو، یہ تمام وجوہات کافی ہیں۔ تمہیں ایک  
بھی لڑکی سمجھنے کے لیے تمہیں پسند کرنے کے لیے  
لریہ تمام وجوہات کافی نہیں ہیں، تم سے محبت کرنے  
کے لیے۔"

"ہر اچھا شخص جو مجھے پسند بھی کر رہا ہو ضروری  
میں کہ میں بھی اسے پسند کر لوں اور یہ بھی ضروری  
میں کہ اس ناپسندیدگی کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ہو۔"  
سے اپنی کسی ایک بات اچانک ہی یاد آئی تو اس کا دل  
چاہا وہ سفیر کو یہ بات بتائے کہ وہ بھی بالکل اسی کی طرح  
سوچتی ہے۔ وہ بھی ہر اچھے شخص سے صرف اس وجہ  
سے محبت نہیں کر سکتی کہ وہ اچھا ہے۔

"مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ  
ہوا اس پر مجھے افسوس ہے مگر میں اس سب کے لیے  
خود کو قصور وار نہیں سمجھتا۔ تمہارے ساتھ ظلم  
میرے ماں باپ نے کیا ہے۔ اگر کچھ کہنا ہے تو جا کر ان  
سے کہو۔" وہ ایک دم ہی صوفے سے اٹھا اور پھر اس  
سے مزید کچھ کہے بغیر ہاتھ روم میں چلا گیا۔ چھ سات  
منٹ بعد ہی وہ تو لیے سے سر رگڑتا ہوا ہاتھ روم سے  
نکل آیا۔ تولیہ اس نے لایروائی سے کرسی پر اچھالا اور  
ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے گھڑے ہو کر برش کرنے لگا۔  
اسی وقت کسی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"السلام علیکم بھابھی!" آنے والی شخصیت علینا کی  
تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرائی۔ اسے خود  
اپنے مسکرانے پر حیرت ہوئی تھی۔ جو باتیں کچھ دیر  
پہلے سفیر اس سے کر کے گیا تھا ان کے بعد مسکرانے  
کی کوئی گنجائش بچی تو نہیں تھی۔

"میں نے ابھی سفیر بھائی کو لاؤنج میں دیکھا تو سوچا  
کہ شاید آپ بھی اٹھ گئی ہوں گی، اسی لیے آگئی مگر  
تیاری میں آپ کی مدد کروا دوں۔" اس نے اپنی چھ ماہ کی  
بیٹی کو گود سے اتار کر بیڈ پر لٹایا اور خود اس کے لیے  
لباس منتخب کرنے لگی۔

"یہ ساڑھی کیسی ہے؟" اس نے فیروزی رنگ کی  
بنارسی ساڑھی اس کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔  
"بہت خوبصورت ہے۔" اس نے مسکراتے  
ہوئے جواب دیا۔ وہ علینا کو اپنے چہرے پر کچھ کھوتا  
ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اسے علینا کی اس کوشش اور  
اس کوشش کے جواب میں اپنا مسکرا مسکرا کر "سب  
ٹھیک ہے" والا انداز اختیار کرنے پر ہنسی آنے لگی۔

"بھابھی! آپ کیڑے بدلیں، میں شام کو کسی کے  
سپر دکر کے آتی ہوں پھر مجھے آپ کا میک اپ کرنا ہے۔  
میرا خیال ہے آپ کے گھر سے بھی عاصمہ وغیرہ آنے  
والے ہوں گے۔ ان کے آنے سے پہلے آپ تیار  
ہو جائیں تو اچھا ہے۔" وہ اپنی بیٹی کو گود میں لیتے ہوئے  
بولی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ علینا کمرے سے  
باہر چلی گئی تو وہ اٹھ کر بیڈ کے پاس آگئی۔ اس نے اس  
جیولری کیس کو اٹھایا۔ اور ڈریسنگ ٹیبل کے پاس  
آگئی۔ علینا کے کہنے پر اسے خود بھی یہ بات یاد آگئی  
تھی کہ ابھی کچھ ہی دیر میں اس کے گھر سے کوئی نہ کوئی  
آنے والا ہو گا اور آنے والے اگر عاصمہ یا اس کی کوئی  
کزن ہوئی تو پہلا سوال اسی چیز کے بارے میں ہو گا۔  
اس کے ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔

اسے وہ جیولری اپنے ہاتھوں سے پہننے پر خود پر ذرا  
بھی ترس نہیں آیا تھا۔

"تمہارے ساتھ یہی سب کچھ ہونا چاہیے تھا صبا  
شفیق۔ تم اس کی مستحق تھیں۔" وہ استہزائیہ انداز  
میں خود پر ہنسی۔

علینا نے اس کا میک اپ کرنے کے بعد جیولری  
پہناتے ہوئے ستائشی انداز میں بولی۔ "آپ کی ہانٹ  
اور فنگر ایسا ہے کہ آپ پر ساڑھی بہت اچھی لگ رہی  
ہے۔ بہت کم لوگوں پر ساڑھی اتنی اچھی لگتی ہے۔" وہ

اسے تیار کر کے  
ساتھ کمرے میں  
اسے دیکھتے ہی  
چڑھا۔ اس نے  
سے لپٹایا۔ وہ اس  
کی تیار یوں  
طرح زینہ  
اس کی گردن  
ایک گہری طہر  
علینا نے بھی  
"کیلی آ  
پوچھا۔ وہ اس  
"ہاں، ہر  
بھی تو آیا  
کر۔" وہ جواب  
"تم لوگ  
لگا کیوں نہیں  
گئیں جبکہ  
ناشتے  
آگئی۔ سفیر  
جانے  
ہاتھوں ہاتھ  
ممانے  
"صبا  
تھوڑی دیر  
نے بے  
"بہر  
دیا۔ ممانے  
"بہر  
آئی۔  
"م  
نے  
خاص  
کہہ



میں داخل ہوتی ہوئی عاصمہ نے بھی سن لیا۔ ماما کی طرح وہ بھی بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔  
شام کو علیہا اور سفیر اسے لینے آئے تھے۔ سفیر کا انداز بہت سنجیدہ اور لیے دیے قسم کا تھا۔ ظفر کے ساتھ البتہ اس کی کافی دوستانہ انداز میں گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ لوگ وہاں سے رخصت ہوئے تو سفیر انہیں بیوٹی پارلر ڈراپ کر کے گھر چلا گیا تھا۔ ویلے کے لیے اسے یہیں سے تیار ہونا تھا۔ واپسی میں سفیر کی جگہ اس کا ایک کزن ان لوگوں کو لینے آیا تھا۔ وہ لوگ ہوٹل پہنچے تو تقریباً تمام مہمان آچکے تھے۔

علیہا اور عاصمہ کی آپس میں اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ کل کامیک اپ زیادہ اچھا تھا یا آج کا۔  
”نہ تم دونوں کا کوئی کمال ہے نہ تمہارے منتخب کیے ہوئے بیوٹی پارلر زکا۔ وہ ہے ہی اتنی پیاری۔ کہیں سے بھی تیار ہوئی“ اسے اچھا ہی لگتا تھا۔ ”علیہا کی خالہ نے صاف گوئی سے تبصرہ کرتے ہوئے ان دونوں کی بحث کا خاتمہ کر دیا۔ وہ خاموش بیٹھی ان لوگوں کے تبصرے سن رہی تھی۔ فنکشن ختم ہونے پر جب آہستہ آہستہ تمام مہمان رخصت ہو گئے اور صرف گھر کے افراد اور خاندان کے قریبی لوگ وہاں رہ گئے تو زرینہ آنٹی سفیر سے بولیں۔

”تم اور صبا گھر چلے جاؤ۔ ہم لوگوں کو ابھی آدھا پون گھنٹہ اور لگے گا۔ صبا بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوگی۔“ ماما نے سچ کہا تھا۔ اس کی ساس واقعی اسے بہت چاہتی تھیں۔ انہیں اتنی مصروفیت میں بھی اس کی تھکن کی فکر تھی۔

”تم نے کیا سوچا؟“ سفیر نے اس پر نظر ڈالے بغیر سنجیدگی سے پوچھا۔

”آپ نے کیا سوچا؟“ اس کے سوال کے جواب میں اس نے بھی سوال ہی کیا تھا۔ اسے اس سے اس بر جستگی کی توقع نہیں تھی۔ لہذا بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرے پیرٹس نے مجھ سے پوچھنے کے بعد آنٹی“ انکل کو ہاں کہی تھی۔ انہوں نے میری رضامندی سے

اسے تیار کر کے فارغ ہوئی ہی تھی کہ زرینہ آنٹی کے ساتھ کمرے میں عاصمہ اور معاذ داخل ہوئے۔ معاذ اسے دیکھتے ہی بھاگتا ہوا فوراً اس کے پاس بیڈ پر پڑھا۔ اس نے بھی بڑے والہانہ انداز میں اسے خود سے لپٹایا۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی تیاریوں پر حیران بھی نظر آ رہا تھا۔ علیہا کی طرح زرینہ آنٹی نے بھی اسے بہت غور سے دیکھا۔ اس کی گردن میں پرل کا نیکیلس دیکھتے ہی انہوں نے ایک گہری طمانیت بھری سانس لی جو اس کے علاوہ علیہا نے بھی محسوس کی تھی۔

”مکیلی آئی ہیں بھابھی؟“ اس نے عاصمہ سے پوچھا۔ وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔  
”ہاں بس میں اور ظفر آئے ہیں۔ اور ہاں یہ معاذ بھی تو آیا ہے ہمارے ساتھ۔ وہ بھی زبردستی پیچھے لگ کر۔“ وہ جواباً مسکرائی۔

”تم لوگ باتیں کرو“ میں دیکھوں کہ ناشتہ اب تک لگا کیوں نہیں ہے۔“ زرینہ آنٹی کمرے سے باہر چلی گئیں جبکہ علیہا ان لوگوں کے پاس ہی بیٹھ گئی۔  
ناشتے کے بعد وہ ظفر اور عاصمہ کے ساتھ گھر آئی۔ سفیر نے اپنی تھکن کا جواز پیش کر کے ساتھ جانے سے معذرت کر لی تھی۔ گھر میں اسے یوں ہاتھوں ہاتھ لپٹا گیا گویا وہ بہت دنوں بعد وہاں آئی ہو۔ ماما نے اسے گلے لگا کر خوب پیار کیا تھا۔

”صبا! تمہیں سفیر کیسا لگا؟“ بڑی مشکلوں سے تھوڑی دیر کے لیے انہیں تنہائی نصیب ہوئی تو انہوں نے بے تابی سے اس سے پوچھا۔

”بہت ہنڈ سم۔“ اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ماما کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔  
”بد تمیز۔ ماں سے مذاق کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔“

”ماما! آپ نے یہی تو پوچھا ہے کہ سفیر کیسا لگا۔ میں نے سچائی سے جوابات دیے وہ بتا دی۔ اب ایک اچھے خاصے ڈیشننگ ہنڈ سم اور اسمارٹ بندے کو میں یہ تو کہہ نہیں سکتی کہ اچھا نہیں لگا۔“ اس کا جواب کمرے



میرا رشتہ طے کیا۔ مجھے اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اعتراض آپ کو ہے۔ آپ کی ناپسندیدگی کے باوجود بھی یہ شادی ہو چکی ہے۔ اب آگے کے بارے میں اہمیت میرے سوچنے کی نہیں، آپ کے سوچنے کی ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے حد سپاٹ انداز میں بولی۔

سفیر نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”مجھے سمیعہ سے ہر قیمت پر شادی کرنی ہے۔ اس بارے میں سوچنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ گھر سے مہمان چلے جائیں اور علیینا اپنے گھر واپس چلی جائے تو میں فوراً ”کینیڈا واپس چلا جاؤں گا۔ میری کینیڈا میں جاب اتنی اچھی ہے کہ میں اپنے باپ کے پیسوں کا بالکل بھی محتاج نہیں، وہ بے شک مجھے عاق کرویں۔“

اپنی باتوں پر اس کا رد عمل دیکھنے کے لیے اس نے ایک مرتبہ پھر ونڈا سکرین سے نظریں ہٹا کر صبا کی طرف دیکھا۔

”کیا آپ کی اور سمیعہ کی زندگی میں میرے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے؟“ اس کا سوالیہ انداز ایک دفعہ پھر جذبات سے عاری تھا۔ ”حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”میں اس شادی کو قائم رکھنا چاہتی ہوں۔ میری بہن کے انتقال کو ابھی بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ میرے پیرٹس ابھی تک اس صدمے سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ اگر میری شادی ختم ہو گئی تو انہیں بہت بڑا شاک پہنچے گا۔ میں انہیں اپنی وجہ سے کوئی دکھ نہیں دینا چاہتی۔ آپ کو سمیعہ کے ساتھ ضرور شادی کرنی چاہیے۔ آپ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں آپ دونوں کی شادی ہونی چاہیے مگر کیا اس شادی کے ساتھ ساتھ آپ میرے ساتھ بھی اس تعلق کو قائم رکھ سکتے ہیں؟“

”تم دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف ہو۔“ یہ لڑکی اسے آج صبح سے چونکا رہی تھی۔ وہ اعتراف کیے بنا رہ نہیں سکا تھا۔ ”تمہاری جگہ دوسری کوئی لڑکی ہوتی تو

اس صورت حال میں اس طرح ری ایکٹ نہیں کر سکتی تھی۔ بجائے رونے دھونے اور واویلہ کرنے کے تم نے اتنی جلدی تمام مسائل کا منطقی انداز میں حل تلاش کرنا شروع کر دیا ہے۔ تم واقعی بہت مضبوط اور بہادر لڑکی ہو۔“ اس نے بڑی صاف گوئی سے اس کی تعریف کی۔

”آپ کی تعریف کا شکریہ۔ لیکن آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ اس کے سوالیہ انداز پر اس کے لبوں پر بے ساختہ ہلکی سی مسکراہٹ در آئی تھی۔ ”تم بہت اچھی لڑکی ہو صبا! تمہارے ساتھ واقعی بہت زیادتی ہوئی ہے۔ تمہاری شادی کسی ایسے شخص سے ہونی چاہیے تھی جو تم سے محبت کرتا۔“ اس کی نگاہوں اور اس کے لہجے میں سرد مہری اور اجنبیت کی جگہ دوستانہ انداز نے لے لی تھی۔

”اس وقت نہ میں تمہیں بتاں کہہ سکتا ہوں اور نہ ہاں۔ تم مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا وقت دو۔“ گاڑی گھر کے اندر لا کر پورچ میں لے جا کر روکتے ہوئے اس نے کہا۔ شدید خواہش رکھنے کے باوجود وہ اسے دو ٹوک انداز میں منع نہیں کر پایا تھا۔ کمرے میں آکر وہ بجائے بیٹھنے کے فوراً ہی ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آکر اپنی جیولری اتارنے لگی۔ سفیر ڈریسنگ روم میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔ وہ کپڑے بدل کر آیا تو وہ دوپٹے کی بنیں نکالنے میں مصروف تھی۔ وہ کل کی طرح بالکلوی میں نہیں گیا تھا بلکہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ بنیں نکالتے نکالتے یونہی بے دھیانی میں اس کی نظر سفیر پر پڑی تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ اس کی طرف بہت عور سے دیکھ رہا تھا اور یہ نگاہیں صبح سے لے کر اب تک کی تمام نگاہوں سے مختلف تھیں۔ ایک بل کے لیے دوپٹہ پر رکھے اس کے ہاتھ کانپے۔ اس نے فوراً اپنا رخ بدل لیا۔

اور دوپٹہ کی آخری پن نکالنے کے بعد کپڑے بدلنے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکا تھا۔





صبح ناشتے کے تھوڑی دیر بعد ہی زرینہ آنٹی نے اس سے لنچ کے بارے میں پوچھا۔  
 ”لنچ میں کیا کھاؤ گی صبا؟“ انکل بھی بیٹھے تھے۔  
 ”کچھ بھی جو آپ لوگوں کو پسند ہو۔“

”کلف سے کام نہیں چلے گا“ اپنی پسند بتاؤ۔ آج ہم سب بھی تمہاری پسند کا لنچ کریں گے۔“ انکل نے اسے فوراً ٹوکا۔  
 ”کوئی بھی چائینر ڈش۔“ ان کے اصرار پر اسے کہنا

”زرینہ! آج لنچ پر چائینر ڈشز ہونی چاہئیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ ہونی چاہئیں۔“ اس کا جواب سنتے ہی انہوں نے زرینہ آنٹی سے کہا۔ زرینہ آنٹی فوراً وہاں سے چلی گئیں۔ انکل بھی اپنے کسی کام سے تھوڑی دیر بعد اٹھ گئے تو وہ کچھ دیر کے لیے لاؤنج میں بالکل تنہا رہ گئی۔  
 ”تم یہاں بیٹھی ہو۔“ سفیر لاؤنج میں آتے ہوئے بولا۔

”چلو لنچ کرنے کہیں باہر چلتے ہیں۔“ گاڑی کی چابی ہاتھ میں لیے وہ جیسے جانے کا پروگرام پہلے ہی سے بنائے بیٹھا تھا۔  
 ”لیکن آنٹی میری وجہ سے لنچ پر چائینر کھانے بنوا رہی ہیں۔“

”گھر پر بہت لوگ ہیں وہ کھانا کھانے کے لیے چھوڑ دو تم اسے۔“ اس کے اعتراض پر وہ لاپرواہی سے بولا۔

”میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم می کو بتا کر آ جاؤ۔“ باہر نکلتے ہوئے اس سے بولا۔

”آنٹی! ہم لوگ لنچ کرنے جا رہے ہیں۔“ وہ کچن کے دروازے کے پاس آکر ہچکچائے ہوئے انداز میں بولی۔ وہ ملازمہ کو لنچ کے لیے کچھ ہدایات دینے میں مصروف تھیں۔ اسے آنا دیکھ کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ اس کی بات سن کر وہ بڑے خوشگوار انداز میں مسکرا دیں۔

”ضرور جاؤ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ برآمدے کے بجائے وہ بہت زیادہ خوش نظر آ رہی تھیں۔ اسے معلوم تھی وجہ کس وہ سے اس قدر خوش ہیں۔ وہ پوربج کی طرف جانے لگی تو راستے میں انکل سے ٹکراؤ ہوا۔ وہ سفیر کو گاڑی میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے دیکھ چکے تھے اس لیے ان کے چہرے پر پہلے ہی سے فخریہ مسکراہٹ تھی۔ اپنے فیصلے کا اچھا نتیجہ نکلا دیکھ کر وہ بڑے مطمئن نظر آرہے تھے۔ ان کی سوچ اور ان کا تجربہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ بیٹا گھر والوں پر غصے اور ناراضی کے باوجود بھی اس لڑکی کو نظر انداز نہیں کر پایا تھا اور یہی انہیں امید تھی۔

”تمہیں چائینر کھانے پسند ہیں؟“ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”سیوزک سنو کی؟“ اس کے پوچھنے پر اس نے سر ہلا دیا۔ اس نے کیسٹ لگا دی۔ گاڑی ایک چائینر ریسٹورنٹ کے پاس لا کر روک دی تھی۔ کل رات اس نے صبا سے کہا تھا کہ وہ سوچ کر اسے جواب دے گا اس بات کا کہ وہ اس کے ساتھ اس رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے تیار ہے یا نہیں مگر پھر اسے سوچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

کل رات کے بعد اب نہ صبا کو اپنے سوال کے جواب کی کوئی ضرورت رہی تھی اور نہ اسے جواب دینے کی کسی بھی وجہ سے لیکن وہ صبا شفیق کو قبول کر چکا تھا اسی لیے اس وقت لنچ کرتے ہوئے وہ اسے بڑی سنجیدگی سے بتانے لگا۔

”ابھی میں واپس ٹورنٹو چلا جاؤں گا۔ فوراً“ میں سمیعہ کو یہ سب کچھ بتا نہیں سکوں گا کچھ عرصہ لگے گا مجھے یہ سب کچھ اسے سمجھانے میں۔ ظاہری بات ہے اسے بہت صدمہ پہنچے گا۔ وہ مجھ سے بدگمان ہوگی۔ آہستہ آہستہ میں اسے قائل کروں گا۔ پتا نہیں اس سب میں کتنے دن لگیں۔ ویسے بھی ابھی ایک سال سے پہلے تو میرا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ پہلے بھی نہیں تھا۔ شادی میں اس کے ساتھ یہاں سے جاتے



ہی کر لوں گا پھر جیسے ہی وہ میری بات سمجھنے میں کامیاب ہوئی ہم لوگ پاکستان آجائیں گے۔ پاکستان آنے کا میرا پکا پروگرام ہے۔ تم مئی پاپا کے ساتھ رہنا سمیعہ کو میں الگ گھر میں رکھوں گا۔ وہ پرسکون سے انداز میں مسکرائی۔ اسے سفیر کی بات سے بڑا اطمینان ملا تھا۔

”میں آپ کی اور سمیعہ کی زندگی میں بالکل مداخلت نہیں کروں گی۔“ وہ اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے اس کی بات سن رہا تھا۔ ”بس میری آپ سے اتنی التجا ہے کہ میرے گھر والوں کو ابھی کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔ جس طرح آپ سمیعہ کو ایک دم سے ساری بات نہیں بتا سکتے اسی طرح میں بھی انہیں اچانک یہ خبر نہیں سنا سکتی۔ آپ کے جانے کے بعد موقع دیکھ کر میں انہیں مناسب طریقے سے ساری بات سمجھا دوں گی۔“ وہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ سفیر نے اس کی بات بڑی سنجیدگی سے سنی اور سر ہلا دیا۔ وہ اب اس کی باتوں پر حیران نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھی لڑکی کوئی عام لڑکی نہیں وہ بڑی منفرد اور مختلف لڑکی ہے۔

”پاپا سے ناراضی کے باوجود میں ان کی لائی ہوئی لڑکی کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس سے نفرت ہے۔“ وہ اس کی تعریف کر رہا تھا۔

”پھر اس میں میرا تو کوئی کمال نہیں۔ مطلب یہ کہ اگر میں خوبصورت نہ ہوتی تو آپ مجھ سے نفرت کرتے مگر عام سی شکل کے ساتھ بھی میں ہوتی تو صبا شفیق ہی۔ بقول آپ کے میں مختلف ہوں بہادر ہوں مضبوط ہوں۔ تب بھی مجھ میں یہ سب خصوصیات موجود ہوتیں مگر کیا اس وقت یہ خصوصیات اس وجہ سے غیر معمولی نہیں لگتیں کیونکہ ان کی حامل لڑکی عام سی صورت شکل کی ہوتی؟“ وہ جواباً کھل کر ہنسا تھا۔

”فرض کرنے والی بات کا میں کیا جواب دوں۔ اگر تم خوبصورت نہ ہوتیں یہ بات فی الحال تو میں فرض بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس وقت میرے سامنے گرین کلر کا ڈریس پہنی ہوئی لڑکی بے حد حسین لگ رہی

ہے۔“ فی الوقت وہ صبا شفیق کے حسین کا اسیر ہو گیا تھا۔ اس کی باتیں اسے اچھی لگ رہی تھیں۔ اسے دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔

”آپ فوراً گھر واپس جانا چاہتے ہیں؟“  
”ارادہ تو یہی تھا ویسے اگر تمہارا کہیں اور چلنے کا موہ ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ اس نے بڑی فراخ دلی سے کہا۔

”میں ماما اور ڈیڈی سے ملنا چاہتی ہوں اگر آپ چل سکیں تو۔“



کھانے کے بعد وہ کمرے میں آئی تو سفیر وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ ٹی وی پر کوئی مووی دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا۔

”آؤ بیٹھو اچھی مووی آرہی ہے۔“ اس کی نظریں اسکرین پر تھیں اور ذہن معاذ میں اٹکا ہوا تھا۔  
”میرا خیال ہے تمہیں فلم اچھی نہیں لگ رہی۔“  
”والیوم کم کرتے ہوئے وہ بولا۔“  
”نہیں، فلم اچھی ہے۔“ اس نے چونکتے ہوئے اسے جواب دیا۔

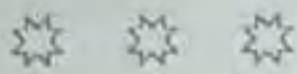
”فلم سے تمہاری بیزاری اپنی جگہ درست ہے۔ چاہے جن حالات میں بھی ہماری شادی ہوئی ہے۔ بہر حال آج ہماری شادی کی تیسری رات ہے اور صرف تین دنوں میں دو افراد ایک دوسرے سے اتنے تنگ نہیں آجاتے کہ آپس میں گفتگو کرنے کے بجائے ٹی وی دیکھ کر وقت گزاریں۔ یہ نوٹ تو غالباً شادی کے دو تین سالوں بعد آئی شروع ہوتی ہے۔“ اپنی بات مکمل کر کے اس نے ریموٹ سے ٹی وی آف کر دیا تھا۔

”چلو ہم اپنی باتیں کرتے ہیں۔ موضوع کا انتخاب تم کرو۔“ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔  
”آپ مجھے سمیعہ کے بارے میں بتائیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہی کہ وہ آپ



”حیرت ہے، تمہیں بھی اس کی وہی چیز سب سے اچھی لگی جو مجھے لگتی ہے۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔  
سگریٹ الٹش ٹرے میں مسلتے ہوئے اس نے تصویر واپس والٹ میں رکھ دی تھی۔ اس وقت وہ اس سے اتنی دور تھی کہ وہ اسے یاد کر کے دکھی ہونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا، اس لیے اس نے اپنی توجہ اس لڑکی کی طرف کر لی جسے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے سب پریشانیاں بھول جانے کو جی چاہنے لگتا تھا۔



ظفر تفریحی پروگرام بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ حسب عادت اس نے ایک پکنک کا پروگرام بنالیا جس میں صبا کی سسرال کو بھی انوائٹ کیا تھا۔ وہ اور عاصم، ہنی مون کے لیے جانے والے تھے۔ جانے سے دو دن پہلے اس نے پکنک اریج کر لی تھی۔ سفیر کی ایک خالہ جو دبئی سے آئی تھیں، واپس جا چکی تھیں جبکہ دوسری ابھی یہیں موجود تھیں۔ وہ سب ہی لوگ پکنک پر آئے تھے۔

وہ دونوں واک کرتے ہوئے سب سے کافی دور آگئے تھے۔ سفیر اسے اپنی کینیڈا میں منائی جانے والی اس پکنک کا احوال سن رہا تھا جس میں اس نے اپنے یونیورسٹی کے دوستوں کے ساتھ مل کر بہت انجوائے کیا تھا۔ وہ بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ بہت دور جھیل کے کنارے بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے ار تضحیٰ اور ظفر اسے نظر آئے تھے۔ سفیر نے ان دونوں کو نہیں دیکھا تھا، وہ اپنا قصہ سنانے میں مصروف تھا۔ واک کرتے کرتے اچانک اس نے سفیر کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ ایک پل کے لیے بہت حیران ہوا تھا۔ یہ لڑکی جو اپنی عمر سے بیس، تیس سال بڑی اور میچجور لگتی تھی، اس سے وہ یہ توقع کبھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی پکنک ایساٹ پر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بھی واک کر سکتی۔ اپنا قصہ ادھور اچھوڑ کر اس نے متحیر سے انداز میں اسے دیکھا۔ اس دوران واک کرتے ہوئے وہ دونوں ار تضحیٰ اور ظفر کے کافی قریب پہنچ چکے

کو پہلی مرتبہ کب اچھی لگی، کیوں اچھی لگی۔“  
”تمہیں برا نہیں لگے گا اگر میں تم سے اس کی باتیں کروں گا۔“ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔  
”صوبلا“ مجھے برامانے کا کوئی حق ہے تو نہیں۔ وہ میرے اور آپ کے درمیان نہیں آتی۔ میں آپ کے اور اس کے درمیان آئی ہوں۔ اگر لگے تو اسے میرا ذکر برا لگنا چاہیے، مجھے اس کا نہیں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”مگر تم جان بوجھ کر تو ہمارے درمیان نہیں آئیں۔ اگر ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو تمہارے ساتھ بھی زیادتی ہی ہوئی ہے۔“ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس پر ایک نظر دوڑائی۔  
”وہ میری قسمت۔ میری قسمت میں جو لکھا تھا، وہ ہو گیا۔ میں اس کے لیے کسی کو الزام نہیں دیتی۔“ وہ منات سے بولی پھر ایک سیکنڈ کا توقف کر کے دوبارہ گویا ہوئی۔

”آپ نے میرا سوال ٹال دیا۔ میں آپ سے سمیعہ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ وہ کیا بہت خوبصورت ہے؟“ وہ جواب میں مسکرایا۔  
”خوبصورت۔ اگر میری نظر سے دیکھو تو وہ اس دنیا کی سب سے حسین لڑکی ہے اور اگر دوسرے لوگوں کی بات کروں تو وہ گڈ لکنگ ہے۔“ جواب دیتے ہوئے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا والٹ اٹھایا اور پھر اس میں سے کچھ نکالنے لگا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”یہ دیکھو کی اس تصویر۔“ اس نے والٹ میں سے تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ بلیوٹراؤزر اور ریڈ ٹی شرٹ کے ساتھ گلے میں دوپٹے کے انداز میں بلیک اور ریڈ پرنٹڈ اسکارف لیے وہ لڑکی بڑی بے ساختگی سے کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ ہنستے ہوئے سب سے نمایاں چیز اس کے ڈسپلر تھے۔

”اس کی ہنسی بہت پیاری ہے۔ خاص طور پر ڈسپلر بہت خوبصورت لگ رہے ہیں۔“ اس نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔



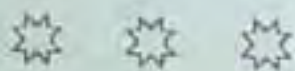
حیرت کا باعث نہیں تھی۔ سب کے علم میں یہ بات تھی کہ سفیر ایک سال کے اندر اندر مستقل طور پر پاکستان واپس آنے والا ہے اور اسی لیے وہ وہاں اپنے رکے ہوئے سب کام جلدی جلدی مکمل کر لینا چاہتا ہے۔ اس تمام عرصہ میں اس کے سفیر کے ساتھ بہت ناز مل تعلقات رہے تھے۔

ایئرپورٹ روانگی سے قبل، کمرے سے تیار ہو کر نکلنے سے پہلے وہ چند لمحوں کے لیے اس کے پاس آکر رکا تھا۔

”تم بہت اچھی ہو صبا! کاش میں تم سے محبت کر سکتا۔“ اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔ وہ آہستگی سے مسکرائی۔

”تمہیں تکلیف ہو رہی ہوگی یہ بات سوچ کر کہ تمہارا شوہر تم سے دور جا کر فوراً ہی ایک دوسری لڑکی سے شادی کرنے والا ہے۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈھونڈنے چاہے۔

”آپ نے اول روز مجھے ساری بات صاف صاف بتا دی تھی اور میں ساری باتیں جاننے کے باوجود اس رشتے کو نبھانے کے حق میں ہوں۔ آپ یقین کر لیں کہ میں نے حقیقت پسندی کے ساتھ اس ساری صورت حال کو قبول کر لیا ہے۔ میں آپ دونوں کی واپسی کا انتظار کروں گی۔“ سفیر کو ایئرپورٹ چھوڑنے کے لیے صرف اس کے گھر والے ہی نہیں گئے تھے بلکہ بابا، ڈیڈی اور ار ترضی بھی اسے سی آف کرنے آئے تھے۔ زرینہ آنٹی اور انکل کے چہروں پر بیٹے کو رخصت کرتے وقت بہت اطمینان تھا۔ سفیر کا صبا کے ساتھ رویہ ان کے سامنے تھا۔ وہ اس کی اچھائیوں کا معترف ہو گیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت بھی اس نے بڑی گرم جوشی اور اپنائیت کے ساتھ اسے خدا حافظ کہا تھا۔

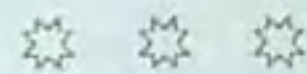


سفیر نے ٹورنٹو پہنچتے ہی اپنی خیریت کا فون کیا تھا۔ زرینہ آنٹی اور اس سے اس نے بہت مختصر سی گفتگو کی

تھے۔ وہ دونوں ان دونوں کو کافی دور سے ہی آتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ سفیر کی بعد میں نظر پڑی تھی ان دونوں پر۔ بہت دور تک کا چکر لگا کر کافی دیر بعد وہ دونوں واپس سب لوگوں کے پاس آئے تھے۔ کچ کا زبردست اہتمام تھا۔ عاصمہ اور علیہنا کھانا لگانے میں مصروف تھیں۔ وہ بھی ان دونوں کی مدد کروانے لگی۔ کھانے کے وقت بہت شور مچا ہوا تھا۔ فل والیوم میں گانے بھی بج رہے تھے اور سب لوگ بھی زور زور سے بولنے اور شور شرابا کرنے میں مصروف تھے۔ اس نے سامنے رکھی ہوئی بریانی کی ڈش اٹھائی۔ اپنی پلیٹ میں بریانی ڈالنے سے پہلے اس نے سفیر سے پوچھا۔

”آپ بریانی لیں گے؟“ اس نے جواباً ”سراشات میں ہلایا تو اس نے اپنی پلیٹ میں بریانی ڈالنے سے پہلے اس کی پلیٹ میں ڈالی۔ پھر اس نے شامی کباب کی ڈش اٹھائی تو اس طرح اس سے پوچھ کر پہلے اس کی پلیٹ میں ایک کباب رکھا پھر اپنی پلیٹ میں۔

بابا نے اپنے چہرے کے تاثر سے ایسا ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ انہوں نے اس کی یہ بات خاص طور پر نوٹ کی ہے لیکن دل ہی دل میں وہ صبا کی اس مشرقی بیویوں والی ادا سے خوب محفوظ ہوئے تھے۔ انہیں وہ دونوں ساتھ بیٹھے اچھے لگ رہے تھے۔ ان کے درمیان یقیناً بہت محبت اور انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے دل کو بہت اطمینان ہوا تھا۔ ساتھ مل کر ایک بہت ہی بھرپور دن گزار کر وہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئے تھے۔



ظفر اور عاصمہ، ہنی مون کے لیے پاکستان کے شمالی علاقوں کی طرف نکل گئے تھے۔

علینا نے جیسے ہی اسلام آباد واپسی کا اعلان کیا، سفیر نے بھی جھٹ پٹ اپنی واپسی کی سیٹ کنفرم کرا لی۔ علیہنا کے جانے کے تیسرے دن کی فلائٹ تھی اس کی۔ اس دوران وہ سفیر کے ساتھ کئی مرتبہ اپنے گھر ہو آئی تھی۔ سفیر کی اتنی جلدی واپسی کسی کے لیے بھی



ظفر واپس جانے والا تھا۔ وہ بھائی کے ساتھ ایک دو گزارنا چاہتی تھی۔ زرینہ آئی نے اسے بخوشی میکے کی اجازت دے دی۔ ظفر کے جانے میں ابھی دو تھے۔ عاصمہ بہت چپ چاپ نظر آرہی تھی۔

”اتنا عجیب لگ رہا ہے صبا! ظفر کے جانے کا سوچ کر ہیرا رہا ہے۔ تمہیں بھی اس طرح کی فیلنگز ہونی لگی سیر کے جانے پر۔“ عاصمہ نے اس سے کہا تو نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

”فطری بات ہے نا بھابھی! جس شخص سے آپ کا نہ جڑا ہے اس کا دور جانا اچھا کیسے لگ سکتا ہے۔“ وہ شام کو آئی تھی۔ شام سے لے کر رات گئے تک ظفر، ار تفضی اور عاصمہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ بابا، ڈیڈی اور ماما نے رات دس بجے تک ان کا ساتھ دیا تھا۔

اگلے روز معاذ کا اسکول کا پہلا دن تھا۔ اس کا جشن صبا کی شادی سے بھی کافی دن پہلے ہو چکا تھا۔ نے معاذ کو بڑی خوشی خوشی اسکول کے لیے تیار کیا۔ کے لیے اپنے ہاتھوں سے ناشتا بنایا۔ رات دیر جاگنے کے باوجود وہ سب لوگ معاذ کو خدا حافظ کے لیے جلدی اٹھ گئے تھے۔ سارا گھر اس کے پیچھے تھا۔ وہ خود بھی اسکول جانے پر بہت خوش اسی خوشی میں اس نے ناشتہ بھی روزانہ کی طرح بے بغیر کر لیا تھا۔ ار تفضی اسے چھوڑنے جا رہا تھا۔

”سب کو سلام کرو اور پیار کروا کر آؤ۔“ ار تفضی اس کا ہیک نیبل پر سے اٹھاتے ہوئے اسے سمجھایا ہاگتا ہوا پہلے ڈیڈی کے پاس گیا۔ انہوں نے جھک سے پیار کیا، دعائیں دیں پھر وہ بابا کے پاس آیا۔ نے اسے گود میں اٹھالیا۔

”اپنے بابا جیسے آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ بننا، بلکہ سے بھی زیادہ۔ سب سے زیادہ۔“ بابا کی گود سے وہ ان کے برابر میں کھڑے ظفر کے پاس آگیا تھا۔

”پہلے ماما کے پاس جاؤ۔“ ظفر نے اسے سمجھایا۔ وہ گر صوفے پر بیٹھی ماما کے پاس آگیا۔ ماما کی

آنکھوں میں آنسو تھے۔ اسے اپنے پیسے سے لگا رہا کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے بڑی تیزی سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ار تفضی فوراً ان کے پاس آیا تھا۔

”مما! پلیز اس طرح مت کریں۔ آج معاذ کی تعلیمی زندگی کا پہلا دن ہے، آپ اسے دعائیں دیں۔“ اس نے ان کے کندھے پر بڑی محبت سے اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

ظفر چلا گیا تو وہ واپس اپنے سسرال آگئی تھی۔ سیر نے اس ایک فون کے بعد دوبارہ فون نہیں کیا تھا۔ زرینہ آئی کو اس کا فون نہ آنے پر بہت تشویش تھی۔ اسے گئے دس دن ہو چکے تھے، شروع کے چار پانچ دن اس کی کال کا انتظار کرنے کے بعد انہوں نے خود ہی اسے گھر پر فون کیا مگر وہ گھر پر ملا نہیں پھر اس کا فون آگیا تھا مگر یہ فون صبا کے لیے تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے، جب اس کے کمرے میں فون کی بیل بجی تھی۔ اس نے ریسپور اٹھایا تو دوسری طرف سیر تھا۔

”آپ اتنے دنوں سے کہاں ہیں؟ یہاں پر سب آپ کی طرف سے بہت فکر مند ہیں۔“ اس کی آواز سنتے ہی صبا نے کہا۔

”یہیں ہوں، مجھے کہاں جانا ہے اور جو میرے لیے فکر مند ہیں ان سے کہو، میرے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”کیا ہوا سیر! آپ سمیعہ سے ملے؟“ اس کا سوال سن کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”میں بہت پریشان ہوں صبا! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا کروں۔ سمیعہ مجھ سے بہت بری طرح ناراض ہو گئی ہے۔“ وہ بہت مایوس اور پریشان لگ رہا تھا۔

”آپ فکر نہیں کریں، وہ آہستہ آہستہ ساری بات سمجھ جائے گی۔ اسے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہو جائے گا۔ آپ اسے تھوڑا سا وقت دیں۔“ اس نے اسے تسلی دینی چاہی تو وہ جواباً ”غصے سے بولا۔

”بات تو وہ تب سمجھتی اگر میری کوئی بات اس نے

سنی ہوئی کر رہی۔ اس بات کا کسی بھی ہے، اپنے آفس کہاں ملو، وہ کی جاتی جاسکتا۔ کے اعتماد ایک ناراض کے عذر معذرت انتظار کرنے اس نے اس مطمئن نہیں چار منہ صبح فون نہیں کر سکون انہیں اتنے نہیں



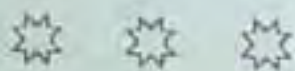
حیرت کا باعث نہیں تھی۔ سب کے علم میں یہ بات تھی کہ سفیر ایک سال کے اندر اندر مستقل طور پر پاکستان واپس آنے والا ہے اور اسی لیے وہ وہاں اپنے رکے ہوئے سب کام جلدی جلدی مکمل کر لینا چاہتا ہے۔ اس تمام عرصہ میں اس کے سفیر کے ساتھ بہت ناز مل تعلقات رہے تھے۔

ایئر پورٹ روانگی سے قبل، کمرے سے تیار ہو کر نکلنے سے پہلے وہ چند لمحوں کے لیے اس کے پاس آکر رکا تھا۔

”تم بہت اچھی ہو صبا! کاش میں تم سے محبت کر سکتا۔“ اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔ وہ آہستگی سے مسکرائی۔

”تمہیں تکلیف ہو رہی ہوگی یہ بات سوچ کر کہ تمہارا شوہر تم سے دور جا کر فوراً ہی ایک دوسری لڑکی سے شادی کرنے والا ہے۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈھونڈنے چاہے۔

”آپ نے اول روز مجھے ساری بات صاف صاف بتا دی تھی اور میں ساری باتیں جاننے کے باوجود اس رشتے کو نبھانے کے حق میں ہوں۔ آپ یقین کر لیں کہ میں نے حقیقت پسندی کے ساتھ اس ساری صورت حال کو قبول کر لیا ہے۔ میں آپ دونوں کی واپسی کا انتظار کروں گی۔“ سفیر کو ایئر پورٹ چھوڑنے کے لیے صرف اس کے گھر والے ہی نہیں گئے تھے بلکہ بابا، ڈیڈی اور ار ترضی بھی اسے سی آف کرنے آئے تھے۔ زرینہ آنٹی اور انکل کے چہروں پر بیٹے کو رخصت کرتے وقت بہت اطمینان تھا۔ سفیر کا صبا کے ساتھ رویہ ان کے سامنے تھا۔ وہ اس کی اچھائیوں کا معترف ہو گیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت بھی اس نے بڑی گرم جوشی اور اپنائیت کے ساتھ اسے خدا حافظ کہا تھا۔



سفیر نے ٹورنٹو پہنچتے ہی اپنی خیریت کا فون کیا تھا۔ زرینہ آنٹی اور اس سے اس نے بہت مختصر سی گفتگو کی

تھے۔ وہ دونوں ان دونوں کو کافی دور سے ہی آتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ سفیر کی بعد میں نظر پڑی تھی ان دونوں پر۔ بہت دور تک کا چکر لگا کر کافی دیر بعد وہ دونوں واپس سب لوگوں کے پاس آئے تھے۔ کچ کا زبردست اہتمام تھا۔ عاصمہ اور علیہنا کھانا لگانے میں مصروف تھیں۔ وہ بھی ان دونوں کی مدد کروانے لگی۔ کھانے کے وقت بہت شور مچا ہوا تھا۔ فل والیوم میں گانے بھی بج رہے تھے اور سب لوگ بھی زور زور سے بولنے اور شور شرابا کرنے میں مصروف تھے۔ اس نے سامنے رکھی ہوئی بریانی کی ڈش اٹھائی۔ اپنی پلیٹ میں بریانی ڈالنے سے پہلے اس نے سفیر سے پوچھا۔

”آپ بریانی لیں گے؟“ اس نے جواباً ”سرا بات میں ہلایا تو اس نے اپنی پلیٹ میں بریانی ڈالنے سے پہلے اس کی پلیٹ میں ڈالی۔ پھر اس نے شامی کباب کی ڈش اٹھائی تو اس طرح اس سے پوچھ کر پہلے اس کی پلیٹ میں ایک کباب رکھا پھر اپنی پلیٹ میں۔

بابا نے اپنے چہرے کے تاثر سے ایسا ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ انہوں نے اس کی یہ بات خاص طور پر نوٹ کی ہے لیکن دل ہی دل میں وہ صبا کی اس مشرقی بیویوں والی ادا سے خوب محفوظ ہوئے تھے۔ انہیں وہ دونوں ساتھ بیٹھے اچھے لگ رہے تھے۔ ان کے درمیان یقیناً بہت محبت اور انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے دل کو بہت اطمینان ہوا تھا۔ ساتھ مل کر ایک بہت ہی بھرپور دن گزار کر وہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئے تھے۔



ظفر اور عاصمہ، ہنی مون کے لیے پاکستان کے شمالی علاقوں کی طرف نکل گئے تھے۔

علینا نے جیسے ہی اسلام آباد واپسی کا اعلان کیا، سفیر نے بھی جھٹ پٹ اپنی واپسی کی سیٹ کنفرم کرا لی۔ عینا کے جانے کے تیسرے دن کی فلائٹ تھی اس کی۔ اس دوران وہ سفیر کے ساتھ کئی مرتبہ اپنے گھر ہو آئی تھی۔ سفیر کی اتنی جلدی واپسی کسی کے لیے بھی



ظفر واپس جانے والا تھا۔ وہ بھائی کے ساتھ ایک دو گزارنا چاہتی تھی۔ زرینہ آئی نے اسے بخوشی میکے کی اجازت دے دی۔ ظفر کے جانے میں ابھی دو تھے۔ عاصمہ بہت چپ چاپ نظر آرہی تھی۔

”اتنا عجیب لگ رہا ہے صبا! ظفر کے جانے کا سوچ کر ہیرا رہا ہے۔ تمہیں بھی اس طرح کی فیلنگز ہونی لگی سیر کے جانے پر۔“ عاصمہ نے اس سے کہا تو نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

”فطری بات ہے نا بھابھی! جس شخص سے آپ کا نہ جڑا ہے اس کا دور جانا اچھا کیسے لگ سکتا ہے۔“ وہ شام کو آئی تھی۔ شام سے لے کر رات گئے تک ظفر، ار تفضی اور عاصمہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ بابا، ڈیڈی اور ماما نے رات دس بجے تک ان کا ساتھ دیا تھا۔

اگلے روز معاذ کا اسکول کا پہلا دن تھا۔ اس کا شن صبا کی شادی سے بھی کافی دن پہلے ہو چکا تھا۔ نے معاذ کو بڑی خوشی خوشی اسکول کے لیے تیار کیا۔ کے لیے اپنے ہاتھوں سے ناشتا بنایا۔ رات دیر جاگنے کے باوجود وہ سب لوگ معاذ کو خدا حافظ کے لیے جلدی اٹھ گئے تھے۔ سارا گھر اس کے پیچھے تھا۔ وہ خود بھی اسکول جانے پر بہت خوش اسی خوشی میں اس نے ناشتہ بھی روزانہ کی طرح بے بغیر کر لیا تھا۔ ار تفضی اسے چھوڑنے جا رہا تھا۔

”سب کو سلام کرو اور پیار کروا کر آؤ۔“ ار تفضی اس کا ہیک نیبل پر سے اٹھاتے ہوئے اسے سمجھایا ہاگتا ہوا پہلے ڈیڈی کے پاس گیا۔ انہوں نے جھک سے پیار کیا، دعائیں دیں پھر وہ بابا کے پاس آیا۔ نے اسے گود میں اٹھالیا۔

”اپنے بابا جیسے آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ بننا، بلکہ سے بھی زیادہ۔ سب سے زیادہ۔“ بابا کی گود سے وہ ان کے برابر میں کھڑے ظفر کے پاس آگیا تھا۔ پہلے ماما کے پاس جاؤ۔“ ظفر نے اسے سمجھایا۔ وہ گر صوفے پر بیٹھی ماما کے پاس آگیا۔ ماما کی

آنکھوں میں آنسو تھے۔ اسے اپنے پیسے سے لگا کر ہار کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے بڑی تیزی سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ار تفضی فوراً ان کے پاس آیا تھا۔

”مما! پلیز اس طرح مت کریں۔ آج معاذ کی تعلیمی زندگی کا پہلا دن ہے، آپ اسے دعائیں دیں۔“ اس نے ان کے کندھے پر بڑی محبت سے اپنا ہاتھ رکھا تھا۔



ظفر چلا گیا تو وہ واپس اپنے سسرال آگئی تھی۔ سیر نے اس ایک فون کے بعد دوبارہ فون نہیں کیا تھا۔ زرینہ آئی کو اس کا فون نہ آنے پر بہت تشویش تھی۔ اسے گئے دس دن ہو چکے تھے، شروع کے چار پانچ دن اس کی کال کا انتظار کرنے کے بعد انہوں نے خود ہی اسے گھر پر فون کیا مگر وہ گھر پر ملا نہیں پھر اس کا فون آگیا تھا مگر یہ فون صبا کے لیے تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے، جب اس کے کمرے میں فون کی بیل بجی تھی۔ اس نے ریسپور اٹھایا تو دوسری طرف سیر تھا۔

”آپ اتنے دنوں سے کہاں ہیں؟ یہاں پر سب آپ کی طرف سے بہت فکر مند ہیں۔“ اس کی آواز سنتے ہی صبا نے کہا۔

”یہیں ہوں، مجھے کہاں جانا ہے اور جو میرے لیے فکر مند ہیں ان سے کہو، میرے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”کیا ہوا سیر! آپ سمیعہ سے ملے؟“ اس کا سوال سن کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”میں بہت پریشان ہوں صبا! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا کروں۔ سمیعہ مجھ سے بہت بری طرح ناراض ہو گئی ہے۔“ وہ بہت مایوس اور پریشان لگ رہا تھا۔

”آپ فکر نہیں کریں، وہ آہستہ آہستہ ساری بات سمجھ جائے گی۔ اسے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہو جائے گا۔ آپ اسے تھوڑا سا وقت دیں۔“ اس نے اسے تسلی دینی چاہی تو وہ جواباً ”غصے سے بولا۔

”بات تو وہ تب سمجھتی اگر میری کوئی بات اس نے

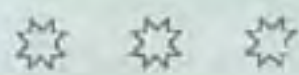


سنی ہوتی۔ وہ نہ مجھ سے مل رہی ہے نہ فون پر بات کر رہی ہے۔ اسے میری کسی مجبوری سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے نزدیک مجھ سے ناراض ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ میں شادی کر کے آیا ہوں، چاہے کسی بھی وجہ سے۔ وہ میری آواز سن کر فون بند کر دیتی ہے، اپنے گھر میں مجھ سے ملنے سے انکار کر دیتی ہے، اپنے آفس جانا اس نے چھوڑا ہوا ہے۔ میں اس سے کہاں ملوں، کیسے اپنی پوزیشن کلیئر کروں۔“

”وہ آپ سے محبت کرتی ہے سفیر! جن سے محبت کی جاتی ہے پھر ان سے زیادہ عرصہ ناراض نہیں رہا جاسکتا۔ اسے آپ پر بہت اعتماد تھا، ابھی چونکہ اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی ہے، اس لیے وہ اس طرح ری ایکٹ کر رہی ہے مگر وہ زیادہ دنوں تک آپ سے ناراض رہ نہیں پائے گی۔ وہ آپ کی مجبوری اور آپ کے عذر کو قبول کرتی ہے یا نہیں، بہر حال وہ آپ کی معذرت کو ضرور قبول کر لے گی۔ آپ تھوڑے دن انتظار کریں، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو صبا! مجھے اس طرح مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“ اس کے بعد اس نے مزید تین چار منٹ اس سے بات کی اور پھر فون بند کر دیا تھا۔ صبح اس نے ناشتے کی میز پر زرینہ آنٹی کو سفیر کے فون کے بارے میں بتایا۔

”وہ آفس میں تھوڑے بڑی تھے، اس وجہ سے فون نہیں کر رہے تھے۔“ بیٹی کی خیریت کی اطلاع ملنے پر سکون اور اطمینان محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اس بات سے تھوڑی سی تکلیف بھی پہنچی کہ اتنے دنوں بعد اس نے فون کیا تو اپنی بیوی کو ماں کو نہیں۔



آنٹی کئی سالوں سے اپنا ذاتی اسکول بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہی تھیں۔ شادی کی مصروفیات کے پیش نظر انہوں نے اسکول جانا چھوڑا ہوا تھا مگر اب وہ دوبارہ

اسکول جانے لگی تھیں۔

جب سے انہوں نے اسکول جانا شروع کیا تھا، وہ گھر میں اکیلی بہت بوریٹ محسوس کر رہی تھی۔ آنٹی تین بجے واپس آئیں۔

”تم کھانا کھا لیتیں۔ میرے انتظار میں بھوکی کیوں بیٹھی رہیں۔“ ان کا موڈ صبح کی بات پر آف تھا مگر پھر بھی انہوں نے اس سے پیار سے ہی بات کی تھی۔

”آنٹی! اکیلے کھانا کھانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔“ اس نے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے انہیں جواب دیا۔ طلحہ میڈلسن بڑھ رہا تھا۔ اس کے آنے جانے کے کوئی اوقات مقرر نہیں تھے، اسی وجہ سے وہ ان لوگوں کے ساتھ لنچ پر موجود نہیں تھا۔ لنچ کے دوران ہی اس نے آنٹی سے اپنی بوریٹ کا ذکر کیا۔ انہوں نے اس کا مسئلہ بڑی سنجیدگی اور توجہ سے سنا پھر کچھ سوچ کر اس سے بولیں۔

”تم میرے ساتھ اسکول چلا کرو۔ کہیں جاب کرنے سے بہتر یہ نہیں کہ اپنا اسکول سنبھالنے میں میری مدد کرو۔“

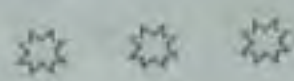
”ٹھیک ہے آنٹی! میں کل سے آپ کے ساتھ چلوں گی۔“ اور پھر اگلے روز سے وہ ان کے ساتھ اسکول جانے لگی۔

گھر پر ماما وغیرہ نے بھی اس کے اس اقدام کو بہت سراہا تھا۔ خاص طور پر ار تضحیٰ نے اس کی بہت حوصلہ افزائی کی تھی۔

”نائن ٹو فائیو والی جاب کے مقابلے میں یہ کام بہت بہتر ہے۔ ہمارے کلچر میں لڑکیوں کے لیے پینچنگ سے اچھا کوئی پرو فیشن نہیں ہو سکتا۔“ سفیر کی فون کالز آرہی تھیں مگر بہت مختصر۔ وہ اپنے مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ زرینہ آنٹی سے بھی وہ بہت مختصر گفتگو کیا کرتا تھا۔ وہ مزید بات کرنے کے لیے تڑپتی ہی رہ جاتی تھیں اور وہ ”اچھا ماما! خدا حافظ“ کہہ کر فون بند کر دیتا۔ اس نے صبا کو پیسے بھیجے تھے۔ اگرچہ وہ یہ بات جانتا تھا کہ اسے اس کے پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ ماما یا اس کی ہر ضرورت بہت اچھی طرح پوری کر سکتے تھے مگر شاید

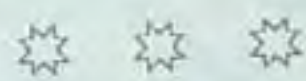


وہ اپنی ذمہ داری نبھانا چاہتا تھا۔ وہ اس کے لیے بھیجنے پر اتنی خوش نہیں ہوئی تھی جتنا انکل ہوئے تھے۔



ظفر کے جانے کے چھ مہینے بعد عاصمہ بھی اس کی پاس چلی گئی تھی۔ ماما اور ڈیڈی بسو کے جانے پر اس کو تو ہوئے تھے مگر انہیں اس بات کی بھی خوشی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے پاس جا رہی تھی اور اسے اس کے پاس رہنا چاہیے تھا۔

وہ ہر ویک اینڈ اپنے میکے میں گزارتی باقی سارا ہفتہ اس کا اسکول کی مصروفیت کی نذر ہو جاتا تھا۔ اس دوران صرف فون پر گھر والوں سے بات ہوتی یا ان لوگوں میں سے کوئی اس سے ملنے آ جاتا لیکن چھٹی کا دن وہ وہیں پر گزارتی تھی۔ معاذ اس بات پر سمجھوتا کر چکا تھا کہ اب ہالہ جانی (خالہ) اس کے ساتھ نہیں رہیں گی مگر جب وہ گھر آتی تو وہ اس سے اسی والہانہ انداز میں ملتا۔ اپنے اسکول کی ایک ایک بات اسے بتاتا۔ وہ اس سے فرمائشیں کر کر کے مختلف پونمز سنتی۔ وہ اس سے اپنی صدیں پوری کرواتا رات کو اس کے پاس سوتا۔ ماما کہتی تھیں اس کے آنے پر معاذ اتنا ضدی اور بدتمیز ہو جاتا ہے ورنہ باقی سارا ہفتہ وہ بہت اچھا بچہ بنا رہتا ہے۔ ارٹھنی نے اس کے لیے ایک گورنس رکھ لی تھی۔ ماما اس کی ضد کے آگے چپ تو ہو گئی تھیں مگر پھر بھی وہ معاذ کے زیادہ تر کام خود ہی کیا کرتی تھیں۔



سفیر کا بہت دنوں سے فون نہیں آیا تھا۔ گھر میں سب ہی کو اس کے فون نہ کرنے پر تشویش تھی۔ وہ خود نہ گھر کے فون پر نہ موبائل پر وہ کہیں نہیں مل رہا تھا۔ وہ گھر پر نہیں ملا تو آفس فون کیا گیا۔ وہاں سے پتا چلا کہ وہ آج کل چھٹیوں پر ہے۔ اس خبر سے سب کی تشویش مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ چھٹیوں پر تھا اور گھر پر موجود نہیں تھا۔ یعنی وہ کہیں گیا ہوا تھا مگر کہاں؟

سب سفیر کی طرف سے پریشان تھے۔ اس نے

اسے E-mail بھیجی۔ یہ سوچ کر کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے کم از کم اپنی Mails تو ضرور چیک کرتا ہوگا۔

”سفیر! آپ کہاں ہیں؟ ہم سب آپ کے لیے بہت پریشان ہیں۔“ اس کا پیغام بہت مختصر سا تھا۔ اس کا جواب تیسرے دن سفیر کی فون کال کے ذریعے موصول ہو گیا تھا۔

”شکر آپ ملے تو۔ ہم لوگ بہت پریشان ہو گئے تھے۔“ اس کی آواز سنتے ہی وہ بولی وہ جواباً خاموش رہا تھا۔

”آپ تھے کہاں؟“ اس نے مزید پوچھا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

”میں نے اور سمیعہ نے شادی کر لی ہے۔ ایک مہینہ ہو گیا ہماری شادی کو۔ ہم دونوں ہنی مون کے لیے یورپ گئے ہوئے تھے۔ کل ہی واپس آیا ہوں۔ ابھی ابھی تمہاری mail پڑھی تھی۔ اسی لیے فون کیا ہے۔“

”آپ دونوں کی شادی ہو گئی زبردست یہ تو بہت ہی اچھی خبر ہے۔ بہت مبارک ہو۔ سمیعہ کو بھی میری طرف سے مبارکباد دیجئے گا۔ دیکھیں میں نے آپ سے کہا تھا نا وہ زیادہ دنوں تک اپنی ناراضی برقرار نہیں رکھ پائے گی۔ اسے ماننا ہی تھا اور وہ مان گئی۔“ اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اسے مبارکباد دی تھی۔ وہ جواب میں ایک مرتبہ پھر خاموش رہا۔

”کیا ہوا آپ خاموش کیوں ہیں؟“

”صبا! تم اتنی اچھی مت بنا کرو۔ مجھے تم سے شرمندگی ہونے لگتی ہے۔“ وہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

وہ اس کے لہجے پر کچھ حیران سی ہوئی۔

”اچھا سنو اب تم مجھے گھر پر فون مت کرنا۔ میں نے تمہیں سمیعہ کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ میرے بارے میں بہت پوزیٹو ہے۔ تمہارا فون آیا تو اسے بہت برا لگے گا۔ مجھے E-mail بھیجنا۔ اسے میرا Password پتا ہے میں اس سے اپنی کوئی چیز نہیں چھپاتا۔ اگر اس نے تمہاری mail دیکھ لی تو مجھے



بہت پر اہم ہو جائے گی۔ ابھی بھی تمہاری mail میں نے پڑھتے کے ساتھ ہی Delete کر دی ہے۔ کبھی کوئی بات ہو تو تم مجھے آفس فون کر سکتی ہو۔ وہ بھی کوئی بہت خاص بات ہو تب ورنہ میں خود ہی تمہیں فون کیا کروں گا۔ اس کا لہجہ جیسے ہی اور دو ٹوک قسم کا تھا۔

”آپ فکر مت کریں۔ میں نے پہلے ہی آپ سے کہا تھا کہ میری وجہ سے آپ دونوں کی زندگی میں کوئی رابلنٹ نہیں آئیں گی۔“ اس نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی کروائی تھی۔

”ٹھیک ہے پھر میں فون بند کر رہا ہوں۔ کل یا برسوں میں تمہیں پیسے بھی بھیج دوں گا۔ خدا حافظ۔“ اس کا جواب سننے بغیر اس نے فون بند کر دیا تھا۔

وہ کمرے سے باہر نکل کر لاؤنج میں آئی تو زینہ آئی اور انکل وہاں بیٹھے نظر آئے۔ وہ دونوں سفیر کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اس کی اتنی طویل کم شدگی ان دونوں کے لیے بہت پریشان کن تھی۔

”آؤ بیٹا! انکل اسے دیکھ کر شفقت بھرے انداز میں مسکرائے۔ وہ ان دونوں کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

”سفیر کا فون آیا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے۔“ اس اطلاع پر ان دونوں کا چو نکنا لازمی تھا۔

”کہاں غائب تھے حضرت اتنے دنوں سے تم نے پوچھا نہیں؟“ انکل اس کی خبر ملنے پر قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولے۔ آئی بیٹے کی خیریت پوچھنے کے بجائے بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔

سفیر اور صبا کی شادی شدہ زندگی کے اس گیارہ ماہ کی مختصر مدت میں یہ دوسرا موقع تھا جب انہیں صبا سے ساسوں والی رویتی جیلسی ہوئی تھی۔ بیٹے نے اتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد انہیں فون کرنے اور اپنی خیریت سے آگاہ کرنے کے بجائے اپنی بیوی کو فون کرنا پسند کیا تھا۔

”وہ ٹورنٹو میں نہیں تھے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”یہ کہنے سے بغیر غائب ہونے کی اچھی عادت ہے۔ تم نے اسے کچھ کہا بھی کہ خاموش رہیں؟“ وہ بیٹے سے

خفا نظر آئے۔

”انہوں نے سمیعہ سے شادی کر لی ہے۔ وہ دونوں گھومنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔“ اس نے اسی پرسکون لہجے میں انہیں یہ خبر سنائی۔

”کون سمیعہ؟“ آئی نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

جب کہ انکل ایک دم صوفے پر سے اٹھ گئے۔ تقریباً چلاتے ہوئے انہوں نے ”کون سمیعہ؟“ کہا تھا۔

”سمیعہ! مارگریٹ وہ مسلمان ہو گئی ہے۔ اب اس کا نام سمیعہ ہے۔“

وہ چند لمحوں پہلے اس لڑکی سے حسد کر رہی تھیں اور اب وہ خود میں اس سے نگاہیں ملانے کی ہمت نہیں پا رہی تھیں۔ انکل کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ بہت ندھال سے انداز میں وہ صوفے پر گر گئے۔ آئی کی طرح انہوں نے بھی اس سے نظریں نہیں ملائی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بالکل چپ بیٹھے تھے۔ (باقی آئندہ)

زی ٹی وی کا مشہور پروگرام

## کھانا خزانہ

نیا ایڈیشن

سنجیو کیپور

خوبصورت تصاویر کے ساتھ

حسین و خوبصورت گیٹ اپ

قیمت صرف = 250 روپے

ملنے کا پتا:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی



بالآخر میں اور ارضی کی شادی ہو گئی۔ اور صبا اپنے جذبات کا لگاؤ نہٹ کر خاموش ہو گئی۔ وہ احتجاج بھی نہیں کر سکی۔ اس لیے کہ ارضی نے ہی اسے قابلِ توجہ نہیں سمجھا تھا۔ وہ اسے چھوٹی بچی ہی سمجھتا رہا۔ جبکہ وہ اپنی عمر سے کہیں بڑے کا سفر طے کر چکی تھی۔ شادی کی رات، جذبات کی شدت میں بے اختیار نہیں کے مرنے کی دعا مانگی۔ شادی کے بعد میں اور ارضی لا بور طے گئے۔ میں اسے اپنی خیریتوں کی سب سے بڑی دشمن نظر آتی ہے اور پھر پھینوں میں اسے بادل خواستہ سب کے اصرار پر نہیں کے پاس لاہور آتا پڑا۔

۳

### تیسری قسط

وہ آنٹی کی صدیے اور نم سے نہ صبا کی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے فوراً ہی ان کے لیے پانی لے آئی تھی۔

”آنٹی پانی پی لیں۔“ اس نے گلاس ان کے لبوں سے لگایا۔

”آپ حوصلہ کریں آنٹی! یہ شادی سفیر کو لازمی کرنا تھی۔ جو چیز ہونا طے تھی اس کے ہو جانے پر افسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”سفیر نے اچھا نہیں کیا۔ بالکل اچھا نہیں کیا۔ صبا! ہمیں محاف کرو۔ ہم نے تمہارے ساتھ بہت بڑی زیادتی کر ڈالی ہے۔“ وہ اسے اپنے گلے سے لگا کر رونے لگیں۔

”سب ان کی وجہ سے ہوا ہے ان کی ضد اور غصے کی وجہ سے۔“ اولاد کو اپنی رعایا سمجھتے ہیں۔ مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں ان کا ساتھ دوں۔ یہ نہیں سوچا کہ وہ پیشابھی تو آخر ان ہی کا ہے۔ کیا اس میں ان جیسی ضد اور غصہ نہیں ہو گا۔ ان کی ضد اور غلط فیصلے نے ہم سب کو تو نقصان پہنچایا ہی ہے۔ مگر سب سے زیادہ تمہارا نقصان ہوا ہے۔ تمہارے ماں باپ کو کیا منہ دکھاؤں گی میں صبا! بڑے دعوے کر کے لائی تھی تمہیں ان کے پاس سے بہت وعدے کیے تھے۔ یہ تھا وہ سکھ۔“ انہوں نے اسے خود سے دور ہٹاتے ہوئے اب بالکل پر نظر کرنا ممانی تھیں۔

\*\*\*

دیکھ لیں یہ وہ ہمیشہ کی طرح اپنے میکے جانے لگی تو

”ہاں“ ہم دونوں بھی بالکل خیریت سے ہیں۔“ وہ شاید اب فون بند کرنا چاہ رہا تھا اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے اس نے جلدی سے یہ سوچ کر کہ پھر وہ پتا نہیں کب فون کرے جلدی سے پوچھا۔

”آپ دونوں نے کراچی آنے کے بارے میں کیا سوچا؟“

”نی الحال کافی طویل عرصہ تک ہمارا کراچی آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بہت صاف اور دو ٹوک انداز میں انکار کیا تھا۔ وہ اس کا اتنا واضح انکار سن کر سن رہی تھی۔ وہ اس سے وعدہ کر کے گیا تھا کہ ضرور واپس آئے گا اور اس نے اسے ایک مرتبہ یہ بھی بتایا تھا کہ وہ وعدے سے پھر نہ والا انسان نہیں ہے۔

”لیکن آپ نے تو کہا تھا؟“ بہت ہی مردہ لہجے میں اس نے بولنے کی کوشش کی مگر سفیر نے اس کی بات سچ میں ہی کٹ دی تھی۔

”ہاں مجھے یاد ہے کہ میں نے کیا کہا تھا۔ اس وقت میرا ارادہ بھی تھا آنے کا۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ مگر سید پاکستان آنے کے لیے تیار نہیں۔ میں نے اس سے محبت کی ہے میں اس کا دل دکھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر کبھی وہ خوشی سے راضی ہو گئی تو ہم لوگ پاکستان آجائیں گے۔ ورنہ جہاں وہ رہنا چاہے میں وہیں اس کے ساتھ رہوں گا۔“ اس کا لہجہ بہت مستحکم اور دو ٹوک تھا۔

اسے سفیر کے فون کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چار دن بعد ہی اس کا فون آیا تھا۔ وہ آنٹی سے بات کرنا چاہتا تھا، مگر وہ اس سے سخت ناراض تھیں سوا انہوں نے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ فون چونکہ اس نے لے لیا تھا۔ اس لیے سفیر تک آنٹی کا انکار بھی اسے پہنچا تھا۔

”آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ لیٹی ہوئی ہے۔ آپ بعد میں فون کر لیجئے گا۔“ اس نے براہ راست یہ کہنے کے بجائے کہ وہ اس سے ناراض ہیں اور بات نہیں کرنا چاہتیں مکمل مول جواب دیا تھا۔ تب بھی وہ ساری بات سمجھ گیا تھا۔

”تم شوا کسی ہو؟“ اس بارے میں مزید کوئی بات کے بغیر اس نے معمول کے انداز میں اس کی خیریت پوچھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ اور سید کیسے ہیں؟“ اس نے بھی جواباً خیریت پوچھی تھی۔

”ہاں“ ہم دونوں بھی بالکل خیریت سے ہیں۔“ وہ شاید اب فون بند کرنا چاہ رہا تھا اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے اس نے جلدی سے یہ سوچ کر کہ پھر وہ پتا نہیں کب فون کرے جلدی سے پوچھا۔

”آپ دونوں نے کراچی آنے کے بارے میں کیا سوچا؟“

”نی الحال کافی طویل عرصہ تک ہمارا کراچی آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بہت صاف اور دو ٹوک انداز میں انکار کیا تھا۔ وہ اس کا اتنا واضح انکار سن کر سن رہی تھی۔ وہ اس سے وعدہ کر کے گیا تھا کہ ضرور واپس آئے گا اور اس نے اسے ایک مرتبہ یہ بھی بتایا تھا کہ وہ وعدے سے پھر نہ والا انسان نہیں ہے۔

”لیکن آپ نے تو کہا تھا؟“ بہت ہی مردہ لہجے میں اس نے بولنے کی کوشش کی مگر سفیر نے اس کی بات سچ میں ہی کٹ دی تھی۔

”ہاں مجھے یاد ہے کہ میں نے کیا کہا تھا۔ اس وقت میرا ارادہ بھی تھا آنے کا۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ مگر سید پاکستان آنے کے لیے تیار نہیں۔ میں نے اس سے محبت کی ہے میں اس کا دل دکھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر کبھی وہ خوشی سے راضی ہو گئی تو ہم لوگ پاکستان آجائیں گے۔ ورنہ جہاں وہ رہنا چاہے میں وہیں اس کے ساتھ رہوں گا۔“ اس کا لہجہ بہت مستحکم اور دو ٹوک تھا۔

اپنے وعدے سے مکر جانے پر قطعاً ”کوئی تاسف اس لہجے میں نہ تھا۔ اپنی بات مکمل ہوتے ہی اس نے بغیر خدا حافظ کے فون بند کر دیا۔ وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

\*\*\*

اس نے بابا کے استفسار پر سفیر کی واپسی تین چار مہینے بعد کی بتائی تھی۔ جب کہ یہاں تو سات مہینے گزر چکے تھے۔ یعنی اس کی شادی کو ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ اس کے ہر چکر پر بابا ڈیڈی یا ماماں سے کوئی نہ کوئی



انہیں تو میرا خیال ہے بابا سے بھی زیادہ خوشی ہوگی۔ اور  
 رہا ہوں کہ کہیں وہ خوشی سے پاگل ہی نہ ہو جائیں۔  
 وہ گھر کی طرف جانے والے راستے پر روال دوال بڑے  
 ہلکے پھلکے انداز میں بول رہا تھا۔  
 اس کے پورے جسم پر کپکپاہٹ طاری تھی  
 آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔  
 ”میں گھر نہیں جاؤں گی ار ترضی بھائی! پلیز مجھے گھر  
 مت لے کر جائیں۔“ سیزنگ پر رکھے اس کے ہاتھ  
 پر اس نے اپنا ٹھنڈا پنجہ رکھ کر چلاتے ہوئے کہا۔ وہ  
 مٹاؤ ڈیڈی! بابا کسی کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔  
 اس نے اپنے ہاتھ پر رکھا اس کا ہاتھ بڑے غصے  
 سے جھٹک کر دوڑھا دیا تھا۔  
 ”کیوں نہیں جاؤ گی تم گھر؟ اپنی آنکھوں سے دیکھنا  
 سارا تماشا۔ بہت مزہ آئے گا تمہیں۔“ وہ سرد آواز میں  
 بولا۔ ار ترضی نے گاڑی گھر کے پورچ میں لا کر روکی  
 بہت تیزی سے وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر  
 نکلا اور پھر اس کی طرف آکر اسے ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے  
 اتارا اور گھینٹا ہوا اندر لے آیا تھا۔ ان کے اندر قدم  
 رکھتے ہی سب کا موبائل بجا تھا۔ ار ترضی نے اس کا بیک  
 چھیننے والے انداز میں اس کے ہاتھ سے لیا اور پھر اس  
 میں سے موبائل نکال کر اسے آف کر دیا۔ لاؤنج خالی  
 رہا تھا۔ شاید ماما کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آرام  
 کر رہی تھیں اور معاذ بھی سو رہا تھا۔  
 اس کے بیٹھنے کے چند سیکنڈز بعد ہی لاؤنج میں  
 رکھے فون کی کھنٹی بجی تھی۔  
 ”جی صابیر سے ساتھ آئی ہے۔“ ار ترضی کل  
 ریپو کر رہا تھا۔  
 ”مجھے پتا تھا آپ کی کل ہے اسی لیے میں نے  
 موبائل آف کر دیا تھا۔“ اس کا انداز گستاخانہ تھا۔  
 ”وہ بیٹیں پر ہے مگر آپ سے بات نہیں کرے گی۔  
 بہتر ہوگا اگر آپ کچھ دنوں تک یہاں رابطہ کرنے کی  
 کوشش نہ کریں۔ ہم آپس میں گفتگو کر لیں پھر آپ  
 سے بات ہوگی۔“ بہت دیر سنی سے انہیں جواب دیتے  
 ہوئے اس نے ریپو سن ڈیا۔

وہ صوفے پر گر سی گئی۔ اسے سانس لینے  
 دشواری ہو رہی تھی۔  
 ”کیا لگتا تھا تمہیں؟ یہ ڈر لہہ کب تک چلا  
 تھیں تم؟ کیا ہم لوگ تمہیں احمق اور پاگل نظر  
 تھے؟ یا اتنے لاچار کہ کینڈا نہ جاسکتے ہوں۔“  
 انداز ترک کر کے لب و براہ راست غصے کا اظہار  
 تھا۔ وہ صوفے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند  
 سانس لینے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ ار ترضی ایک  
 اس پر ڈالتے ہوئے اٹھا اس نے اسے سی آن کہا  
 ریشماں کو آواز دے کر بلایا۔  
 ”ایک گلاس جوس لے کر آؤ فوراً۔“  
 آنکھیں بند کیے ار ترضی کی تشویش میں ڈوبی آواز  
 دی۔ پھر اسے جلد ہی ریشماں کی آواز آئی۔ وہ  
 گلاس ار ترضی کو دے رہی تھی۔  
 ”جوس پیو۔“ وہ اس کے برابر میں صوفے پر  
 تھا۔ وہ اس کی آواز سن رہی تھی۔ اس کے لیے  
 ابھی بھی غصہ اور ناراضی تھی، مگر اس غصے کے  
 پیچھے چھپی ہوئی تشویش بھی محسوس کی جاسکتی  
 اس نے گلاس اس کے منہ سے لگا دیا تھا وہ زبردستی  
 کے منہ میں جوس اندر لے رہا تھا۔ اس نے کوئی مزہ  
 نہیں کی تھی۔ وہ جوس پینے لگی تھی۔ اس  
 آنکھیں بند کیے ہوئے وہ پورا گلاس خالی کر چکی  
 سے اٹھ گیا۔  
 ”مگر اتنے کی ہمت نہیں ہو رہی تو بیٹیں لیٹ  
 چاہو تو کچھ دیر سو جاؤ۔ خود کو تیار کر لو آئے والے  
 کے لیے۔ جو کچھ ہونے والا ہے وہ تو تمہیں ہر مل  
 فیس کرنا ہی ہے۔“ وہ بے رخی سے اسے مشورہ  
 ہوا لاؤنج سے نکل گیا تھا۔  
 وہ ماما اور ار ترضی کے ساتھ بیٹھی شام کی چائے  
 رہی تھی۔ جب بابا اور ڈیڈی گھر آئے ڈیڈی کی  
 ایک نظر ڈالتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ بابا  
 سب کچھ بتا چکے ہیں۔ اس نے ڈیڈی کی آنکھوں  
 اس سے پہلے ایسا کرب اور ایسی تسکین کب  
 تھی؟ شمن کی موت پر پہل شمن کی موت پر اس

کو اتنا ہی اندھا حال اور ٹوٹا ہوا دکھا تھا۔ وہ خشک اور  
 انہیں لیے ڈیڈی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماما  
 کی طرف تشویش سے دیکھ رہی تھیں۔  
 اس میں ذرا طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ فکر کی  
 بات نہیں ہے۔ تھوڑی دیر ریٹ کرے گا تو  
 صحت منسل جائے گی۔ ڈیڈی کی جگہ بابا نے ماما کو  
 دیا تھا۔  
 ڈیڈی نے بھی زبردستی مسکرا کر اپنی طبیعت کے  
 منہ میں ان کی فکر مندی دور کی اور پھر اپنے کمرے  
 چلے گئے۔ ماما بھی ان کے پیچھے کمرے میں چلی  
 گئیں۔  
 ڈیڈی ہو صابا! بابا سے پہلے ہی دیکھ چکے تھے مگر  
 اب کیا تھا۔ ان کا لہجہ ار ترضی کی طرح طنزیہ  
 سے بھرا ہوا نہیں تھا۔ اس میں ویسی ہی محبت  
 تھی جوتھ ہوا کرتی تھی۔  
 ”کیا ہوں بابا!“ اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔  
 ”کی مہائے کے کھونٹ لیتے ہوئے بڑے غور سے  
 دیکھ رہا تھا۔  
 رات کے کھانے تک اپنے کمرے ہی میں  
 تھے۔ ماما نہیں سوتا دیکھ کر تھوڑی دیر بعد واپس  
 کمرے آئی تھیں۔ بابا بھی وہیں آکر بیٹھ گئے۔ وہ  
 رات انداز میں ماما اور صابا سے باتیں کر رہے  
 تھے۔ اسی طرح صابا سے وہ لوگ ہمیشہ آپس میں کیا  
 کرتے تھے۔ وہ چپ بیٹھی تھی مگر بابا زبردستی اسے  
 کر کے بولنے پر مجبور کر رہے تھے۔ معاذ  
 کی لڑائی ہاتھ میں لیے اپنی اسپورٹس کار اڑاتا  
 تھا۔ ار ترضی کے کوئی ممان آئے ہوئے تھے وہ  
 روم میں بیٹھان سے باتیں کر رہا تھا۔ کھانے  
 کے پہلے اس کے ممان واپس گئے تھے وہ سب  
 شمن پر اسی کا انتظار کر رہے تھے وہ فون کی قتل  
 شمن مرنے رک گیا۔  
 ”آج آج زحمت مت کیجئے۔ کسی اور دن  
 اسے گھر آج ہم لوگ بہت مصروف ہیں۔“  
 بہت مہذبانہ ہونے کے باوجود گستاخی کا عنصر

لیے ہوئے تھا۔ ڈانٹنگ روم میں وہ سب اس کی آواز  
 سن رہے تھے۔ سوائے ماما کے وہ سب جانتے تھے کہ وہ  
 اس وقت کس سے بات کر رہا ہے۔ ماما معاذ کی پلیٹ  
 میں کھانا ڈالنے میں مصروف تھیں۔  
 کھانے کے بعد ان سب نے ساتھ بیٹھ کر چائے  
 پی۔ معاذ کی گورنر اسے سلانے کے لیے کمرے میں  
 لے گئی تو ماما بھی ان لوگوں کو شب بخیر کہتی اس کے  
 ساتھ چلی گئیں۔  
 ان کے جانے کے بعد لاؤنج میں وہ چاروں رہ گئے  
 تھے۔ وہ تینوں بالکل خاموش تھے۔ ان سب کو ماما کے  
 سو جانے کا انتظار تھا۔ کچھ دیر بعد جب ار ترضی کو یقین  
 ہو گیا کہ وہ سو گئی ہوں گی تو وہ اٹھا اور لاؤنج کے تمام  
 دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں۔ وہ گم صم سے انداز  
 میں اس کی ساری کارروائی کو دیکھ رہی تھی۔ بابا نے فی  
 دی بند کر دیا۔ ڈیڈی نے اپنے ہاتھوں پر جی لگا دیں اٹھا  
 کراتی دیر میں پہلی مرتبہ صابا کی طرف دیکھا تھا۔ ان کی  
 آنکھوں میں نمی تھی۔ کرب تھا۔ اذیت تھی۔ وہ بہت  
 بوڑھے اور کمزور لگ رہے تھے۔  
 ”صابا! مجھے معاف کر دو، میں تمہارے لیے درست  
 فیصلہ نہ کر سکا۔ ایک بہترین انسان تمہارے لیے منتخب  
 نہ کر سکا۔ اپنی طرف سے میں نے اور تمہاری ممان نے  
 ایک بہترین رشتہ تمہارے لیے چنا تھا۔ ہماری سوچ  
 غلط ثابت ہو گئی۔ خاندان کے لوگوں نے وہ دھوکا دیا کہ  
 کیا کوئی غیر دے گا۔ اپنے ڈیڈی کو معاف کر دینا۔“ وہ  
 آنکھوں میں درد و غم کا طوفان لے بیٹی سے معافی مانگ  
 رہے تھے۔ اس کی زندگی میں یہ دن بھی آنا تھا کہ ڈیڈی  
 کو اس سے معافی مانگنا پڑی۔ وہ کلب کر رہی تھی۔  
 ”تمہارا اور پلیٹ کا کوئی قصور نہیں ہے شفق! سب  
 ماں باپ کی طرح تم دونوں بھی اپنی لولہ کی بہتری ہی  
 چاہتے تھے۔ تم دونوں نے سوچ سمجھ کر ایک بہترین  
 فیصلہ کیا تھا۔ اس رشتے میں ایسی کوئی غلطی بظاہر نظر  
 نہیں آ رہی تھی جو انکار کرنے کا سبب بنتی۔ بابا نے ان  
 کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مدبرانہ انداز میں انہیں  
 سمجھایا۔



انہیں تو میرا خیال ہے پلایا سے بھی زیادہ خوشی ہوگی۔ ڈر رہا ہوں کہ کہیں وہ خوشی سے پاگل ہی نہ ہو جائیں۔“ وہ گھر کی طرف جانے والے راستے پر رواں دواں بڑے پلکے پھلنے انداز میں بول رہا تھا۔

وہ صوفے پر گر سی گئی۔ اسے سانس  
دشوار ہی ہو رہی تھی۔

یہ نذر حاصل اور ٹوٹا ہوا دیکھا تھا۔ وہ خشک اور  
سب سے ٹائیڈی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ممّا

لیے ہوئے تھا۔ ڈاکٹنگ روم میں وہ سب اس کی آواز سن رہے تھے۔ سوائے ماما کے وہ سب جانتے تھے کہ وہ



”ہم نہیں سمجھ سکے تھے مگر یہ تو سب کچھ جان چکی تھی۔ اسے شادی کے اول روز سفیر نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا۔ آپ اس سے پوچھیں یہ کیوں خاموش رہی۔ کیوں نہیں ان کا جھوٹ اور دھوکا ہمارے سامنے عیاں کیا۔ کیوں نہیں اسی روز گھر آکر ہمیں بتایا کہ یہ بات ہے؟“ ار تفضی نے الزام عائد کرنے والے انداز میں کہا۔

”محض اس لیے کہ ہمیں دکھ نہ ہو۔ واہ کیا خوب جواز ہے یہ۔ ایسی باتیں کتنے عرصے تک چھپ سکتی ہیں کیا اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ سر جھکا کر خود پر لگنے والے الزامات سن رہی تھی۔

”ار تفضی! صبا کو یوں مت کہو۔“ بابا نے اسے ٹوکا۔  
”میں کیوں اسے کچھ نہ کہوں بابا! آخر کیوں؟ کیا اسے احساس ہے اس بات کا کہ اس نے ہم سب کے ساتھ کیا کیا ہے۔ کیا سمجھتی ہے یہ خود کو؟ کسی المیہ ناول کا مرکزی کردار۔ صبر اور ایثار کا پیکر اسے بتائیں کہ حقیقی زندگی میں اس طرح کی ہیروئیز کو سروں پر بٹھانے کے بجائے پیروں تلے روند ڈالا جاتا ہے۔ بے حد غصے میں تھا۔

”وہ شخص کس طرح اس کا ذکر کر رہا تھا۔ جیسے یہ زبردستی اس کے سر پر مسلط ہے۔ اور صرف اس کی خواہش پر اس نے یہ رشتہ برقرار رکھا ہوا ہے ورنہ کب کا ختم کر چکا ہوتا۔ کیا اس کے اندر عزت نفس اور خودداری بالکل ہی ختم ہو گئی ہے۔ اسے سفیر کے ساتھ اتنا شرمناک معاملہ کرتے ہوئے ذرا سی بھی بے عزتی محسوس نہیں ہوئی۔ ان لوگوں نے اگر ہمیں دھوکا دیا ہم سے جھوٹ بولا تو اس نے بھی ان کی پوری پوری مدد کی ہے۔ یہ اگر اسی روز سب کچھ بتا دیتی تو پتا چلتا انہیں کہ کسی کی بیٹی کی زندگی سے کھیل کر انہوں نے خود اپنی عزت کو داؤ پر لگایا ہے۔“ وہ مخاطب بابا سے تھا مگر دیکھ اسی کو رہا تھا۔

”جو ہونا تھا وہ ہو چکا ار تفضی! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ صبا کو ہمارے علم میں ساری بات لانی چاہیے تھی۔“  
”صبا! تم نے یہ سب چھپا کر صرف خود پر ہی ظلم

نہیں کیا، ہم سب پر بھی ظلم کیا ہے۔“ ڈیڈی نے اس کی طرف بہت دکھ سے دیکھا تھا۔ ان کی آواز بھرا ہوئی تھی۔ اس نے بابا کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

”اس نے ہم میں سے کسی کے بارے میں نہیں سوچا۔ کیا اس کی زندگی صرف اسی کی ہے کہ یہ اس کے ساتھ جو مرضی سلوک کرتی پھرے۔“ بابا سے کہنے لگا۔  
”کسی شخص کی زندگی صرف اسی کی زندگی نہیں ہوتی صبا شفیق! اس ایک زندگی کے ساتھ دوسری بھی سی زندگیاں بھی جڑی ہوتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ تم اپنے لیے کوئی دکھوں سے بھرا ہوا راستہ چن لو اور ہم میں سے کسی کو کوئی فرق نہ پڑے۔ تم اپنے لیے ذلت بھری زندگی کا انتخاب کرو اور ہم سکون سے رہ لیں۔

کسی جگہ تمہاری تذلیل ہو تو وہ تذلیل صرف تمہاری نہیں ہوگی، ہماری بھی ہوگی۔ اور صبا اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ میں کسی جگہ پر بے عزت ہوا تھا۔“  
اس کی آواز میں دکھ بولنے لگے۔ وہ ایک دم ہی صوفے پر سے اٹھ کر لاؤنج سے باہر نکل گیا تھا۔

ساری رات وہ بابا اور ڈیڈی وہیں بیٹھے رہے تھے۔ فجر کی اذان سن کر ڈیڈی وہاں سے اٹھے، ان کے جانے کے بعد بابا بھی صوفے پر سے اٹھنے لگے تو اس نے ان کا بازو پکڑ لیا۔ وہ چونک کر اس کی طرف پلٹے۔  
”بابا! میں علیحدگی نہیں چاہتی، آپ لوگ پکیز میا گھر بسا رہے دیں۔“ وہ ان کا بازو جکڑے التجا کر رہی تھی۔ لاؤنج کے اندر قدم رکھتے ار تفضی نے اس کی بات سن لی تھی اور زندگی میں پہلی مرتبہ اس کا دل ہلکا کہ وہ صبا کے منہ پر کھینچ کر پھٹ مارے۔ بابا واپس صوفے پر بیٹھ گئے۔

”بیٹا! ہر اچھی لڑکی اپنا گھر پسانا چاہتی ہے۔ کوئی لڑکی خوشی سے ایسا فیصلہ نہیں کرتی۔ نہ ہی ماں باپ کو اس سے ایسا چاہتے ہیں۔ مگر کوئی ایسی بات تو ہو جسے بنیاد کر سمجھوتے کے بارے میں سوچا جاسکے۔

گھر شوہر سے ہوتا ہے، تمہارا شوہر تمہارے پاس



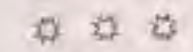
نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہو گا۔ جب گھر بھائی نہیں تو اس کے اچڑنے پر غم کیسا؟" ار تفضلی خاموشی سے لاؤنج سے واپس پلٹ گیا۔ وہ صبا کے رویے کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

اسے احساس ہو گیا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو صبا کے اس رویے کا سبب ہے۔ کوئی بات کوئی وجہ؟ وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اسے احساس ہوا تھا کہ صبا کے رویے کا یہ الجھاؤ الجھی سے نہیں ہے۔ کب سے؟ اس نے بہت سوچا پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ شمن کے بعد سے ہی بہت بدل گئی ہے۔ بالکل کھوئی کھوئی زندگی ہے۔ بزار شروع شروع کی بات دوسری تھی تب شمن کا غم تازہ تھا۔ مگر آہستہ آہستہ وہ سب ہی زندگی کی طرف آگئے تھے۔ لیکن صبا نہیں آئی تھی۔ کیوں؟

صبا کی زندگی میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو وہ ان سب سے چھپاتی تھی۔ وہ اس نتیجے تک پہنچ گیا تھا مگر وہ وجہ کیا تھی اس سے وہ ہنوز لاعلم تھا۔

مما سے یہ بات کب تک چھپائی جاسکتی تھی۔ انہیں یہ بات پتا چلتی ہی تھی۔ بابا نے بڑے مناسب لفظوں میں انہیں اس بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ وہ ساکت رہ گئی تھیں۔

"میری بیٹیوں کو خوشیاں اس میں نہیں آتیں۔ پتا نہیں کس کی نظر لگے ہے ان کی خوشیوں کو۔ ایک کی زندگی میں خوشیاں تھیں تو ان کی عمر بہت تھوڑی تھی۔ اور دوسری کی زندگی میں خوشیاں سرے سے کبھی نہیں ہی تھیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ ڈیڈی انہیں سمجھانے لگے۔



ظفر کا فون آیا تھا بابا اسے صبا کی ضد کے بارے میں بتا رہے تھے۔ وہ مسلسل اسی ضد پر اڑی تھی کہ "میں طلاق نہیں لوں گی۔ چاہے جو بھی ہو جائے" میں اس رشتے کو برقرار رکھوں گی۔" ظفر نے فون پر اسے بلا دیا۔ "ظفر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" بابا نے اس کے

کمرے میں آکر اسے اطلاع دی۔ وہ آج صبح سے اپنے کمرے میں بند تھی۔ وہ خاموشی سے فون سننے آگئی۔

"صبا! اب تم کچھ نہیں بولو گی۔ اب جو فیصلہ ہو گا وہ ہم لوگ کریں گے۔ بہت کھیل چکیں تم اپنی زندگی کے ساتھ۔" اس کا انداز حلیہ تھا۔

"اگر تم ہمارے فیصلے کے خلاف گئیں اور تم نے اب کوئی تمنا کیا تو میں زندگی بھر نہ تمہیں اپنی شکل دکھاؤں گا اور نہ تمہاری طرف دیکھوں گا۔ میں بھول جاؤں گا کہ میری صبا نام کی کوئی بہن بھی تھی۔ تمہاری حماقتوں نے یہ دن دکھایا ہے۔ ورنہ میں اس آلہ کے سچے کامنہ توڑ دیتا۔" وہ خاموشی سے ظفر کی باتیں سن رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے ار تفضلی کی سنی تھیں۔ اس سے بات کر کے وہ دوبارہ بابا سے بات کرنے لگا۔

سب کی یہی خواہش تھی کہ اس کا سفیر فیروز کے ساتھ ہر تعلق ختم کر دیا جائے۔ وہ بے بسی سے سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گھر پر زینہ آئی اور انکل آئے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ سب لوگ ڈرائنگ روم میں تھے۔ وہ برابر والے کمرے میں بیٹھی اپنی قسمت کا فیصلہ ہوتے دیکھ رہی تھی۔ ار تفضلی اسے ڈرائنگ روم میں آنے سے منع کر گیا تھا۔

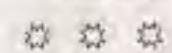
"میں نے کچھ برا سوچ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ میں نے آپ لوگوں سے بہت سی باتیں چھپائیں" میں مانتا ہوں۔ مگر میری نیت بری نہیں تھی۔ مجھے صبا سے بہت محبت ہے۔ وہ میری بہن نہیں بلکہ میری بیٹی ہے۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ آپ لوگ ہمیں ایک موقع دیں۔ میں خود کینڈا جاؤں گا۔ سفیر سے کہوں گا کہ وہ اس عورت کو طلاق دے۔ دیکھوں گا میں کہ وہ میری بات کیسے نہیں مانتا۔ میری بہو صبا ہی تھی اور وہی رہے گی۔ جو عزت اور جو مقام ہم نے اسے دیا ہے وہ کسی اور کو بھی دے ہی نہیں سکتے۔" اس نے انکل کی آواز سنی۔

"صبا اور بیٹی؟ کاش ایسا سمجھا ہوتا آپ نے۔" ار تفضلی کی طنزیہ نواز آئی۔

"اب کسی سمجھوتے کی کوئی گنجائش نہیں ہے فیروز! تم لوگ بے کار میں اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔ یہ ہم سب کا مشترکہ اور بالکل اہل فیصلہ ہے۔ اس میں کسی رد و بدل کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔" بابا انھوں نے اپنے میں دلوں۔

"آپ صبا کو بلائیں" میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" یہ التجائیے آواز زینہ آئی کی تھی۔

"صبا! آپ لوگوں سے نہیں ملے گی۔ اب جو بات بھی ہو گی وہ ہم لوگ کریں گے۔ اس کے سر پر اس کے بڑے موجود ہیں۔ اور وہ اس کی بہتری اس سے زیادہ بہتر انداز میں سوچ سکتے ہیں۔ وہ دونوں میاں بیوی مایوس اور نامراد واپس لوٹ گئے تھے۔



سفیر کا فون آیا تھا وہ صبا سے بات کرنا چاہتا تھا۔ زینہ آئی اور انکل کی طرح اسے سفیر سے بات کرنے سے نہیں روکا گیا۔

"صبا! تمہارے گھر والے بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اس رشتے کا ختم ہو جانا ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے۔" سلام دعا کے فوراً بعد اس نے یہ بات کہی۔

"بہت بوجھ ہے میرے دل پر۔ کوئی قصور نہ ہوتے۔ وہ بھی مجھے ہر لمحہ ایسا لگتا ہے جیسے میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں تمہاری زندگی کو تباہ کر رہا ہوں۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے۔ حالانکہ اس رشتے کو میں نے تمہاری خواہش پر ہی برقرار رکھا تھا۔ پھر بھی میرا دل بکھین رہا ہے۔ میں سیدہ کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنے اور پر سکون انداز میں نہیں گزار پا رہا۔ سیدہ نے مجھ سے اس شرط پر شادی کی تھی کہ میں اس سے طلاق کرنے سے پہلے تمہیں طلاق دے دوں۔ میں تم سے کیے وعدے کا پابند تھا میں نے اپنا وعدہ نبھانے کی خاطر اس سے جھوٹ بولا۔ اگر اسے یہ پتا چل گیا کہ میں نے تمہیں نہیں چھوڑا تو وہ تو پھر زندگی میں بھی مجھے ہتھیار کرے گی ہی نہیں۔ شکر کہ ظفر اور ار تفضلی

یہاں آگئے۔ اور انہوں نے مجھے اس پریشانی سے باہر نکال دیا۔ وہ دونوں مجھ سے یہی کہہ کر گئے تھے کہ میں تمہیں طلاق دے دوں۔" اس کے لہجے میں طمانیت تھی۔

"میں تمہیں طلاق بھیج رہا ہوں صبا! مجھے پتا ہے تمہیں اس بات سے بہت دکھ ہو گا۔ مگر صبا! تمہارے اور میرے لیے بہت اچھا فیصلہ ہے۔ تم میں کسی چیز کی کمی نہیں، زندگی مجھ پر اگر ختم نہیں ہو جاتی۔ دیکھنا تمہیں ایک بہت ہی محبت کرنے والا شخص ملے گا۔ وہ جو تمہاری زندگی کو خوشیوں سے بھر دے گا۔" اس کے الوداعی جملے اسی طرح دعاؤں سے بھرے ہوئے تھے۔ جیسے آپس میں رچی ساهلق رکھنے والے دو افراد ایک دوسرے سے ہوش کے لیے جدا ہونے سے پہلے ادا کیا کرتے ہیں۔



دو شے جس کی سب کو تمنا تھی، آزادی کا وہ پروانہ اس کے ہاتھ میں آیا تھا۔ وہ حیران ہو رہی تھی کہ یہ لوگ کس بات پر اتنے افسرہ ہیں۔ ان کی خواہش پوری ہوئی ہے۔ بجائے خوش ہونے کے وہ لوگ رو رہے تھے۔

اس نے لاؤنج میں لگی اس تصویر کو ایک نظر دیکھا۔ اب وہ اس تصویر کے سامنے کبھی سفیر فیروز کی بیوی کی حیثیت سے جا کر گھڑی نہیں ہو سکے گی۔

"تم نے دیکھا نا" میں نے اس نام کو اپنے نام کے ساتھ جوڑے رکھنے کی کتنی کوشش کی۔ دیکھا نا تم نے؟ مگر یہ لوگ۔ انہوں نے مجھ سے وہ نام چھین لیا۔ میں اپنا گھر بسائے رکھنے کے لیے جس حد تک جاسکتی تھی کتنی مگر سب ختم ہو گیا۔" وہ اس تصویر سے نگاہیں ہٹا کر اپنے ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئی۔

"صبا! اس طرح اکیلی مت بیٹھو۔" وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"مما کے پاس جا کر بیٹھو۔ دیکھو انہیں وہ رو رہی ہیں انہیں چپ کراؤ۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں



سے اٹھانے لگا۔ وہ اٹھ کر اس کے ساتھ ماما کے پاس آئی۔

”میں کہتی تھی تاکہ میرا دل جھوٹ نہیں بول رہا۔ مجھے صبا خوش نہیں لگتی۔“ انہوں نے روتے ہوئے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

وہ چپ چاپ ان کے سینے سے لگی رہی۔ ماں کی زندگی میں یہ دکھ اس کی وجہ سے آیا تھا۔ ماں کی آنکھیں اب اس کی آنسوؤں کی آواز سے آئے تھیں۔

انہی کے منہ سے یہ بات سن کر ماما خوشی سے گنگ رہ گئی تھیں۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا اس کی بات پر۔ ”ماما! ڈیڈی! ان تینوں کے چہروں پر ارغشی کی بات نے خوشیوں کے رنگ کھیر دیے تھے۔ ”مگر کچھ رہے ہوا ارغشی!“ اس نے سر اٹھاتے میں ہلایا تو وہ رو پڑی تھیں۔

”میں اب سوچتا ہوں کہ کاش پہلی مرتبہ جب یہ بات بلیا نے مجھ سے کہی تھی میں ہوں کہ دیتا تو ہماری زندگیوں کی الیہ سے تو دو چار نہ ہوتیں۔“ وہ افسردگی سے بولا۔

”میرے دل میں یہ بات آئی تھی ارغشی! لیکن پھر میں نے سوچا کہ تم نہیں مانو گے اس لیے خاموش رہا۔ تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے ارغشی! بلیا! بے سے بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ اس نے باپ کا سر فخر سے اونچا کر رکھا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں تھی ریشمال نے آکر پیغام دیا کہ ماما! بلا رہی ہیں۔ وہ ان کے کمرے میں آئی تو وہاں ماما کے علاوہ ڈیڈی! بلیا اور ارغشی بھی موجود تھے۔ اس کے اندر آنے پر سب نے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”بیٹھو بیٹا!“ بلیا نے اس کے لیے اپنے برابر میں جگہ بنائی تھی۔

”بیٹا! اس وقت ہم نے تمہیں ایک بہت ضروری بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔ مجھے پتا ہے میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔ بلیا نے بہت محبت اور شفقت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پہلے بھی ایک مرتبہ یہ بات ہو چکی ہے۔ تم نے اور ارغشی نے اس کے لیے انکار کر دیا تھا۔ اب ہم تم سے یہ بات کر رہے ہیں۔ اس میں ہم سب کی خوشی ہے، ہم سب کی بہتری ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہارے لیے اس رشتے کو قبول کرنا بہت مشکل ہوگا لیکن صبا! ان حالات میں اس سے بہت فیصلہ تمہارا اور ارغشی کے لیے وہ سزا کوئی نہیں ہو سکتا۔ صبا! سب کی خوشی کے لیے تم یہاں کہہ دو۔“

بلیا کا لہجہ مان بھرا تھا۔ وہ ان کی بات سن کر ہلکا سا ہونے لوں درمیان سے اٹھی جیسے اسے کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ اس کے چہرے پر موجود فضا نا پسندیدگی اور اشتعال سارے کے سارے اثر پائی آسانی سے بڑھے جاسکتے تھے۔

”صبا! ارغشی نے خود تم سے شادی کی خواہش اظہار کیا ہے۔ تمہیں میں اپنی محبت کا واسطہ دے کر کہہ رہی ہوں کہ انکار مت کرنا۔ تمہارے لیے ارغشی سے اچھا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔“ انہوں نے اس میں اٹک لے کر اس سے مخاطب تھیں۔ اس کی نظریں ارغشی پر جمی تھیں۔ ”ایک ایک قدم صبا! اس کے بالکل سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھیں۔

”آپ کو یہ بات سوجھتی اور کہتے ہوئے ذرا سی بھی شرم نہیں آتی مسٹر ارغشی! غنیزہ! کہاں گئی وہ شرم کی محبت اور کہاں گئے وہ معاذ کے لیے کبھی سوتیلی ماں کے لے کر آنے کے دعوے۔ مجھ سے ہمدردی جتانے کے چکر میں آپ نے شرم کے بارے میں ایک پل کے لیے بھی نہیں سوچا۔“

”صبا! بات یوں نہیں ہے میری جان! اوہ آدھ میرے پاس بیٹھو۔ تم بات کو بالکل غلط انداز میں سوچ رہی ہو۔“ بلیا بڑے پیار سے اسے اپنے پاس بلا رہے تھے مگر وہ کچھ سننے اور سمجھنے پر آمادہ نہیں تھی۔

”میں کچھ غلط نہیں سوچ رہی بلیا۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”میں چلائی۔“ ان کے ساتھ مسئلہ کیا ہے میری بھئی میں نہیں آتا۔ پہلے ہی آئی ڈی آفسروں کی سیدھی اندھ گئی۔ کس نے کہا تھا انہیں وہاں جانے کے لیے۔

”صبا! ماما خوش! انہیں کیا تکلیف تھی۔ میری بات میں اسے جیسے چاہے گزارتی۔ ان کو کیا حق تھا! انہیں سنیں! سننے کرنے کے لیے بیٹھنے کا۔“ اس نے آپ سے بھی بڑھ چڑھ کر اس سارے گھر میں گھوم لیا۔ انہیں میرے ماں باپ اور بھائی کی راہ میری فکر سے اب میری اسی فکر میں یہ بات کرنا شروع کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ انہیں یہ کہنا کہ ان کی اس عظمت اور نیکی سے میرے دل ان کی قدرو و منزلت اور بڑھ جائے گی۔“ وہ انہیں انداز میں مٹی۔

ارغشی بغیر کسی تاثر کے خاموشی سے اس کا طریقہ مبرا انداز دیکھ رہا تھا۔

”صبا! یہ کیا بد تمیزی ہے۔“ ڈیڈی مزید خاموش رہے تھے۔ اس نے جیسے ڈیڈی کی تڑپ کو دیکھا تھا۔

”صبا! یہ کیا بد تمیزی! تم واقعی ایک عظیم انسان ہو۔“ ان کی حتمی ہوئی مجبور اور تنہا کرن کو اپنانے کی تیار ہو گئے ہو۔ تم سے اچھا اور نیک انسان دنیا میں نہیں ملے گا۔ وہ ابھی اسی انداز میں اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی کہ

”صبا! یہ بات مجھ سے کہنے کی کوشش مت کیجئے۔“ اس نے اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ اسے خود نہیں پتا کہ کیا کیا بول گئی ہے اور کس کس کے سامنے کیا کہہ رہی ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ کمرے کے دروازے پر آکر وہ وحشت بھرے انداز میں

بہت دیر گزر چکی تھی مگر اس کا اضطراب ختم نہیں ہو رہا تھا۔ ماما اور ڈیڈی کو ناراض کر کے اسے نہ فائدہ آسکتی تھی اور نہ چین مل سکتا تھا۔ وہ ان کے کمرے میں آئی۔ ماما نماز پڑھ کر جائے نماز تہہ کرتے ہوئے اٹھ رہی تھیں جبکہ ڈیڈی بیڈ پر خاموش بیٹھے تھے۔

”آہم سوری ڈیڈی۔“ وہ ان کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

”صبا! تمہیں سوری مجھ سے نہیں! ارغشی سے کہنا چاہیے۔ تم نے آج اس کے ساتھ کس قدر بد تمیزی کی ہے۔“ ڈیڈی نے اس کے شرمندہ سے چہرے پر گہری نگاہیں ڈالتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔

”میں ان سے بھی معافی مانگ لوں گی ڈیڈی! پلیز۔“ اب تو پہلے مجھے معاف کر دیں۔ ماما آپ بھی۔ آپ کتنی عجیب میری بد تمیزی اور منہ پھٹ صبا کہیں کھو گئی ہے۔ دیکھیں وہ کہیں نہیں کھوئی! وہ بیٹھیں۔“ ڈیڈی سے کہتے کہتے وہ ماما کی طرف گھوم گئی۔ وہ آہستگی سے چلتے ہوئے اس کے پاس آ گئی تھیں۔

”صبا! تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم ایسی کبھی بھی نہیں تھیں۔ ہم نے اپنے بچوں کو کبھی اس بات کی تربیت نہیں دی کہ وہ بیویوں کے سامنے اونچی آواز سے بولیں۔ ارغشی نے یہ بات کر کے ہم سب کے جذبات کی ترجمانی کی تھی۔ ہم سب یہی چاہتے تھے مگر کہنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس نے ہم سب کی خوشیوں کا سوچا۔ آج بھی ایک سے ایک اچھی لڑکی کا رشتہ اسے مل سکتا ہے۔ اس نے اگر ایسا سوچا تو ہماری محبت میں میری محبت میں! ہم سب کی محبت میں۔ تم نے اس کے خلوص کا مذاق اڑایا! اس کے لیے اتنے بڑے الفاظ استعمال کیے کہ میں اب تک حیران ہوں کہ کیا صبا اس طرح کے الفاظ بھی بول سکتی ہے۔“ ماما نے بیڈ پر بیٹھے ہوئے اس کی طرف بہت افسوس سے دیکھا۔

”میں باقی ہوں ماما! میں نے غلط باتیں کہیں۔“ اس نے سوچے سمجھے بغیر بتائیں میں کیا کیا بول گئی۔ لیکن ماما یہ بات طے ہے کہ میں اس بات کے لیے کبھی بھی



نہیں کہہ سکتی۔ میں ار تفتنی بھائی کے ساتھ کزن اور بہنوئی ہونے کے علاوہ تیسرا کوئی رشتہ کبھی جوڑی نہیں سکتی۔ اس کی آواز آہستہ بھی مگر اجہ بہت دو ٹوک اس میں کسی ترمیم کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں تھی۔

”بیٹھ جاؤ صبا! ڈیڈی نے اس کے لیے اپنے پیچھے بٹائے ہوئے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔“

”جو کچھ تم نے کہا ہے اگر تم واقعی ایسا ہی سوچتی ہو تو میں یہی کہوں گا کہ تمہیں اپنے دوست اور دشمن کی پہچان نہیں ہے۔ اور ایسے لوگ زندگی میں بہت نقصان اٹھاتے ہیں۔“ اس کے بیٹھنے کے بعد ڈیڈی نے سنجیدگی سے کہا۔

”نہیں ڈیڈی! مجھے ان کے خلوص اور ان کی محبت پر کوئی شک نہیں وہ بات سن کر مجھے اتنی شرم اور اتنا غصہ آیا تھا کہ میں اپنے حواسوں میں نہیں رہی تھی۔ غصے میں میرے منہ سے پتا نہیں گیا کیا نکل گیا۔“ اس نے فوراً ان کی بات کا جواب دیا تھا۔

”مما! ڈیڈی! پلیز میں آپ دونوں سے ریکورسٹ کرتی ہوں کہ آئندہ یہ بات کبھی مت کہنے کا میں ار تفتنی بھائی کے ساتھ یہ رشتہ قائم کرنے کے بارے میں سر کر بھی نہیں سوچ سکتی۔“ اس نے ملتھیانہ لگا ہوں سے ان دونوں کو دیکھا۔

”پھر اگر ہم تمہاری کہیں اور شادی کے بارے میں سوچیں تو تم کیا کہو گی؟“ ڈیڈی نے بڑی سنجیدگی سے اس سے یہ سوال پوچھا تھا۔

”ڈیڈی! آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں۔ ابھی میری پہلی شادی کو ختم ہوئے کتنا وقت گزرا ہے مجھے سمجھنے کا موقع دیں۔ پھر میں آپ کی یہ بات مان لوں گی۔“ وہ اب انہیں اس بات کے لیے انکار نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے ار تفتنی سے معافی نہیں مانگی تھی۔ وہ اس کا سامنا کرنے سے گھرانے لگی تھی۔

سوائے رات کے کھانے کے ان دونوں کا براہ

راست سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ آتے جاتے ٹکراؤ ہونے پر وہ اس سے بات کیے بغیر خاموشی سے اس جگہ سے ہٹ جایا کرتی تھی۔

پایانے اسے وہ سب باتیں بتائی تھیں جو صبا نے ان سے اس رات کہی تھیں۔ ”صبا کے نظریے سے سوچیں تو اس کا رد عمل بالکل ٹھیک تھا ار تفتنی! وقت گزرنے پر وہ اس حادثے سے باہر نکل آتی تو آہستہ آہستہ اس سمجھتا جاسکتا تھا۔ رشتے بدلے جاسکتے ہیں۔ سوچیں بدلی جاسکتی ہیں۔ ہم پیار سے دھیرے دھیرے اسے سمجھاتے تو وہ اس رشتے کے لیے اپنے دل میں گنجائش پیدا کرنے پر آمادہ ہو ہی جاتی۔“ ار تفتنی یوں خاموش رہا تھا جیسے اسے ان تمام باتوں سے بورا پورا اتفاق تھا اور اسے اتفاق ہو بھی جاتا اگر وہ صابا شفیق کو جانتا نہ ہوتا۔ اس گھر کا وہ سرا کوئی بھی فرد صبا کو اپنی اچھی طرح اور اندر تک نہیں جانتا تھا جتنا ار تفتنی جانتا تھا مگر اب گزشتہ کچھ عرصہ سے وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ صبا کو جانتا ضرور ہے۔ مگر سمجھتا نہیں۔ وہ کبھی صبا کو سمجھ نہ سکتی تھی۔

پہلی مرتبہ وہ صبا کے رومے پر اس وقت چوٹا تھا جب وہ لاہور اس کے اور دشمن کیسے پاس آئی تھی۔ ”آپ کو میرے ذکر سے چڑ ہوئی ہے؟“ کتنا اجنبی سا آجہ لگا تھا اسے صبا کا۔ اس لیے میں بہت سے شکوے اور شکایتیں چھیپی ہوئی تھیں جنہیں وہ اس وقت سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ چوٹا ضرور تھا مگر کوئی بات سمجھ نہیں تھا۔

اس رات پہلی دفعہ اس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ صبا اس سے۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنی اس سوچ کو جھٹک دیا تھا۔ بڑی شدت سے خود کو جھٹایا تھا۔

مگر اب وہ اپنی اس سوچ کو ———— احمقانہ ———— کہہ کر جھٹا اور بھٹا نہیں سکتا تھا۔ زندگی میں وہ سری مرتبہ صبا نے اس کے ساتھ بد تمیزی کی تھی اور اس بار اس نے اپنی بد تمیزی

کی اس سے معافی بھی نہیں مانگی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر اترانے لگی تھی وہ اس سے بالکل بات نہیں کرتی تھی۔ وہ اس سے سلام دعا اور رسمی سی خیریت والی باتیں بھی نہیں کرتی تھی۔ اس کا گریز محسوس کر کے اس نے بھی اسے مخاطب کرنا چھوڑا ہوا تھا۔ اسے صبا کی اس روز کی باتوں سے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ مگر وہ اس سے ناراض نہیں ہو سکا تھا۔

بجائے اس سے نفرت کرنے کے وہ اس کے واسطے کا سب تلاش کرنے بیٹھ گیا تھا۔ صبا نے اس کے ساتھ بڑے عجیب سے انداز میں بد تمیزی کی تھی۔ بہت عجیب طرح اس سے نفرت کا اظہار کیا تھا۔ ار تفتنی کے پاس سوچنے اور غور کرنے کے لیے اب بہت سی باتیں تھیں۔ یہ بات تو بہر حال وہ سمجھ چکا تھا کہ صبا کی زندگی کی وہ ابھی بے چین اور بے عمل رہتی ہے۔ اس کا تعلق اسی کی ذات سے ہے۔ صبا کی سب الجھنوں کا سلسلہ ار تفتنی غنغفر کے ساتھ ہی جا رہا تھا۔ وہ اس کی الجھنوں کو ختم کرنا چاہتا تھا مگر پہلے بہت پوری طرح سمجھ تولے۔

\*\*\*

وہ ممّا کے لیے ان کے کمرے میں کھانا لے کر آئی تھی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ صبح سے کمرے میں تھیں۔ اندر آئی تو ممّا کے پاس بیٹھا نظر آیا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان کا سر دبا رہا تھا۔

”مما! دور ٹھیک ہو گیا۔“ ساتھ ساتھ معصومانہ انداز میں وہ یہ جملہ بھی دہرا رہا تھا۔

”ہاں بالکل ٹھیک ہو گیا۔“ ممّا ہلکا سا مسکرائی تھی۔ انہوں نے اپنے ماتھے پر رکھا اس کا ہاتھ بے مانتہ چوما تھا۔

”جاؤ! اب جا کر کھیل لو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اسوں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا تو وہ سر ہلا کر وہاں سے اٹھا اور بھاٹا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ وہ کھانے کی ٹرے لے کر ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ ممّا

اس روز کے بعد سے ایک مرتبہ پھر بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔

وہ کنبوں اور کھنڈ کے سارے بیٹھی اتنی بد حال اور کمزور لگ رہی تھیں۔ جیسے برسوں کی بیمار ہوں۔ ”آپ اتنا سوچتی کیوں ہیں۔ دیکھیں سوچ سوچ کر آپ نے خود کو بیمار کر لیا ہے۔“ اس نے دو سرائو والہ ان کے منہ میں ڈالا۔ وہ ہونے سے مسکرائیں۔

”میں ٹھیک ہوں صبا! تم میری فکر مت کرو۔“ وہ آہستہ آہستہ عقیدہ چار رہی تھیں۔ ”صبا! کل رات میں نے خواب میں دشمن کو دیکھا۔“ ان کی آواز بہت کھوئی کھوئی اور بدھم سی تھی۔ وہ نوالہ توڑتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو روک کر ان کی بات سننے لگی تھی۔

”بہت پیاری لگ رہی تھی وہ۔ اتنے پیارے کپڑے پہنے ہوئے تھے اس نے۔ وہ میرے پاس بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ اور میرے ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔

”مما! میں بہت اکیلی ہوں۔ آپ میرے پاس آجا میں۔ آپ نے مجھے بچپن میں بھی کبھی لوریاں نہیں سنا میں۔ کبھی اپنے ساتھ لپٹا کر نہیں سلا یا۔ آپ کو کیا اپنی اس بیٹی سے بالکل محبت نہیں؟“ ممّا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ بولتے بولتے وہ ایک پہل کے لیے بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔

”اس کے لیے میں اتنا شکوہ اور اتنی ڈھیر ساری شکایتیں تھیں کہ میں رو ہی نہیں سکی۔ وہ بیڈ پر سے اٹھی تو میں بھی اس کے پیچھے اٹھ گئی۔ وہ مجھے اٹھاتا ہوا دیکھ کر اتنی خوش ہوئی، اس کے چہرے پر بہت خوب صورت مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔“

اس کا دل سوکھے پتے کی مانند کلپنا تھا۔ ”مما! اس طرح کی باتیں مت کریں۔ پلیز۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ ٹرے درمیان سے ہٹا کر ان کے بالکل قریب بیٹھ گئی تھی۔

”دشمن اکیلی ہے صبا! وہ اسی کھوئے کھوئے لیے میں بولیں۔“

”مما! آپ ایسی باتیں مت کریں۔ آپ میری فکر میں بیمار ہو گئی ہیں نا“ آپ میری شادی کرنا چاہتی ہیں



ناں۔ میں شادی کے لیے تیار ہوں۔“ وہ سراسیمگی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”جس سے میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں اس کے لیے تم نہیں مانو گی۔ اور اس کے علاوہ کہیں کا کوئی راجہ مہاراجہ بھی اب تمہارا ہاتھ مانگنے آجائے تو میں اس کے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ نہیں دوں گی۔ میں بہت وہمی ہو گئی ہوں صبا! اب تمہارے لیے ار تفضی کے علاوہ میں کسی پر بھی بھروسا نہیں کر سکتی۔ کاش ایسا ہو کہ مرنے سے پہلے جب میں آنکھیں بند کروں تو جو آخری منظر میری آنکھیں دیکھیں وہ یہ ہو کہ میری صبا تنہا نہیں، ار تفضی اس کے پاس ہے اور وہ اسے ہر دکھ اور ہر تکلیف سے بچائے رکھے گا۔ صبا مجھے ظفر پر بھی اتنا بھروسا نہیں جتنا ار تفضی پر ہے۔“

انہوں نے تکیہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یوں جیسے وہ بولتے بولتے بہت تھک گئی ہوں۔ ”مما!“ وہ خوفزدہ انداز میں چلائی۔ اس نے انہیں پورا کا پورا جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ مگر انہوں نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ وہ ہراساں نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے پاس رکھا، فون اٹھا کر ار تفضی کا موبائل نمبر ملانے لگی تھی۔ دوسری بیل پر ہی اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔ پورے پندرہ دن بعد وہ اس سے مخاطب تھی۔ بری طرح اٹکتے ہوئے بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں اس کے منہ سے صرف ”مما“ کا لفظ نکلا تھا۔ وہ اس کے لہجے کی گھبراہٹ اور کپکپاہٹ اس ایک لفظ سے ہی محسوس کر سکتا تھا۔

”کیا ہوا صبا! کیا ممما کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے؟“ اس کی آواز میں تشویش تھی۔

”ہاں“ وہ بات نہیں کر رہیں۔ میں انہیں اتنی آوازیں دے رہی ہوں۔“ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں چلائی تھی۔

”تم ندیم کو فون دو۔“ وہ بہت جلدی میں بولا۔ اس نے چیخ کر ندیم کو آواز دی وہ بھاگتا ہوا فوراً کمرے میں آیا تھا۔ اس نے ریسیور اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے دو سیکنڈز تک خاموشی سے ار تفضی کی بات سنی

اور جواب میں ”جی ٹھیک ہے“ کہہ کر ریسیور واپس رکھتے ہوئے کمرے سے تیزی سے نکل گیا۔ ندیم اور ڈرائیور بڑی تیزی میں ممما کو ہاسپٹل لے کر جا رہے تھے۔ وہ ننگے پاؤں ہی ان لوگوں کے پیچھے بھاگتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

صبح سے انہیں صرف بخار ہی تو تھا۔ بخار ہی کی وجہ سے کمزوری بھی بڑھ گئی تھی۔ مگر اب وہ یوں پڑی تھیں جیسے نہ معلوم انہیں کتنی خطرناک بیماری لاحق ہو گئی ہو۔ ڈاکٹرز انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈاکٹرز کی سمجھ میں ان کی بے ہوشی نہیں آرہی تھی۔ وہ ار تفضی سے پوچھ رہے تھے کہ ان کے گھر میں کیا کوئی ایسی بات ہوئی ہے، کوئی لڑائی جھگڑا، کوئی ٹینشن، کوئی اچانک ملنے والی بری خبر۔

ار تفضی نے بابا اور ڈیڈی کو آفس فون کر کے ممما کی طبیعت کے بارے میں بتایا تو وہ دونوں بھی فوراً ہی وہاں پہنچے۔

کتنے گھنٹے گزر گئے تھے، وہ سب وہاں کھڑے ایک دوسرے کو حوصلہ دے رہے تھے۔ رات کے آخری پہر کہیں جا کر ممما کو ہوش آیا تھا۔ انہیں ہوش میں آتا دیکھ کر ان سب نے سکون کا سانس لیا۔ ہوش میں آتے ہی انہوں نے ثمن کا نام لیا تھا۔ یہ سب لوگ ان کے پاس گئے تو وہ آنکھیں نیم وا کیے مسلسل ثمن کا نام پکارے جا رہی تھیں۔

وہ بہت تکلیف میں تھیں۔ ڈیڈی کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کی جان واقعی صبا میں اٹکی ہوئی ہے۔ وہ بہت مشکل میں ہیں۔ اور ان کی یہ مشکل صبا ہی آسان کر سکتی تھی۔ وہ صبا کے پاس آگئے۔

”صبا! میں تمہیں کوئی حکم نہیں دے رہا۔ لیکن اگر تمہیں اپنی ممما سے واقعی محبت ہے تو پھر اسے ار تفضی کے علاوہ کسی پر بھی بھروسا نہیں۔ وہ تمہاری شادی صرف ار تفضی کے ساتھ ہی ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہے۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی خاموشی سے ڈیڈی کو دیکھ رہی تھی۔

”صبا! یہ وقت گزر گیا تو زندگی میں صرف پچھتاوے



رہ جائیں گے۔ اپنی مرقی ہوئی ماں کی آخری خواہش پوری کرو۔ وہ بہت تکلیف میں ہے صبا۔“  
ان کی آنکھوں سے گرتے آسوجائے نمازیں جذب ہو رہے تھے۔ اس نے ایک نظر آنکھوں کے سہارے اپنی سانسیں پوری کرتی ہوئی ماما کو دیکھا اور پھر ڈیڈی کو۔ انکار میں ادا ہونے والا ہر لفظ اور ہر جملہ اس کے منہ سے نکلنے سے انکاری ہو گیا تھا۔ اس نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ سوائے اقرار میں سر ہلانے کے۔  
”ایلی! آنکھیں کھولو۔ دیکھو صبا شادی کے لیے ماں گئی ہے۔ ہم ابھی تھوڑی دیر میں ار تفتنی کے ساتھ اس کا نکاح کروائیں گے۔“

ان کے منہ سے یہ جملہ نکلنے کی دیر تھی کہ مہمانے آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کی بچھتی ہوئی آنکھوں میں آخری بار بہت گہری چمک اور روشنی آئی تھی۔ انہوں نے آنکھیں پوری کھولی ہوئی تھیں ایسے جیسے وہ اس منظر کو بہت اچھی طرح اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لیتا چاہتی ہوں۔ محض آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہاں نکاح کے تمام انتظامات ہو گئے تھے۔ ماما کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ ہل نہیں سکتی تھیں۔ منہ سے کچھ بول بھی نہیں سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ اپنے ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتی تھیں۔ لیکن انہوں نے اپنی آنکھوں کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی ان کے پاس آگئی تھی۔ ان کے صرف ہونٹ ال رہے تھے۔ وہ پوری کی پوری ان پر جھک گئی تاکہ ان کے ہونٹوں کی جہش کو سمجھ سکے۔

”صبا! میں بہت خوش ہوں۔“ ماں کے کانپے لیوں نے بے آواز اس سے یہ بات کہی تھی۔

”صبا! میری دعا ہے کہ زندگی تم پر ہمیشہ ماں کی گود کی طرح مہیاں رہے۔ اس کا دامن بھی تمہارے لیے تنگ نہ پڑے۔“ اسے لگا ہوں کی زبانی دعائیں دیتا وہ چہرہ اس لمحہ کتنا روشن اور کتنا دلکش نظر آ رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں کتنا سکون اور کس قدر اطمینان تھا۔ وہ اب تکلیف سے کراہ نہیں رہی تھیں۔

وہاں اس وقت کمرے میں بابا ڈیڈی اور ار تفتنی کے علاوہ چند افراد اور بھی موجود تھے۔ وہ سب ابھی ابھی وہاں آئے تھے۔ اس نے پورے ہوش و حواس میں اس نکل جانے پر دستخط کیے تھے۔  
”ماما! آنکھیں کھولے اس منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی مگر ان کے چہرے پر الوہی مسکراہٹ تھی۔ ان کی آنکھوں میں سکون تھا۔ وہ بہت مطمئن لگ رہی تھیں۔ وہ دونوں ان کے بالکل قریب کھڑے تھے۔ صبا اور ار تفتنی ان کی آنکھیں آخری منظر پر دیکھ رہی تھیں کہ ان کی صبا تھما نہیں۔ ار تفتنی اس کے پاس ہے۔“

\*\*\*

مجھ کو یقین ہے سچ کہتی تھیں جو بھی ای کہتی تھیں جب میرے بچپن کے دن تھے چاند میں پریاں رہتی تھیں ایک یہ دن جب لاکھوں غم اور کل پڑا ہے۔ آواز ایک وہ دن جب ایک ذرا سی بات پر ندیاں بہتی تھیں۔ ”مجھے تو میری ماما کی گود ہمیشہ چاہیے۔ ساری زندگی۔ جب میں بوڑھی ہو جاؤں گی ناں تب بھی۔“ اور ابھی زندگی ساری کہاں گزری تھی ابھی تو بہت ضرورت تھی اس گود کی۔ اس مستابھری چھاؤں کی۔ گھنٹوں میں سروے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

”صبا! تم نے ماما کو روکا کیوں نہیں؟“ ظفر اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بری طرح رو رہا تھا۔ وہ فلاحیت سے کراچی پہنچا تھا مگر ماما کو زندہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ سین اسی دن پہنچا تھا جب ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کا چہرہ دیکھا تھا۔ ان کا آخری دیدار کیا تھا۔ ان خود اپنے ہاتھوں سے گھر میں اتارا تھا۔ اور اگر وہ یہ کہتا تو شاید زندگی میں کبھی سکون سے رہ نہیں سکتا تھا۔

دس دن ہو گئے تھے ماما کو گئے ہوئے گھر اب دل کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا ابھی وہ کسی سے نکل کر سامنے آجائیں گی۔  
محلہ سارے گھر میں ماما آوازیں لگا رہا تھا۔

کی گورنس تو صرف ار تفتنی کی خواہش پر مہمانے رکھی گئی۔ وہ اس کے سب کلام خود کرتی تھیں۔ وہ انہیں سے دکھانے کا ان سے ضدیں پوری کروانے کا مدنی تھا۔ وہ سچ سال کا بچہ تھا۔ بابا نے اسے بہت پیار کیا۔ یہ بات سمجھائی تھی کہ ماما کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس بلایا ہے۔ وہ ان کی بات سمجھ لینے کے باوجود بھی ماما کو آوازیں دیتے ہوئے رونا شروع کر دیتا تھا۔

”میں ماما سے نماؤں گا۔ ماما سے پڑے پنوں گا۔“  
”میں ماما سے دودھ پیوں گا۔“ وہ ضدی سے انداز میں کہتا رہتا تھا۔ چالیسویں کے بعد جب ظفر ماما کو واپس لانے کی تیاری کرنے لگے تو ڈیڈی نے اسے روک لیا۔

”ظفر! بہت رو لے امریکہ میں اب واپس آ جاؤ۔“ انہوں نے ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ ”اس کے کریر کے راستے میں نہیں آئے تھے۔ وہ اپنا سامنا چاہتا ہے۔“ بڑھائے وہ ریسرچ کرنا چاہتا تھا۔ وہ تباہی لکھنا چاہتا ہے۔“ لکھے۔ مگر اب وہ بہت اکیلے ہو گئے تھے۔

”ایلی! میرا تو پہلے بھی واپس آنے کا ارادہ تھا۔“  
”اب اس ماما کی زندگی میں واپس آ گیا ہوتا۔ وہ مجھے کتنی خوش ہوتیں۔“ وہ اداسی سے ان کی طرف دیکھ رہے ہوں۔

اب مجھے کچھ وقت دیں۔ اس طرح سب چھوڑ کر واپس نہیں آ سکتا۔ لیکن یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں بہت جلد پاکستان واپس آ جاؤں گا۔ وہاں رہ کر میرا بھی دل نہیں لگے گا۔“ اس نے ان کی ہلکی سی گواہی لی۔

\*\*\*

”ہاں! آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں؟“  
”میں نے اس کے پاس کھڑا بہت معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔“  
”میں نے اس کے بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔“  
”انداز پر وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ اسے یہ بات گریباں آیا تھا۔ اس نے اسے سمجھ کر

اپنے پاس بیٹھا لیا۔ کتنے دنوں سے وہ معاذ تک کو نظر انداز کر چکے ہوئے تھے۔ وہ گورنس کے رحم و کرم پر تھا۔ ”گورو! کیا باتیں کرتی ہیں۔“ اس نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

”مفتی کتنی موٹی ہے ناں ہالہ جانی۔“ اسے بے ساختہ ہنسی آگئی تھی۔

”وہ کھانا کھانے میں غرے نہیں دکھاتی۔ اس لیے۔“ وہ اس کا طعنے انداز فوراً سمجھ گیا تھا۔

”میں اس سے زیادہ اسٹرانگ ہوں۔ آپ ہماری ریلنگ کروا کر دیکھ لیں۔“

”بس بس۔“ مجھے یقین آ گیا۔ اب کہیں سچ سچ اس کے ساتھ ریلنگ کرنے کھڑے مت ہو جانا۔ اگر اس کے ساتھ لڑائی کی تو تمہارے ریلنگ دیکھنے پر پابندی لگوا دوں گی بابا سے کہہ کر۔“ وہ تیسری انداز میں بولی۔ اسی وقت ریشمال اندر آئی۔

”سب کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ معاذ کو ساتھ لیے ڈائننگ روم میں آگئی۔ سب نے کھانا شروع کر دیا تھا۔

”تمہاری کل کتنے بجے کی فلائٹ ہے؟“ بابا نے ظفر سے پوچھا۔ اس نے جواباً اپنی فلائٹ کا نام بتا دیا۔ ”یہ کسی فنکشن کا موقع نہیں اور نہ ہمارے دل اس بات کے لیے راضی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں باقاعدہ طور پر اپنے تمام قریبی جاننے والوں کو صبا اور ار تفتنی کی شادی سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ بابا کے انتقال کے بعد کسی کو بتانا چاہیے۔ کسی کو نہیں۔ ستر رہے گا۔ اگر ہم گھر پر کوئی جی یا ڈنر رکھ لیں اور اس میں تمام قریبی احباب کو مدعو کریں۔“ بابا بہت سنجیدگی سے سب سے مخاطب تھے۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بابا! ظفر نے فوراً ان کی بات سے اتفاق کیا۔ ڈیڈی نے بھی گردن ہلا کر ان کی بات کی تھی۔

”پھر ظفر کے سامنے ہی کر لیں۔ کل چھٹی کا دن ہے۔ سچ سب کو انوائٹ کر لیں۔“ ڈیڈی نے کچھ دیر بعد بابا کو مشورہ دیا تو وہ سر اثبات میں ہلا کر بولے۔



دونوں سے چھپا لیا تھا۔ وہ مخاطب ان دونوں سے تھے لیکن ان کی ساری توجہ صبا کی طرف تھی۔ بیٹے کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ اسے کچھ بھی سمجھانے اور بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اس کی طرف بہت غور سے دیکھ رہے تھے مگر وہ نظریں جھٹکائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔ مزید کچھ کہنا انہیں بے موقع لگا۔ اسی لیے وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر صوفے پر سے اٹھ گئے۔ ایک نظر اس پر ڈال کر وہ ان دونوں کو شب بخیر کہتے کمرے سے نکل گئے۔

ان کے باہر جاتے ہی ارقتنی بھی صوفے پر سے اٹھ گیا۔ وہ اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کے پاس آکر کچھ لمبے لمبے رکھ اس پر رکھی اپنی اور شمن کی شادی کے دن کی تصویر کو اس نے بغور دیکھا تھا۔ وہ اس لڑکی کی طرف بہت دیکھ اور کرب سے دیکھ رہا تھا جسے وہ بڑی محبت سے آج سے کئی سال پہلے ایک روز اپنی زندگی میں شامل کر کے یہاں لایا تھا۔ اس لڑکی سے اس نے محبت کی تھی۔ بے تمنا شا اور والہانہ۔ اس نے بھی سوچا نہیں تھا کہ ایسا کوئی دن اس کی اور شمن کی زندگی میں آئے گا۔ جب کوئی تیسرا فرد ان کے درمیان جگہ بنائے۔ چند لمحوں ہی میں اس نے ان گزرے وقتوں کی کتنی ساری باتیں یاد کر ڈالی تھیں۔ ان وقتوں کی جو اس نے اور شمن نے مل کر گزارے تھے۔

”مجھے معاف کرونا شمن!“ اس نے بے آواز سے مخاطب کیا اور پھر اس تصویر پر سے نظریں جھٹالیں جسے اس نے کبھی پہلے سے نہیں دیکھا تھا اور نہ آئندہ کبھی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ پٹنا اور ماضی سے نکل کر حال میں آ گیا۔ اس حال میں جہاں وہ لڑکی اس کے کمرے میں اس کی بیوی کی حیثیت سے بیٹھی تھی جسے اس نے بھی بھی ان نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن اب اسے اس لڑکی کو ان نگاہوں سے دیکھنا تھا۔ اسے وہ مقام اور وہ عزت دینی تھی جو اس کا حق تھا۔ وہ لڑکی زندگی کے گزرے ہوئے سال میں بھی اس سے محبت کر چکی تھی وہ بہت بھی جان چکا تھا۔ اب اس کے دل میں اس کے لیے کیا بات

وہ نہیں جانتا تھا مگر وہ اس محبت سے آگاہ تھا جو پر سوں پہلے صبا شفیق کے دل میں اس کے لیے موجود تھی۔ اس محبت کے ساتھ پھر کیا ہوا؟ بالکل اندازہ نہیں تھا۔ وہ ختم ہو گئی یا دل کے نمائندوں میں پھنسی گئی۔ وہ اس کے دل، اس بھید سے انجان تھا لیکن پہلے صرف ایک قدم اٹھاتے ہی اس کی صبا پر نظر پڑی تو اس کے چہرے پر بیکھری وحشت دیکھ کر وہ کسی قدر خائف ہو گیا۔

اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت تھی خوف تھا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ اس کی طرف بالکل بھی متوجہ نہیں تھی۔ وہ سامنے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کس چیز سے ڈر رہی تھی۔ ارقتنی کی بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ بے اختیار آگے بڑھ کر اس نے اسے آواز دی۔

”صبا! تم ٹھیک تو ہو۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے اس کا کندھا ہلکے سے ہلایا۔ اسے یوں ہلایا۔ کی دیر تھی وہ وحشت زدہ ہو کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے چلائی۔ وہ اس کے چلانے پر بوکھا گیا۔

”صبا! کیا ہوا ہے؟“ اس کی چیخ کے آگے اس کا سوال بالکل دب گیا تھا۔ ارقتنی نے اسے بہت دور سے جھنجھوڑا تھا۔

”صبا! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ اسے جھنجھوڑتے ہوئے وہ چلا آیا اور اس کے جھنجھوڑنے اور چلانے پر اس کی چیخ نکلتی ہی ختم ہو گئی۔ وہ اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے صوفے پر سے اٹھی اور پھر بھاگتے ہوئے کمرے سے دروازے سے نکل گئی۔ ارقتنی نے باہر نکل کر اسے دیکھا وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

”مما! یہ آپ مجھے کس آزمائش میں ڈال گئی ہیں؟“ میں وہاں کیسے جاؤں ممما! وہاں شمن کا خون پڑا ہے۔ شمن کی لاش پڑی ہے۔ اس پورے بستر پر خون ہی لگا ہوا ہے۔ شمن کا خون۔ اس کی لاش مجھے دیکھ رہی ہے۔ ان نگاہوں سے۔“ تو آخر آئیں تم یہاں صبا شفیق کی بستر پر پڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کا پورا جسم

میں نمایا ہوا تھا۔ وہ خوف اور وحشت سے لرز رہی تھی۔

”مما! آپ کو میری شادی کروانا تھی تو پھر کسی سے بھی کروا دیتیں میں کچھ بھی نہ کہتی مگر آپ نے میرے دل اس شخص کا انتخاب کیا جس کے ساتھ میں مر کر بھی ایسا رشتہ نہیں جوڑنا چاہتی تھی۔ ممما! آپ نے مجھے ساتھ بالکل اچھا نہیں کیا۔ آپ کی خوشی صبا کو کتنا دکھ دے گی؟ آپ نے یہ نہیں سوچا۔ اس ایک رات کی سزا اور کتنی کافی ہو گئی تھی۔ کیا وہ رات ہی زندگی سے نکل نہیں سکتی۔ ماضی کا ہر لمحہ مجھے یاد ہے۔ بس وہ رات اس میں سے نکل جائے اور میں ہو سکتا تو پھر صبا مر جائے۔ میرے اللہ صبا کی موت دے دے! اسے زندگی سے نجات دے دے! اس شرمناک زندگی کی قید سے رہائی دے دے! اسے کسے گناہ معاف کر دے۔“ زندگی میں وہ سری مرتبہ اپنے لیے اللہ سے موت مانگ رہی تھی۔ پہلی مرتبہ اس کے مرنے کے دو سرے دن مانگتی تھی تب اس دعا کی شدت نہیں تھی جتنی آج تھی۔

ارقتنی ہونے میں کچھ ہی دیر رہ گئی تھی وہ بیڈ پر جا کر بہت پریشان بیٹھا تھا۔ اسے صبا کی فکر تو تھی اس سے بھی زیادہ بلیا اور ڈیڈی کی فکر تھی۔ وہ کھانا کھانا اور سکون دینا چاہتا تھا۔ صبا کی جو بھی بات اسے وہ خود بالکل اکیلے سلکھنا چاہتا تھا۔ صبا کی کسی مسئلے میں الجھنا اسے گوارا نہیں تھا مگر وہ اس کی اس سوچ کے راستے میں سب سے پہلے تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے رات گزر رہی تھی ویسے ویسے اس کی طبیعت بدلتی جا رہی تھی۔ اگر صبح اٹھ کر بلیا اور بلیا بہت تھک چلی گئی کہ صبا اپنے کمرے میں سو گئی۔ وہ بہت زیادہ ڈسٹرب ہو جائیں گے۔ اس سے وہ دونوں کس قدر خوش تھے وہ ان کی وفاداری کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اچانک

ہی وہ کچھ سوچ کر سگریٹ الیش ٹرے میں پھینکا اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کمرے سے نکل کر وہ صبا کے کمرے کی طرف آیا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آ گیا اور آہستگی سے دروازہ واپس بند بھی کر دیا۔ وہ بیڈ کے پیچوں کے اوپر سے منہ بالکل ساکت پڑی تھی۔ وہ اس کے پاس آیا اور بالکل آہستہ سے اسے آواز دی۔ وہ اس کی ایک کیا؟ وہ سری اور تیسری پکار پر بھی یونہی ساکت پڑی رہی تھی۔ ارقتنی کو ایک دم ہی اس کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ بے اختیار بیڈ پر بیٹھا اور کندھے سے پکڑ کر اسے سیدھا کیا۔ وہ سو رہی تھی یا بے ہوش تھی؟ ایک نظر میں اسے اندازہ نہیں ہو سکا۔ بلیا اور ڈیڈی سے بہت کراب اس کی پریشانی کا رخ صبا کی طرف مڑ گیا تھا۔

وہ خواب میں بھی وہی منظر دیکھ رہی تھی جو ابھی چند گھنٹے پہلے اس نے جاتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سرخ لپاس پہنوں اور پھولوں کی جگہ سفید کفن نے لے لی تھی۔ اس کمرے میں اب چاروں طرف خون تھا۔ وہ بہت زور سے چلائی تھی۔ بخار کی شدت کی وجہ سے اس سے آنکھیں نہیں کھولی جا رہی تھیں لیکن وہ آنکھیں کھولنا چاہتی تھی تاکہ اس بھانک خواب سے چھٹکارا پاسکے۔ اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ کوئی بڑی آہستہ آواز میں اس کا نام لے رہا تھا اس کے چہرے پر کسی کے بالکل ٹھنڈے ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ وہ اس کا چہرہ چھتا رہا تھا۔ اسے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں کھولنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ آنکھیں کھولنے پر اسے کوئی پھول نظر آئے نہ کوئی دامن اور نہ ہی کوئی لاش اور خون۔ اس نے بہت طمأنیت اور سکون محسوس کیا۔ شکر تھا کہ وہ اس ڈراؤنے خواب سے جلد بیدار ہو گئی تھی۔



دیکھا۔ وہ اس کے بالکل قریب بیٹھا اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹی لپائی رکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دو ستارے مسکراہٹ تھی۔ بالکل ویسی ہی جیسی بیٹھ ہوا کرتی تھی۔ یہ وہی تھا اسے ابھی اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ اس نے فوراً ہی اسے دھکا دے کر اپنے پاس سے ہٹانا چاہا مگر وہ صرف اسے ہاتھ ہی لگا سکی۔ دھکا دینے بجائی طاقت اس کے جسم میں بھی ہی نہیں۔ بے بسی کے شدید احساس میں گھر کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”کچھ چاہیے صبا!“ وہ اس کے ہاتھ لگانے پر یہی سمجھا کہ شاید اسے کچھ چاہیے۔

”آپ میرے کمرے سے چلے جائیں۔“ اسے خوشی ہوئی وہ کچھ اور نہیں کر سکتی کم از کم بول تو سکتی تھی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تمہیں بخار ہو رہا ہے۔“ اس نے اسے بتانا چاہا۔

”مجھے جو بھی ہو رہا ہے، آپ یہاں سے جائیں۔“ اس نے جواباً بتلانے کی کوشش کی مگر زیادہ زور سے

چلا نہیں سکی۔ اس نے اپنی آنکھیں اس طرح بند کی ہوئی تھیں جیسے اس کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھول کر کوئی اندر آیا تھا۔ وہ روشمال تھی وہ اس کی آواز پہچان گئی تھی۔ وہ کچھ لے کر آئی تھی۔ وہ اس کے بارے میں ارتضیٰ سے کچھ بولی تھی۔

”ہاں یہ تیرے یہاں نہیں لے کر رکھ دو۔“ ارتضیٰ نے اسے جواب دیا۔ ابھی شاید وہ واپس بھی نہیں گئی تھی کہ ایک دوسری آواز آئی۔ یہ ڈیڈی کی آواز تھی۔ ڈیڈی کی آواز سنتے ہی اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اس کے بالکل قریب کھڑے بہت تشویش سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ارتضیٰ انہیں بیٹھنے کے لیے جگہ دیتا خود اس کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔ اس کے اٹھنے ہی وہ پرسکون ہو گئی تھی۔ ارتضیٰ بیڈ کے پاس ہی کھڑا انہیں اس کی طبیعت کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ اس کی باتیں سنتے ہوئے دیکھ صبا کو رہے تھے، ان کی

آنکھوں میں اس کے لیے بہت فکر تھی۔

”آپ صبا کو ناشتہ کروائیں ڈیڈی! میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ وہ ڈیڈی سے کہتے ہوئے کمرے سے چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”طبیعت کیوں خراب کر لی بیٹا؟“ تیرے سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر بیڈ پر رکھتے ہوئے انہوں نے اس سے پوچھا۔ وہ جواباً خاموش رہی۔ وہ اب اس کے لیے سلاکس پر ٹکھن لگا رہے تھے۔

”جیم بھی لگاؤں؟“ انہوں نے آہستگی سے پوچھا اس نے فوراً ”سر ہلادیا۔ کل دوپہر اور رات کے کھانے میں اس نے صرف چند لمحے کھائے تھے اور اب اچانک ہی اسے بھوک کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے دوہرہ کا گلاس خالی کیا ہی تھا کہ بابا بھی کمرے میں آ گئے۔

”ہم لوگوں کو ڈرانے اور پریشان کرنے کے اہتمام ہو رہے ہیں۔“ انہوں نے مصنوعی خشکی سے اسے گھورا۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہوتی زبردستی مسکرائی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بابا۔“

”ہاں۔ کتنی ٹھیک ہو، تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔“ وہ بھی بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ بابا اور ڈیڈی دونوں کے چہروں پر اس کے لیے بہت ساری فکر مندی اور پریشانی تھی۔ وہ بظاہر اس کے ساتھ ہر اوجھڑائی کی باتیں کر رہے تھے مگر ان کی آنکھوں سے

اور پریشانی چھلک رہی تھی۔

ارتضیٰ دوبارہ کمرے میں آیا تو آفس کے لیے ہو کر۔ ”میں آفس جا رہا ہوں بابا! آپ لوگ تو ہیں۔“ اس کے پاس۔ ”بابا نے سر ہلادیا اسے جانے کی اجازت۔“

تو ان دونوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے اسے خدا حافظ کہا۔

ارتضیٰ نے اس کے لیے بہت فکر تھی۔

”آپ صبا کو ناشتہ کروائیں ڈیڈی! میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ وہ ڈیڈی سے کہتے ہوئے کمرے سے چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”طبیعت کیوں خراب کر لی بیٹا؟“ تیرے سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر بیڈ پر رکھتے ہوئے انہوں نے اس سے پوچھا۔ وہ جواباً خاموش رہی۔ وہ اب اس کے لیے سلاکس پر ٹکھن لگا رہے تھے۔

”جیم بھی لگاؤں؟“ انہوں نے آہستگی سے پوچھا اس نے فوراً ”سر ہلادیا۔ کل دوپہر اور رات کے کھانے میں اس نے صرف چند لمحے کھائے تھے اور اب اچانک ہی اسے بھوک کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے دوہرہ کا گلاس خالی کیا ہی تھا کہ بابا بھی کمرے میں آ گئے۔

”ہم لوگوں کو ڈرانے اور پریشان کرنے کے اہتمام ہو رہے ہیں۔“ انہوں نے مصنوعی خشکی سے اسے گھورا۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہوتی زبردستی مسکرائی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بابا۔“

”ہاں۔ کتنی ٹھیک ہو، تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔“ وہ بھی بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ بابا اور ڈیڈی دونوں کے چہروں پر اس کے لیے بہت ساری فکر مندی اور پریشانی تھی۔ وہ بظاہر اس کے ساتھ ہر اوجھڑائی کی باتیں کر رہے تھے مگر ان کی آنکھوں سے

اور پریشانی چھلک رہی تھی۔

ارتضیٰ دوبارہ کمرے میں آیا تو آفس کے لیے ہو کر۔ ”میں آفس جا رہا ہوں بابا! آپ لوگ تو ہیں۔“ اس کے پاس۔ ”بابا نے سر ہلادیا اسے جانے کی اجازت۔“

تو ان دونوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے اسے خدا حافظ کہا۔

ارتضیٰ نے اس کے لیے بہت فکر تھی۔

”آپ صبا کو ناشتہ کروائیں ڈیڈی! میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ وہ ڈیڈی سے کہتے ہوئے کمرے سے چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”طبیعت کیوں خراب کر لی بیٹا؟“ تیرے سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر بیڈ پر رکھتے ہوئے انہوں نے اس سے پوچھا۔ وہ جواباً خاموش رہی۔ وہ اب اس کے لیے سلاکس پر ٹکھن لگا رہے تھے۔

”جیم بھی لگاؤں؟“ انہوں نے آہستگی سے پوچھا اس نے فوراً ”سر ہلادیا۔ کل دوپہر اور رات کے کھانے میں اس نے صرف چند لمحے کھائے تھے اور اب اچانک ہی اسے بھوک کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے دوہرہ کا گلاس خالی کیا ہی تھا کہ بابا بھی کمرے میں آ گئے۔

”ہم لوگوں کو ڈرانے اور پریشان کرنے کے اہتمام ہو رہے ہیں۔“ انہوں نے مصنوعی خشکی سے اسے گھورا۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہوتی زبردستی مسکرائی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بابا۔“

”ہاں۔ کتنی ٹھیک ہو، تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔“ وہ بھی بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ بابا اور ڈیڈی دونوں کے چہروں پر اس کے لیے بہت ساری فکر مندی اور پریشانی تھی۔ وہ بظاہر اس کے ساتھ ہر اوجھڑائی کی باتیں کر رہے تھے مگر ان کی آنکھوں سے

اور پریشانی چھلک رہی تھی۔

ارتضیٰ دوبارہ کمرے میں آیا تو آفس کے لیے ہو کر۔ ”میں آفس جا رہا ہوں بابا! آپ لوگ تو ہیں۔“ اس کے پاس۔ ”بابا نے سر ہلادیا اسے جانے کی اجازت۔“

تو ان دونوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے اسے خدا حافظ کہا۔



مرتے دم تک نہیں زندگی کی آخری سانس تک نہیں۔ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں میں انکار نہیں کر سکتی۔ اب آپ میرے کمرے سے جاسکتے ہیں۔“ وہ اس پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈال کر اب دروازے کی طرف اشارہ کیے کھڑی تھی۔ گویا اسے باہر جانے کا راستہ بتا رہی ہو۔

”تم اس وقت بہت غصے میں ہو“ ہم بعد میں بات کریں گے۔“ وہ جیسے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے بیڈ پر سے اٹھا تھا۔

”آپ میرے ساتھ کبھی بھی بات کریں، میرا جواب ہمیشہ یہی ہو گا۔ میں کبھی بھی اس رشتے کو دل سے قبول نہیں کروں گی۔“

تمہاری علیحدگی کا فیصلہ ہم نے خوشی سے نہیں کیا تھا۔ بعض فیصلے کرتے وقت دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے لیکن پھر بھی ہمیں وہ فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ ایسا ہی فیصلہ وہ بھی تھا۔ تم نے بھی یہ نہیں سوچا تھا تو ایسا میں نے بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ اگر مجھے اس رشتے میں قبول کرنا تمہارے لیے مشکل ہے تو میرے لیے بھی تمہیں اس بدلے ہوئے رشتے میں قبول کرنا بہت مشکل ہے۔ میں نے کبھی تمہیں اس نظریے سے نہیں دیکھا۔ تم جانتی ہو میں تم سے ملتی محبت کرتا تھا۔ اس کے بعد کسی دوسری عورت کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا میرے پاس کوئی تصور ہی نہیں تھا اور دوسری بھی کوئی اور نہیں تم مگر یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جو مجھے ہم سب کی بہتری کے لیے کرنا پڑا۔ ہمارے اس گھر کے لیے ہمارے والدین کے لیے ان کی خوشیوں کے لیے۔“ وہ اس کے سامنے آکر رک گیا تھا۔ ایک ایک لفظ اس نے بہت فحش ٹھہر کر بولا تھا۔ یوں جیسے وہ ساری صورت حال اسے اچھی طرح سمجھنا چاہتا تھا۔

صبا کے چہرے پر موجود تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس پر وہی سختی وہی کھردرائی اور وہی سختی ابھی بھی موجود تھی۔ وہ اسی طرح دروازے کی سمت اشارہ کرتی اس کے باہر نکل جانے کی کھنکھرتھی۔ ار تفتنی کو

ایسا لگا جیسے وہ کسی پتھر سے سر ٹکرا رہا ہے۔ وہ کچھ ہی نہیں چاہتی تھی۔ ار تفتنی کو اپنا مزید کچھ کرنا ہمارے لیے کار نظر آیا۔ وہ ہار ماننے والے انداز میں دروازے کی طرف چلا گیا۔ اسے کمرے سے نکلتا دیکھ کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

وہ مرنے چاہتی تھی مگر کس طرح مرے؟ وہ دل کے پچھلے کئی سالوں سے اپنے آپ سے نفرت کر رہی تھی مگر اب اپنے آپ سے یہ نفرت شدید ہوتی جا رہی تھی۔ اسے نہ خود پر ترس آتا تھا نہ اس سے ہمدردی ہوتی تھی۔ اسے بس خود سے نفرت ہوتی تھی۔ صرف اور صرف نفرت۔ پہلے سے بھی یہ شدید نفرت۔

اسے یوں سب سے لاتعلقی اور بیگانگی کا رویہ اختیار کیے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ وہ سارا دن اپنے کمرے میں رہتی تھی۔ پیلا اور ڈیڈی میں سے بھی اسے اسے کھانے کے لیے بلانے آتا تو وہ سب کے سامنے کھانا کھانے سے انکار کر دیتی۔ رہشمال کے ہاتھ اس کے کمرے میں کھانا بھجوا یا جاتا تو کھانا کھا لیتی۔ ان کے خیال تھا چند دنوں تک ناراضی کا اظہار کرنے کے بعد خود نارمل ہو جائے گی مگر جب اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی تو ڈیڈی کی طرح پیلا بھی اس بات پر غصیدگی سے لینے پر مجبور ہو گئے۔ وہ اس کے پاس آئے، ہمیشہ کی طرح پیار بھرے لہجے میں وہ اسے سمجھانے لگے۔

”صبا! اس طرح کر کے تم یامیہ کو تکلیف پہنچا رہی ہو۔ اگر اس کی خوشی کی خاطر تم اس شادی کے راضی ہوئی تھیں تو اب اس کی خوشی ہی کے لیے تمہیں اسے ملنا بھی ہو گا۔ تم نے اگر اپنی ماں کے اپنے دل کی مرضی کے خلاف ایک فیصلہ کر لیا ہے اب اسے نبھانا بھی۔ ورنہ تمہارا ایثار اور نیکی ضائع ہو جائے گی۔“ وہ بے حسی سے بیٹھی انہیں بولتا رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی

نہیں ہوئی۔ وہ اپنے تم نے مجھ سے اس شادی کے لیے ہار مانے ہوئے کیا کہا تھا۔ میں جانتا ہوں، تم ایسا ہی چاہتی تھیں۔ تمہارے لیے ار تفتنی کو شوہر کی حیثیت میں قبول کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ تبدیلی اس کے لیے ناقابل قبول ہے لیکن صبا! تم ار تفتنی کا سوچو۔ تمہاری طرح اسے بھی تو یہ تبدیلی کر رہی ہوگی۔ اس نے بھی تو کبھی یہ نہیں سوچا کہ وہ تم سے شادی کرے گا۔ وہ اس تبدیلی کو قبول کرے گا تو تم کیوں نہیں۔ کوشش تو کرو بیٹا! میری بات سن کر دیکھو کچھ وقت لگے گا لیکن آہستہ آہستہ تم تبدیلی کو قبول کر لو گی۔ خود کو یوں سب سے الگ نہ رکھو۔ ار تفتنی کے ساتھ وقت گزارو، باتیں پہلے کی طرح۔ وہ تمہارا کزن بھی تو ہے۔ زندگی کا کام ہے انسان کے دل کو اللہ نے بڑا عجیب بنایا ہے۔ تبدیلیوں کو قبول کر لیتا ہے وہ تمہارا بہنوئی کبھی اب نہیں ہے۔ جب بہن نہیں رہی تو وہ رشتہ خوار ہی ختم ہو گیا۔“ انہوں نے بڑی ہر داری اور حوصلے سے اسے قائل کرنا چاہا مگر وہ قائل ہونے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ وہ اسی لاتعلقی سے خاموش بیٹھی رہا۔

تفتنی پیلا اور ڈیڈی کی پریشانی دیکھ رہا تھا۔ ڈیڈی جو بہت سے بہت خاموش اور بیٹھے ہوئے رہتے تھے۔ اچانک ہی وہ مایوس بھی نظر آنے لگے تھے۔ ڈیڈی کی وجہ سے آفس کے بعد شام کا پورا گھر پر گزرنے لگا تھا لیکن اس کی یہ تمام کوششیں اس گھر کی خاموشی اور دہرائی کو دور نہیں کر پاتی تھیں۔ اس گھر سے ماں کی گئی تھی اپنے ساتھ ساری باتیں بھی لے گئی تھی۔ وہاں سے عورت کا وجود ہر رشتہ میں ختم ہونا چاہتا تھا۔ وہاں دوا سیوں کے ہاتھوں نے قدم جمائے تھے۔ معذرت کے پاس عورت جھڑک کر بھاگ دیتی۔ وہ اس کی ڈانٹوں اور گالوں کے باوجود بھی اس کے پاس جاتا نہیں چھوڑتا تھا۔ یہ ماں کی ڈانٹ اور مار پر رو تاس کی گود میں

منہ چھپا کر ہے۔ وہ اس کے لیے اس کی ماں کی طرح ہی تھی۔ صرف ایک سال کی عمر میں اس سے سکی ماں چھین گئی تھی۔ ماں کے بعد وہ دوسرا سس جو بالکل ماں جیسا ہی لگا تھا وہ اسی کا تھا۔ وہ اس سے خفا تھا اس کے رویے پر اس سے بدظن تھا لیکن پھر بھی وہ اس کے پاس جانا چاہتا تھا۔

ار تفتنی آفس کے کام سے لاہور اور اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ وہاں سے دو دن بعد اس کی واپسی ہوئی تو اسے پیلا کی زبانی ڈیڈی کی طبیعت کے بارے میں پتا چلا۔ ان کا بیڈ پر لیٹر بہت بڑھا ہوا تھا۔ پیلا ان کی طرف سے فکر مند تھے ڈاکٹر کے پاس جانے اور دوا لینے سے بظاہر ان کا پی ٹی نارمل ہو گیا تھا مگر جو پریشانی انہیں لاحق تھی ان کے ساتھ اس کا زیادہ دیر تک نارمل رہنا ممکن نہیں تھا۔ ار تفتنی ان کی پریشانی اور بیماری کی وجہ سمجھتا تھا۔

پہلے درپے نمونے انہیں مڈھال کر دیا تھا۔ کھانے کے بعد اپنے کمرے میں جانے سے پہلے وہ روزانہ کی طرح صبا کے کمرے میں گئے تھے۔ ار تفتنی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جا رہا تھا جب اس نے ڈیڈی کو صبا کے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ڈیڈی صبا کے پاس سے آجائیں پھر وہ ان کے پاس جائے گا۔ وہ ان کے ساتھ جلی چٹائی کپ شپ کرنا چاہتا تھا۔

بیڈ پر بیٹھ کر اس نے سائیز ٹیبل پر سے وہ کتاب اٹھا لی جو چھپکے دس بارہ دنوں سے اس کے زیر مطالعہ تھی۔ اسے رات میں کچھ نہ کچھ پڑھ کر سونے کی عادت تھی اور یہ کتاب آج کل اس کی بیڈ بک بنی ہوئی تھی۔ ابھی اس نے بمشکل ایک پیرا گراف ہی پڑھا تھا کہ اسے صبا کی آواز آئی۔ وہ زور سے چلائی تھی۔ ار تفتنی کتاب بیڈ پر رکھتے ہوئے گھبرا کر اٹھا۔ اگر اس نے ابو سے کچھ اننا سیدھا بول دیا تو ان کی طبیعت فی الحال ایسی نہیں ہے کہ وہ اسے ہر داشت کر سکیں۔ وہ تقریباً بھانسا ہوا اپنے کمرے سے نکل کر اس کے کمرے میں آیا تھا۔



”جسے دیکھو مجھے سمجھانے اور نصیحتیں کرنے چلا آتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا“ آپ لوگ مجھ سے آخر چاہتے کیا ہیں؟“ وہ بہت چڑچڑے انداز میں بڑی تلخی سے بول رہی تھی۔ ڈیڈی بیڈ پر بیٹھے تھے اور وہ سامنے دیوار کے پاس کھڑی تھی۔ ڈیڈی نے اس سے کیا کہا ہوگا؟ وہ نہیں جانتا تھا لیکن جواب میں جو کچھ وہ بول رہی تھی اسے وہ سن رہا تھا۔ اسے کمرے میں آتا دیکھ کر وہ ذرا بھی نہیں چونکی تھی۔

”میری شادی آپ لوگوں نے اپنی پسند سے کی تھی۔ جہاں آپ لوگوں نے کہا میں نے شادی کروالی۔ آپ لوگوں نے میرے لیے صحیح شخص کا انتخاب نہیں کیا۔ یہ غلطی آپ لوگوں کی تھی، میرا اس میں کیا قصور تھا لیکن اس کی سزا مجھے ملی۔“ اس کے لہجے کی گستاخی نے ار تفتی کا خون کھولا دیا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے پاس آیا اور بے اختیار اس کے منہ پر ایک تھپڑ مار دیا۔ ”تم تمیز تہذیب سب بھول چکی ہو۔ تمہیں اتنا بھی لحاظ نہیں کہ اس وقت تم اپنے باپ سے مخاطب ہو۔“ وہ اتنی زور سے دھاڑا تھا کہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے لیٹے ہوئے بابا بھی چونک گئے تھے۔ وہ بھینٹ لگنے پر ایک دم خاموش ہو گئی تھی۔ اپنے بائیں گال پر ہاتھ رکھے وہ سکے کے عالم میں کھڑی تھی۔ ڈیڈی بیڈ پر سے یک لخت اٹھ گئے تھے۔ انہوں نے نہ ار تفتی کو کچھ کہا اور نہ صبا کو۔ وہ خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھ گئے تھے۔

”کیا ہوا ہے شفیق!“ بابا بوکھلائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ”کچھ نہیں۔“ وہ مختصراً جواب دے کر کمرے سے نکل گئے۔ انہوں نے نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں پہلے ڈیڈی کو دیکھا اور پھر ار تفتی اور صبا کو۔ ”صبا! اگر ڈیڈی کو کچھ ہوا ناں تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ اسے وارننگ دیتا دروازے کی طرف بڑھا۔ بابا اس کی بات سن کر اس سے بھی پہلے کمرے سے نکل کر ڈیڈی کے کمرے کی طرف بھاگے تھے۔ ار تفتی بھی ان کے پیچھے پیچھے ڈیڈی کے کمرے

میں آیا تھا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ ان دونوں کو متشکرانہ یقین دلانے کے لیے مسکراتے ہوئے بولے۔ ”آپ اس کی فکر کیوں کرتے ہیں ڈیڈی! آپ کے حال پر چھوڑ دیں، آپ اس کے لیے خود کو مت کریں پلیز۔“ وہ ان کے ہاتھ تھام کر بولا۔ وہ پریشانی دور کرنے کے لیے مسلسل مسکرا رہے تھے۔ بہت دیر تک وہ اور بابا وہیں بیٹھے ان کے ساتھ کرتے رہے تھے۔ صبا کے بارے میں بات کرتے علاوہ وہ لوگ باقی ہر موضوع پر بات کر رہے تھے۔ ”ار تفتی! تم جاؤ رات کافی ہو گئی ہے۔ میں شفیق کے پاس۔ ہم دونوں بھائی ابھی جاگ کر ساری باتیں کریں گے۔“ بابا نے گھڑی میں ایک دیکھ کر اسے سونے کے لیے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے دونوں کو شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکل آیا۔ اپنے کمرے میں جانے کے وہ لان میں آگیا تھا۔ وہ مضطرب تھا یونہی لان میں بے چین پھرتے اسے ڈھائی گھنٹے گزر گئے تھے مگر اس کی بے چینی ختم ہوئی تھی۔

”تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہیں ایک زوردار ماروں تو تم جواب میں کیا کرو گی؟“ ”آپ مجھے کبھی مار ہی نہیں سکتے۔“ ”بھئی فرض کر لو۔“ ”مجھے بہت دکھ ہوگا میں روؤں گی۔“

”اوہ میرے خدا۔“ وہ اچانک ہی اپنا سر پکڑ کر پر بیٹھ گیا۔ اس نے صبا کو بھینٹ مارا ہے۔ اس کے بے یقین کیا ہے۔ کتنا یقین تھا اسے اس بات پر کہ اسے کبھی مار نہیں سکتا۔ وہ اسے کبھی کوئی دکھ دے سکتا اور آج وہ اسے دکھ دے آیا تھا۔

”مجھے بہت دکھ ہوگا میں روؤں گی۔“ کیا اس نے وہ رو نہیں رہی ہوگی؟ وہ ایک دم ہی کرسی پر سے اٹھ اور تیزی سے درمیانی راستہ عبور کر کے گھر کے آگیا۔ اس کا رخ صبا کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ کھول کر اندر آیا تو وہ جس دیوار کے ساتھ اس

لی ہوئی تھی اب اسی سے کمر نکائے گھٹنوں پر سر تکی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس آگیا، کلپٹ پر وہ اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

”آہم سوری صبا!“ اس نے اس کے سر پر ہلکے سے رگڑا۔ اسے یہ بات یاد نہیں آ رہی تھی کہ سوری میں صبا کو بولنا چاہیے۔ اپنے پچھلے تمام رویوں کو کمرے کے ہر فرد سے۔ خاص طور پر ڈیڈی سے۔

”تمہارے ساتھ اس طرح مس لی ہو نہیں سکتی تھی۔“ وہ گھٹنوں پر سے اس کا سر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”میں نے بہت غلط حرکت کی۔ اپنی اس بد تمیزی کی میرے پاس کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ رو نہیں رہی تھی، دکھ بھی اس کی آنکھوں میں نہیں تھا کہ نہیں لیکن وہ اس کے بائیں گال پر ہاتھ رکھ رہا تھا۔ اسے خود پر نئے سرے سے غصہ

ڈیڈی دیر یونہی اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ بالکل اس طرح دیوار سے ٹیک لگا کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

صبا! تمہیں پتا ہے ہماری ماں باپ ہمارے لیے مالی کی طرف سے سب سے بہترین انعام ہوتے تھے۔ ہم نے ماں کھوئی ہے، بہت چاہنے والی ماں۔ کیا تم بات کا حوصلہ رکھتی ہو کہ باپ کو بھی کھو دو۔ باپ مار کرنے والے بابا کو کھو دو۔ مجھے اب بہت برے خیالات آنے لگے ہیں۔ اپنے اتنے پیاروں کو اس طرح آنا فنا رخصت ہوتے دیکھا ہے نا صبا! میں بہت ڈر گیا ہوں۔ پہلے خمن پھر ماں اور اب مجھے بہت ڈر لگتا ہے صبا! کیا تمہیں نہیں پتا کہ ہمارے لیے دعائیں کرنے والے سب لوگ ہم سے بہتر رخصت ہوتے چلے جا رہے ہیں صبا! یہ حال اس لیے ہے۔ ہم ان لوگوں میں سے کیوں نہیں ہیں جن کی قدر و منزلت ان کی زندگی میں نہیں ہوتی۔ ان کے مرنے کے بعد پہچانتے ہیں۔ بعد میں ان سے کیا حاصل۔ والدین سے محبت کرنی ہے، ان کی عزت کرنی ہے، ان کی قدر کرنی ہے تو ان کی



زندگی میں کرو۔ صبا! ہمارے پاں گنوانے کے لیے بہت کچھ اب بچا ہی نہیں ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ یہ بے دوت اور انمول چاہت ہم سے چھین نہ جائے۔ ہمارا کوئی رویہ ایسا نہ ہو جو اس طرح ان کا دل دکھائے کہ وہ دنیا ہی سے منہ موڑ جائیں۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کی آواز اتنی ہلکی تھی جیسے وہ سرگوشی کر رہا ہو۔ جملے کے اختتام پر جو اس نے سوالیہ انداز اختیار کیا تھا اس پر اس نے ایک دم چونک کر کارپٹ سے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ وہی چھوٹی سی ضدی سی صبا تھی اور وہ وہی پیپو رسا رتھنی۔ درمیان کے تمام سال جیسے کہیں غائب ہو گئے تھے۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"تم اس رشتے کو تسلیم نہیں کرتیں۔ میں اسے ماننے کے لیے تجھیں بھی مجبور بھی نہیں کروں گا لیکن صبا! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ بات صرف میرے اور تمہارے درمیان رہے۔ تمہارے لیے کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ میں تمہاری تائید و توثیق سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ کیا تم بیباک اور ڈیڈی کی خاطر ان کی خوشی کے لیے ان کی صحت اور ان کی سلامتی کے لیے انہیں یہ تاثر نہیں دے سکتیں کہ تم نے اس شادی کو قبول کر لیا ہے۔ ہم یہ راز کیا صرف خود تک محدود نہیں رکھ سکتے؟" وہ دوبارہ اسی ہلکی آواز میں بول رہا تھا۔ اس نے صبا پر سے نظریں ہٹائی تھیں لیکن وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"صبا! بیباک اور ڈیڈی مجھے بہت عزیز ہیں، مجھیں بھی ہیں۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا صبا! تو ہم کیا کریں گے؟" اس کے چہرے پر اواسی اور فکر مندی چھائی ہوئی تھی۔ خاموشی کا ایک طویل وقفہ ان دونوں کے درمیان آیا تھا۔ دوا پر لگا کلیڈز شاید ہوا سے ہلاتا تھا اس کے پٹے پر وہ دونوں چوکنے تھے گھڑی صبح کے ساڑھے چار بج رہی تھی۔ وہ بغیر کچھ کے اس کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔ اس نے صبا سے اپنی کسی بات کا جواب نہیں مانگا تھا۔ اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ اس کی بات سے

اتفاق کرتی ہے یا نہیں لیکن اسے جواب کا انتظار نہ اور یہ انتظار زیادہ لمبا بھی نہیں ہوا تھا۔ بیباک نے روزانہ کی طرح رشمال سے اسے ٹالنے کے لیے بلوایا تھا وہ منع کر دیا کرتی تھی مگر وہ اسے ترک نہیں کرتے تھے۔ حیرت اور خوشی کے مل جلے احساسات سے وہ اس وقت دو چار ہوئے جب ان بلانے پر وہ بہت ہچکچائے ہوئے انداز میں ڈانٹنا شروع میں داخل ہوئی۔ کسی کی بھی طرف دیکھے بغیر اس سلام کیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی اور ندامت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ نہ بیباک کی طرف دیکھ رہی تھی اور نہ ڈیڈی کی طرف۔ بیباک شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اس طرح ظاہر ہو گئے جیسے ان دونوں میں کچھ ہوائی نہیں تھا۔

"آج تم بھی ہمارے ساتھ صبح سے پشت در پشت خالی دو دھ میں بھی کوئی مزا ہے۔" انہوں نے اس سامنے آلیٹ کی پلیٹ رکھتے ہوئے کہا۔ اس پلیٹ اپنے سامنے کر لی اور آلیٹ کھانے لگی۔ صبا نے گاہے گاہے اس کی طرف دیکھ کر ضرور رہے تھے۔ انہوں نے اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ چھٹی کا دن اس لیے نہ بیباک اور رتھنی کو آس جانے کی فکر تھی نہ معاذ کو اسکول کی ٹینشن۔ ناشتہ کرتے ہوئے ان کے سامنے پھیلے ار رتھنی معاذ کو اخبار کے اچھے صفحے میں سے اس کی پسند کی خبریں پڑھ رہی تھیں۔ وہ اپنے پسندیدہ کھلاڑیوں کی تصویریں و فلموں کے متعلق دی گئی خبر سننا چاہتا تھا۔ ار رتھنی دل میں اصل جملہ پڑھتے ہوئے اسے آسان لگتا تھا۔ ایسا کہ وہ اسے سمجھ سکے بناتے ہوئے نہ صرف مصروف تھا۔ ار رتھنی اسے دیکھ کر کسی قسم کی خاموشی کا اظہار کیے بغیر معاذ کے ساتھ مصروف البتہ صبا کی طرف پوری طرح متوجہ تھے۔ ڈیڈی بھی تھے لیکن وہ بول کچھ نہیں رہے تھے۔ "کیا خیال ہے آپ سب لوگوں کا؟" انہوں نے گھومنے نہ چلیں۔ "ناشتہ ختم کر کے سب اپنے اپنے کمرے میں جا رہے ہیں۔ جب رتھنی نے بیک وقت سب کو مخاطب کیا

میں بیباک! سب سے پہلے جواب معاذ کو ہی دینا تھا اور اس نے دیا بھی تھا۔ "بیباک! میں ہے تمہارا صبا! امیو ہے تمہارا چلنے کا؟" اس نے براہ راست اسے مخاطب کیا۔ اپنی اسی ٹون میں وہ اس سے بات کیا کرتا تھا اس نے جواب دیا تھا۔ بیباک کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ایک ہی لمحے میں بیباک کی حالت ہو گئی وہ حیران تھا۔ رات میں بیباک سے لگتی بدتمیزی کی کبھی بیباک کو وہ بات یاد نہ آتی تھی۔ معاذ اور صبا کی طرح بیباک بھی جانے بھرتا ہو گئے تھے لیکن ڈیڈی کا جانے کا موڑ انہوں نے تقریباً دو ماہ سے ہزار نظر آرہے تھے۔ ایک دن جب رتھنی نے امیر امیو نہیں ہے۔" وہ منع ہوئے کرسی پر سے اٹھنے لگے تو وہ آہستہ آواز دیا۔

"آج تم بھی چلیں پلیز۔" اس کی نظریں اس کی صبا پر تھیں لیکن وہ مخاطب ان سے تھی۔ "نہ پلو اور تھنی متیں کرواؤ گے۔" بیباک نے صبا کی طرف سے گھورا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ پہلے ہی بہت شرمندہ نظر آرہی ہے۔ "معاذ مت کرو۔ ڈیڈی ان کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گئے تھے لیکن ان کا جانے کا ارادہ بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

رات کی باتوں سے انہیں سخت تکلیف پہنچی تھی۔ وہ لب اسے بٹھا کر یہ بتائیں کہ انہیں اس سے ہمت ہے اپنی جان سے بھی زیادہ۔ اپنی جان سے بھی اگر انہیں اس کے لیے خوشیاں خریدنی ہوتی ہیں تو وہ خرید لائیں گے۔ اور معاذ جلدی جلدی جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ معاذ نے بھاگتے دوڑتے اپنا بیٹ پال دیا۔ وہ دیکھ کھیلنے کا سالن گاڑی میں رکھا تھا۔ وہ اسے اس کے لیے بیٹھے تو اسے

تمہیں بتا رہا ہوں معاذ! جب واپس چلنے کو کہوں تو فوراً مان جانا۔" ار رتھنی نے کیٹ لگاتے ہوئے اسے وارننگ دی تو اس نے جھٹ گردن ہلا دی۔ وہ گاڑی کی کچھلی سیٹ پر معاذ کے برابر میں بیٹھی تھی۔ وہ چہرے پر حیرت کا بہت واضح تاثر لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے مخاطب کرتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا لیکن وہ اس سے بات کیے بغیر وہ بھی نہیں سکتا تھا۔

"آپ ہمارے ساتھ کرکٹ کھیلیں گی؟" "ہو کیاں کرکٹ نہیں کھیلیں۔ تم بیباک لوگوں کے ساتھ کھیلنا میں تمہیں کھیلنے ہوتے دیکھوں گی۔" اس نے بغیر جھڑکے اس کی بات کا جواب دیا۔ اگرچہ لہجے میں وہ شوخی اور وہ شرارت نہیں تھی جو اس سے بات کرتے وقت خود بخود ہی پیدا ہو جاتا کرتی تھی لیکن سختی اور کرختی بھی نہیں تھی۔

وہ لوگ ساحل پر آگئے تھے۔ بیباک ار رتھنی اور معاذ کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھے۔ جتنی تیزی سے معاذ کے موڈ تبدیل ہو رہے تھے اتنی تیزی سے ان کے کھیل بھی تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ اسے اتنی سی درمیان میں دھیر سا رے کھیل کھیلنے تھے۔ ڈیڈی بیباک اور معاذ کے بلانے پر بھی کھیلنے کے لیے نہیں آتے تھے۔ "میں اور صبا تماشا لٹی ہیں۔" انہوں نے معاذ سے کہا۔ وہ ان لوگوں کو کھیلنے ہوئے دیکھ رہے تھے اور وہ ان کے برابر میں بیٹھی خود ان کو۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی ان سے معافی مانگنے کی۔ وہ بس خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ رشتہ بہت انمول اور بہت قیمتی ہے۔ اگر ایک بار کھو جائے تو پھر دنیا کی بھرپور میں دوبارہ بھی ملنا نہیں ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہے تھے مگر پھر بھی اس کے احساسات سے بخوبی آگاہ تھے۔ باب تھے اس کے اس کی شرمندگی اور آنکھوں کی التجا بغیر دیکھے بھی محسوس کر سکتے تھے۔ وہ اس انتظار میں بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے کہ وہ معافی مانگنے کی تو میں تب ہی معاف کروں گا۔ بغیر کچھ کے انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ان کے اس طرح کرنے سے اس کی ہمت بندھ گئی تھی۔



ارتضیٰ، صبا کا تایا زاد بھائی تھا۔ صبا، ارتضیٰ سے سات سال چھوٹی تھی، وہ گھر بھر کی لاڈلی ہونے کے ساتھ ارتضیٰ کی بہت پیاری سی دوست بھی تھی۔ جس کا وہ ہمیشہ خیال رکھتا تھا۔ اور صبا اس سے بہت متاثر تھی۔  
ارتضیٰ کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس محرومی، غیر معمولی ذہانت، قابل رشک تعلیمی کارکردگی اور خدا داد وجاہت کے باعث وہ بچپن سے ہی توجہ کا مرکز رہا۔ صبا اس پر بہت انحصار کرتی تھی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ جذبہ ایک نئے رنگ میں ڈھل گیا اور اس کا احساس اسے اس وقت ہوا جب اس کی بہن ثمن، سڈنی (آسٹریلیا) سے مستقل پاکستان آ گئی۔

ثمن کو بچپن میں اس کے ماموں اور عمائی اولاد نہ ہونے کی بنا پر بیٹی بنا کر لے گئے تھے۔ ایک حادثے میں وہ جاں بحق ہو گئے تو ثمن اپنے حقیقی ماں باپ کے پاس واپس آ گئی۔ یہاں آکر وہ بمشکل اس ماحول میں ایڈجسٹ ہو پائی اور ارتضیٰ نے اس ایڈجسٹمنٹ میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی دوران اس نے ثمن کو اپنے دل میں وہ مقام دے دیا جس تک صبا بھی رسائی حاصل نہیں کر سکی تھی۔ صبا اس کے لیے ہمیشہ ایک چھوٹی سی بچی رہی تھی۔ خود صبا اپنے جذلوں سے لاعلم تھی۔ ارتضیٰ کی توجہ ثمن کی جانب پا کر وہ کشمکش کا شکار ہو جاتی۔ بیک وقت وہ شدید محبت اور رقابت کے جذلوں میں گھر گئی تھی۔

منفاد کیفیات کے باعث اس کی اپنی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگی۔



بالآخر ثمن اور ار تفضی کی شادی ہو گئی۔ اور صبا اپنے جذبات کا گلا کھونٹ کر خاموش ہو گئی۔ وہ احتجاج بھی نہیں کر سکی۔ اس لیے کہ ار تفضی نے ہی اسے قابلِ توجہ نہیں سمجھا تھا۔ وہ اسے چھوٹی بچی ہی سمجھتا رہا۔ جبکہ وہ اپنی عمر سے کہیں آگے کا سفر طے کر چکی تھی۔ شادی کی رات، جذبات کی شدت میں بے اختیار ثمن کے مرنے کی دُعا مانگی۔ شادی کے بعد ثمن اور ار تفضی لاہور چلے گئے۔ ثمن اسے اپنی خوشیوں کی سب سے بڑی دشمن نظر آتی ہے اور پھر چھٹیوں میں اسے بادلِ خواستہ سب کے اصرار پر ثمن کے پاس لاہور آنا پڑا۔

۴  
چوتھی اور آخری قسط



third part ke kuch pages  
missing hain  
aap us ki summary parh  
ker guzara ker lein  
copied from web

A stylized handwritten signature in blue ink, featuring a large loop and a small star-like mark.



ارتضیٰ، صبا کا تایا زاد بھائی تھا۔ صبا، ارتضیٰ سے سات سال چھوٹی تھی، وہ گھر بھر کی لاڈلی ہونے کے ساتھ ارتضیٰ کی بہت پیاری سی دوست بھی تھی۔ جس کا وہ ہمیشہ خیال رکھتا تھا۔ اور صبا اس سے بہت متاثر تھی۔  
ارتضیٰ کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس محرومی، غیر معمولی ذہانت، قابل رشک تعلیمی کارکردگی اور خدا داد وجاہت کے باعث وہ بچپن سے ہی توجہ کا مرکز رہا۔ صبا اس پر بہت انحصار کرتی تھی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ جذبہ ایک نئے رنگ میں ڈھل گیا اور اس کا احساس اسے اس وقت ہوا جب اس کی بہن ثمن، سڈنی (آسٹریلیا) سے مستقل پاکستان آ گئی۔

ثمن کو بچپن میں اس کے ماموں اور عمائی اولاد نہ ہونے کی بنا پر بیٹی بنا کر لے گئے تھے۔ ایک حادثے میں وہ جاں بحق ہو گئے تو ثمن اپنے حقیقی ماں باپ کے پاس واپس آ گئی۔ یہاں آکر وہ بمشکل اس ماحول میں ایڈجسٹ ہو پائی اور ارتضیٰ نے اس ایڈجسٹمنٹ میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی دوران اس نے ثمن کو اپنے دل میں وہ مقام دے دیا جس تک صبا بھی رسائی حاصل نہیں کر سکی تھی۔ صبا اس کے لیے ہمیشہ ایک چھوٹی سی بچی رہی تھی۔ خود صبا اپنے جذلوں سے لاعلم تھی۔ ارتضیٰ کی توجہ ثمن کی جانب پا کر وہ کشمکش کا شکار ہو جاتی۔ بیک وقت وہ شدید محبت اور رقابت کے جذلوں میں گھر گئی تھی۔

منفاد کیفیات کے باعث اس کی اپنی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگی۔



بالآخر ثمن اور ار تفضی کی شادی ہو گئی۔ اور صبا اپنے جذبات کا گلا کھونٹ کر خاموش ہو گئی۔ وہ احتجاج بھی نہیں کر سکی۔ اس لیے کہ ار تفضی نے ہی اسے قابلِ توجہ نہیں سمجھا تھا۔ وہ اسے چھوٹی بچی ہی سمجھا رہا۔ جبکہ وہ اپنی عمر سے کہیں آگے کا سفر طے کر چکی تھی۔ شادی کی رات، جذبات کی شدت میں بے اختیار ثمن کے مرنے کی دُعا مانگی۔ شادی کے بعد ثمن اور ار تفضی لاہور چلے گئے۔ ثمن اسے اپنی خوشیوں کی سب سے بڑی دشمن نظر آتی ہے اور پھر چھٹیوں میں اسے بادلِ خواستہ سب کے اصرار پر ثمن کے پاس لاہور آنا پڑا۔

۴  
چوتھی اور آخری قسط



ہوئے کر سی پر بیٹھ گئی تھی۔  
 ”تم نہ بھی جانتیں تب بھی لاؤنج میں بیٹھے ہوئے  
 مجھے صرف خوشبو ہی سے پتا چل گیا تھا کہ آج کچن کو  
 کس نے رونق بخشی ہوئی ہے۔“ وہ شرارتی موڈ میں  
 تھا۔

”صبا کے پکائے ہوئے کھانوں میں کچھ الگ خوشبو  
 ہوتی ہے بابا!“ ار ترضی نے اخبار سے نظریں اٹھا کر  
 انہیں دیکھا۔

”صرف صبا کے کھانوں میں نہیں بلکہ ہر بیٹی کے  
 ماں کے، بہن کے، بیوی کے کھانوں کی خوشبو ایسی ہی  
 ہوتی ہے۔ یہ خوشبو تو رشتوں کی ہے۔ ان کی تیاری  
 میں محنت کے ساتھ ساتھ محبت بھی شامل ہوتی ہے۔  
 یہ خوشبو محبت کی خوشبو ہے۔“ انہوں نے پیار بھری  
 نگاہ صبا پر ڈالی۔

”بابا! آپ نے صبح صبح ادبی قسم کی گفتگو کرنا شروع  
 کر دی ہے۔ بانی داوے بابا! جن کے گھروں کی خواتین  
 پھوہڑ ہوتی ہیں کیا ان کے کچن میں سے بھی محبت کی  
 یہی خوشبو آتی ہے؟“ ار ترضی بابا کو چھیڑ رہا تھا۔ ڈیڈی  
 اس کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔ بابا کے لبوں  
 پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اپنے کمرے میں آکر ار ترضی سب سے پہلے  
 ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔ اس کمرے کے کونے کونے  
 میں شمن کی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس کے کپڑے،  
 اس کے میک اپ کا سامان، اس کی جیولری اور دیگر بہت  
 سی اشیاء۔ شمن کی استعمال کی ان تمام چیزوں میں سے

صبح اس کی آنکھ کھلی تو تھوڑی دیر وہ یونہی لیٹی  
 اسٹڈی کی دیواروں اور چھت کو گھورتی رہی۔ وہ عجیب  
 سے احساسات سے دوچار ہو رہی تھی۔ اس تبدیلی کو  
 قبول کرنا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ وہ نکیہ اور چادر  
 اٹھا کر اسٹڈی سے نکل کر کمرے میں آئی تو کمرہ خالی پڑا  
 تھا۔ اسے وہاں ار ترضی کی غیر موجودگی بڑی اچھی لگی۔  
 باہر آتے ہی یوں لگا جیسے اسے کسی قید سے رہائی ملی ہو۔  
 بابا اور ڈیڈی لاؤنج میں بیٹھے اخبار کا مطالعہ کرتے  
 ہوئے آپس میں مختلف خبروں پر تبادلہ خیال بھی  
 کر رہے تھے۔ وہ ان دونوں کو سلام کرتے ہوئے کچن  
 میں آگئی۔ آج بہت دنوں بعد بلکہ ایک طویل عرصہ بعد  
 اس کا اپنے گھر والوں کے لیے اپنے ہاتھوں سے ناشتہ  
 بنانے کا دل چاہ رہا تھا۔ ریشمال اسے کچن میں آتے  
 اور پھر اتنی پھرتی سے کام کرتے دیکھ کر بڑی خوش نظر  
 آ رہی تھی۔

”آج گھر میں بہت اچھا لگ رہا ہے۔ بڑی رونق  
 لگ رہی ہے۔“ وہ کچھ جھجکتے ہوئے اپنے دل کی  
 بات اس سے کہہ گئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے  
 ساتھ لگائے ناشتے کی تیاری میں مصروف رہی۔  
 ریشمال سے ناشتہ لگواتے ہوئے اس نے ندیم سے  
 سب کو بلا کر لے آنے کے لیے کہا۔ وہ کچن سے نکل کر  
 ڈرائنگ روم میں آئی تو وہاں سب آچکے تھے۔

”آج تو کچن میں سے خوشبو میں ہی الگ طرح کی  
 آ رہی تھیں۔“ بابا اسے دیکھ کر شوخی سے بولے۔  
 ”آج ناشتہ میں نے بنایا ہے۔“ وہ جواباً مسکراتے



کسی ایک چیز کو بھی اس نے بھی یہاں سے ہٹانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وارڈروب کھول کر اس نے اس میں سے شمن کے سب کپڑے باہر نکال لیے تھے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے دل کو بہت تکلیف ہو رہی تھی لیکن اسے شمن کے سامنے کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ وہ جانتی ہے یہ بات کہ ار تفضی ایسا ان سب لوگوں کی خاطر کر رہا ہے جن سے خود شمن کو بھی بہت پیار تھا۔ ماما ڈیڈی بابا صبا ظفر اور معاذ۔ اس نے وہاں صبا کے کپڑوں کے لیے جگہ کر دی تھی۔ ریشماں کو بلا کر اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر سے شمن کے میک اپ کا سب سامان ہٹا دیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے گیٹ روم میں رکھا ہوا صوفہ کم بیڈ اپنی اسٹڈی میں لا کر رکھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ آفس کے لیے تیار ہونے لگا۔ بیج ٹائم ہو چکا تھا لیکن اس کا کھانے کے لیے گھر پر رکنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ صرف دس منٹ میں وہ تیار ہو کر پورچ میں آگیا۔

”صبا کو بتا دینا میں آفس چلا گیا ہوں۔“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے اس نے ندیم سے کہا۔

\*\*\*

معاذ اسکول سے آکر سیدھا اس کے پاس آگیا۔ بابا اور ڈیڈی گھر پر نہیں تھے اسی لیے وہ اپنے کمرے میں تھی۔ معاذ نے حسب عادت سب سے پہلے اسے اپنے اشار زد کھائے پھر اس کے بعد آج میوزک کی کلاس میں کیا کیا ہوا سنانا شروع ہو گیا۔ وہ اگر بہت زیادہ دلچسپی لے کر اس کی بات نہیں سن رہی تھی تو جھڑکا بھی نہیں تھا۔

”ہالہ جانی! آپ میری ماما بن گئی ہیں نا۔“ معاذ کے اس سوال پر اسے کرنٹ سا لگا۔ وہ پوری کی پوری چونک گئی۔

”تم سے کس نے کہا معاذ!“ اس کے منہ سے بہت مری ہوئی آواز نکلی۔

”مجھے ظفر ماماں نے بتایا تھا اور بابا نے بھی۔“ اس

نے ماما کی اور معصومیت سے جواب دیا۔

”معاذ! تمہاری ماما شمن ہے۔ تم نے دیکھی ہیں ناں ان کی تصویریں اور موویز۔“ بجائے غصے سے جواب دینے کے وہ اسے نرمی سے بتانے لگی۔

”ہاں وہ تو ہیں لیکن انہیں اللہ میاں نے اپنے پاس جو بلا لیا ہے۔“ اس نے جھٹ جواب دیا۔ ”آپ کی بیبا کے ساتھ شادی ہو گئی ہے ناں؟“ وہ اس سے بھی زیادہ بڑے بڑے اور مشکل سوالات کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اکیسویں صدی کے اس بچے سے وہ کسی بھی سوال کی توقع کر سکتی تھی۔ وہ اسے جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ اسے اقرار میں گردن ہلانی پڑی۔

”میں آپ کو ماما بولا کروں؟“ وہ اپنے اصل سوال کی طرف آگیا۔

”نہیں۔“ اب کی بار اس کے جواب میں سختی شامل ہو گئی تھی۔ ”اسکول سے آکر سب سے پہلے منہ ہاتھ دھو کر پونیفارم بدلنا چاہیے باقی ساری باتیں اس کے بعد ہونی چاہئیں۔ جاؤ جائز انیتا آئی سے منہ ہاتھ دھلوا کر کپڑے بدل لو۔“ وہ اس کے لہجے میں موجود سختی اور بیگانگی پر بد دل اور مایوس سا وہاں سے اٹھ گیا۔

”ماما! معاذ مجھ سے ڈانٹیں کھانے کے لیے تمہارہ گیا ہے۔ شمن بھی نہیں ہے، آپ بھی نہیں ہیں۔ میں اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس نہیں ہوں۔ وہ گورنس کے رحم و کرم پر رہ گیا ہے۔“ اسے اس وقت کوئی بھی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ صوفے پر یونہی بیٹھی رہتی۔ اگر بابا اور ڈیڈی اندر نہ آگئے ہوتے تو انہیں دیکھ کر اسے مسکراتا پڑا۔

”کچھ پریشان لگ رہی ہو بیٹا!“ ڈیڈی نے پتا نہیں کیسے اس کی پریشانی محسوس کر لی۔

”معاذ کی شاپنگ کرنی ہے ڈیڈی! اس کے پچھلے سیزن کے سب کپڑے چھوٹے ہو گئے ہیں۔“ وہ انہیں سنجیدگی سے بتانے لگی تو بابا مسکراتے ہوئے بولے۔

”اتنی سی بات پر پریشان ہے میری بیٹی! چلو ابھی چلے چلتے ہیں معاذ کے لیے کپڑے خریدنے۔“



”اب ابھی تھکے ہوئے آئے ہیں۔“ اس نے انکار تو کیا لیکن اس میں زیادہ شدت نہیں تھی۔ یعنی اسے ان کی تسکین کی فکر بھی تھی اور وہ جانا بھی چاہتی تھی۔

”تسکین کا کیا ہے“ ابھی ایک کپ چائے کا پیوں گا اور بالکل فریش ہو جاؤں گا۔“ وہ کھل کر مسکرائے۔ بابا اور ڈیڈی لباس بدل کر دوبارہ لاؤنج میں آئے تو اتنی دیر میں وہ ان کے لیے چائے بنا چکی تھی۔ وہ دونوں اس کے رویے میں پیدا ہوتی مثبت تبدیلیوں پر بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ بابا نے آفس میں موقع ملتے ہی ار تضحیٰ سے وہ جادوئی اسم بھی پوچھا تھا جو اس نے صبا پر بڑھ کر پھونکا تھا۔ ان کے شرارتی انداز پر اس نے ہنس کر اتے ہوئے انہیں بتانے سے انکار کر دیا تھا۔

معاذ لان میں کھیل کر اندر آچکا تھا۔ اس نے شاپنگ پر جانے کا سنا تو خود بھی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ اب بابا کے چائے ختم کر لینے کا منتظر تھا۔ ار تضحیٰ گھر واپس آیا تو بجائے اپنے کمرے میں جانے کے لاؤنج میں سب لوگوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”ار تضحیٰ صحیح ٹائم پر آگیا ہے۔ اب میرے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم تینوں چلے جاؤ۔“ بابا چائے کا کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے اس سے بولے۔ اسے بابا کی اس بات سے سخت کوفت ہوئی۔ خود پر بھی غصہ آیا کہ بابا کے سامنے یہ مسئلہ رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کسی سے کچھ کہے بغیر وہ کل دن میں ڈرائیور کے ساتھ جا کر بھی تو شاپنگ کر سکتی تھی۔

”کہاں جاتا ہے؟“ ار تضحیٰ نے بابا کی بات سننے کے بعد یہ سوال اس سے پوچھا۔

”معاذ کی شاپنگ کرنی ہے صبا کو۔“ اس سے پہلے جواب بابا ہی نے دے دیا۔

”چلو۔“ وہ فوراً اٹھ گیا تھا۔

”چائے وائے پی لو“ تھوڑا سستا لو۔“ بابا کے کہنے پر وہ لاشی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”ہائے ابھی آفس سے اٹھنے سے تھوڑی دیر پہلے لی تھی اب وہاں نہیں ہے۔“ وہ اب کسی بھی طرح

جانے سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے جانے کے لیے اٹھنا ہی پڑا۔ معاذ ان دونوں سے بھی پہلے بھاگتا ہوا پورچ میں چلا گیا تھا۔ وہ ٹمن سے شادی کے بعد بھی بے شمار مرتبہ اس کے ساتھ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ ابھی وہاں بیٹھنا اسے برا نہیں لگا تھا۔ آج اس سیٹ کا دروازہ ہی اس نے بڑی دقتوں سے کھولا۔ ار تضحیٰ اکیٹشن میں چابی گھماتا گاڑی میں اس کے بیٹھنے کا منتظر تھا۔ وہ وہاں بیٹھی تو اسے ار تضحیٰ سے معاذ سے اپنے آپ سے دنیا کی ہر چیز سے نفرت ہونے لگی۔ شاپنگ کے لیے اس کا سارا شوق یک دم ہی ختم ہو گیا تھا۔ ار تضحیٰ اس سے دو مرتبہ یہ بات پوچھ چکا تھا کہ کہاں چلنا ہے اور وہ جیسے اس کی آواز ہی نہیں سن رہی تھی۔

”ہالہ جانی! بابا آپ سے بول رہے ہیں۔“ معاذ پیچھے سے زور سے چلایا تو وہ چونکی۔ ار تضحیٰ نے اپنا سوال دہرایا۔

”کہیں بھی۔“ وہ بے دلی سے بولی۔ ار تضحیٰ نے اس سے مزید کچھ بھی نہیں پوچھا۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ بازار آکر بھی اس کی بیزاری اور لا تعلقی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ار تضحیٰ خاموشی سے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

”بس کریں“ اب میں بور ہو گیا۔“ اس کی شاپنگ ختم نہ ہوتی دیکھ کر معاذ نے کہا۔ اسے اب کپڑوں اور جوتوں کی دکانوں میں مزید کشش نظر نہیں آرہی تھی۔ معاذ کی وجہ سے اس نے مزید خریداری کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ار تضحیٰ کو گاڑی کی طرف جانا دیکھ کر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے ایک دکان کی طرف لے جانے لگا۔

”مجھے کریون اسٹیکس چاہئیں۔“ وہ اسے ہاتھ پکڑ کر اپنی مطلوبہ دکان پر لے آیا۔ وہ دونوں اس کے ساتھ وہاں آگئے تھے۔ وہاں آکر وہ مزید چیزیں خریدنے کے لیے بے قرار ہوا تھا۔ اسے پوسٹر کلرز بھی چاہے تھے۔ رنگین پیسلز بھی چاہے تھیں۔ وائر کلرز بھی چاہے تھے۔ ار تضحیٰ وہ سب چیزیں خرید رہا تھا۔ معاذ



اس خریداری پر پہلے والی خریداری کے مقابلے میں  
کیس زیادہ خوش تھا۔ اس نے وہاں سے الم فلم ڈھیر  
ساری چیزیں خریدی تھیں۔

”صبا! معاذ کا یہ شوق بالکل تمہارا جیسا نہیں ہے۔“  
دکان سے باہر نکلتے ہوئے وہ بے ساختہ بولا۔ اسے صبا  
کے لیے ایسی بہت سی چیزیں خریدنا اچانک ہی یاد آگیا  
تھا۔ اسے بھی تو معاذ کی طرح ہی کا شوق تھا۔ رنگ  
برنگے پین پنسلیں، مارکرز، کرپوز اور کلرنگ پینسلز  
جمع کرنے کا۔ وہ جواباً ”جپ رہی۔“

معاذ کو آکس کریم کھلا کر وہ لوگ گھر واپس آگئے  
تھے۔ ڈیڈی فون پر کسی سے بات کر رہے تھے اور بابا  
وہیں بیٹھے لی وی دیکھ رہے تھے۔ ان دونوں نے ان  
تینوں کو اندر آتے ہوئے بڑے غور سے دیکھا۔ کتنے  
اچھے لگ رہے تھے وہ لوگ ایک ساتھ آتے ہوئے۔  
معاذ ان کے کہنے سے بھی پہلے شاپنگ بیگ میں  
سے انہیں اپنی خریداری دکھا رہا تھا۔ اپنے کلرز اور  
پینسلز وغیرہ۔ بابا اس کی سب چیزیں بڑی دلچسپی سے  
دیکھ رہے تھے۔ ڈیڈی بھی فون بند کر کے ان لوگوں کی  
طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ بابا کا شوق دیکھتے ہوئے  
انہیں معاذ کے لیے خریدے گئے کپڑے دکھانے  
لگی۔

”اور تم نے کیا خریدا؟“ وہ سب کچھ دکھا کر  
کپڑے واپس ڈیوں اور تھیلوں میں رکھنے لگی تو بابا نے  
فورا ”پوچھا۔“

”میں نے؟“ وہ اپنی طرف اشارہ کر کے حیران  
ہوئی۔

”مجھے اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں خریدا تھا بابا!“ اس  
کا جواب سن کر انہوں نے ار تفضی کی طرف خفگی سے  
دیکھا۔

”تم نے صبا کو شاپنگ نہیں کرائی۔“

”اس نے کہا ہی نہیں۔“ وہ بابا کی خفگی پر شرمندہ  
ہوا۔ اب وہ انہیں کیا بتا کہ وہ اس کے ساتھ شاپنگ پر  
جاتا ہی نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ گاڑی تک  
میں نہیں بیٹھنا چاہتی تھی۔ اس کی کرائی ہوئی شاپنگ

کو وہ کس طرح قبول کر سکتی تھی۔

”بھئی واہ! کیا بات ہے۔“ وہ ار تفضی کے جواب پر  
مزید خفا ہوئے۔

”اس نے کہا نہیں“ اس لیے تم نے اس کے لیے  
کچھ خریدا نہیں۔ وہ اپنے لیے کب کچھ بولتی ہے۔  
میری بیٹی معصوم اور سیدھی سادی ہے۔ اس کا یہ  
مطلب بھی نہیں ہے کہ تم اس کی سادگی کا ناجائز فائدہ  
اٹھاؤ۔“

”آپ خفا تو مت ہوں۔ اچھا میں صبا کو کل ساتھ  
لے جا کر ڈھیر ساری شاپنگ کرواؤں گا۔“ وہ ان کا غصہ  
ختم کرنے کے لیے فورا ”وعدہ کرنے لگا۔“

”میرے کہنے سے ناں۔ خود سے تو تمہیں خیال  
نہیں آیا۔“ وہ ہنوز برہم تھے۔ وہ بغیر برامانے بابا سے  
سوری کہنے لگا تھا۔ وہ معاذ کی چیزیں واپس تھیلوں میں  
ڈالتے ہوئے یہ گفتگو سن رہی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد ار تفضی کمرے میں جلدی  
چلا گیا۔ وہ بہت دیر بعد کمرے میں آئی تھی۔ وہ بیڈ پر نیم  
درا زلی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ  
کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو (سائیکلو پیڈیا)

شائع ہو گیا ہے

خوبصورت سرورق، آفٹ چھپاؤ، مضبوط جلد،

قیمت 450 روپے

پتہ ذیل سے خریدیں

• مکتبہ عمران ڈائجسٹ، اردو بازار کراچی

• احمد نیوز ایجنسی، فریئر مارکیٹ کراچی

• سلطان نیوز ایجنسی، اخبار مارکیٹ لاہور

• اشرف بک ایجنسی راولپنڈی • مہران نیوز ایجنسی حیدرآباد

• بلدیہ ڈاک خانہ مکتبہ عمران ڈائجسٹ کراچی

37 اردو بازار



آواز پر وہ بالکل نہیں چونکا۔ اس کی نظریں اسی طرح اسکرین پر مرکوز تھیں۔ اس نے نہ نیوی پر سے نظریں ہٹائی تھیں اور نہ اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ اسی طرح سووی دیکھنے میں مگن رہا۔ وہ خود بھی وہاں ایک سیکنڈر کے بغیر تیزی سے اسٹڈی میں چلی گئی۔ اس نے اسٹڈی میں پیدا ہوئی تبدیلی کو بغور دیکھا۔ اسے کارپٹ پر لیٹنے میں بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اب یہ سہولت فراہم کی گئی تو اسے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ دوسرے دن شام میں آفس سے آکر وہ اس سے پوچھنے لگا۔ ”چلنا ہے شاپنگ کے لیے۔“ وہ معاذ کو ہوم ورک کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے فوراً ”انکار میں گردن ہلا دی تھی۔“ ”دیکھ لیں بابا آپ! میں اس سے شاپنگ کے لیے کہہ رہا ہوں یہ منع کر رہی ہے پھر آپ مجھے کچھ مت کہیے گا۔“ اس نے کچھ فاصلے پر بیٹھے بابا سے با آواز بلند شکایتی لہجے میں کہا۔ وہ ڈیڈی کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔ اس کی شکایت پر انہوں نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”اب نہیں ہے اس کا موڈ تو کیا وہ زبردستی جائے۔“ انہوں نے پھر صبا کی طرف داری کی۔ ار تضحیٰ بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

”ویسے صبا! منع کر کے تم اچھا نہیں کر رہی ہو۔ یہی تو موقع تھا اس کی جیب خالی کروانے کا اور دیکھنا اب یہ جلدی جلدی بلکہ روزانہ تم سے شاپنگ پر جانے کے لیے کہا کرے گا یہ سوچ کر کہ صبا نے تو انکار کر رہی دینا ہے۔“ وہ اب صبا سے مخاطب تھے۔ ڈیڈی بھی ان کے شرارتی انداز پر ہنسنے لگے تھے۔

”بے فکر رہیں بابا! میں اگلی بار انکار نہیں کروں گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے انہیں یقین دلایا۔ ار تضحیٰ ان سب کو گفتگو کرتا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اپنے گھر کا یہ ماحول کتنا اچھا اور مانوس سا لگ رہا تھا۔



زندگی میں بظاہر سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ بابا اور

ڈیڈی کے سامنے دونوں آپس میں بہت باتیں کرتے تھے۔ بالکل پہلے والے انداز میں اور کمرے میں آکر وہ ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہو جایا کرتے تھے۔ ار تضحیٰ کو اپنے کسی دوست کے ہاں ڈنر پر جانا تھا۔ صبح ناشتے کی میز پر اس نے سر سرئی سے انداز میں اس بات کا ذکر کیا۔

”تم صبا کو اپنے ساتھ کسی ڈنر اور پارٹی میں نہیں لے کر جاتے۔“ بابا چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اس سے بولے۔

”اس کا موڈ ہی نہیں ہوتا جانے کا“ اس لیے میں پوچھتا بھی نہیں۔“ اس نے اتنے اعتماد سے جھوٹ بولا جیسے یہ موضوع بڑی تفصیل کے ساتھ اس کے اور صبا کے درمیان زیر بحث آچکا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے پاس آنے والے اکثر دعوت ناموں میں دوبارہ سے مسز ار تضحیٰ غنفر کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کے قریبی دوستوں کے علاوہ کاروباری حوالے سے ملنے والے انویٹیشنز میں بھی اس کے ساتھ ساتھ اس کی مسز کا بلاوا بھی ایک دفعہ پھر آنے لگا تھا۔

”صبا! یہ لوگوں سے میل جول سے بیزاری اور دنیا سے کٹ کر رہنے والا رویہ بالکل اچھا نہیں ہے بیٹا!“ بابا اب اس سے مخاطب تھے۔ وہ خاموشی سے ان کی نصیحت سن رہی تھی۔ ”بزنس ڈنرز اور پارٹیز میں چاہے یہ نہ جائے لیکن تم اپنے دوستوں کے ہاں تو اسے لے کر جایا کرو۔ نہیں جاتی تو زبردستی لے کر جاؤ۔ تمہیں شوہروں والا رعب جمانا بھی نہیں آتا۔“ وہ جیسے ار تضحیٰ کو اس کے ساتھ سختی سے پیش آنے کے لیے اکسارے تھے۔

”بابا! آپ میرے خلاف بول رہے ہیں۔“ اس نے بابا کی طرف افسوس سے دیکھا۔

”ایسی حرکتیں کرو گی تو تمہارے خلاف بولنا پڑے گا۔ ذرا دیکھو کیا حالت بنائی ہوئی ہے اپنی۔ نہ کپڑوں کا خیال نہ میک اپ نہ جینا سنورنا نہ جو کری۔ گھر سے نکلو گی تب ہی تمہارا حلیہ بھی صحیح ہو گا۔ سارا دن گھر پر رہتی ہو۔ نہ کہیں جاتی ہو نہ کسی سے ملتی ہو۔“ وہ اس



## خواتین ڈائجسٹ پبلی کیشنز

کی ایک خوبصورت پیشکش

نامور مصنفہ رضیہ جمیل

کا ”ساگر دریا بادل بوند“

کے بعد مشہور و معروف ناول

## لکھنؤ صرف کا

اب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

☆ خوبصورت سرورق

☆ مضبوط جلد

☆ آفست پیپر

قیمت صرف = 300 روپے

کتاب منگوانے کے لیے

آج ہی = 330 روپے

کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ

ارسال فرمائیں۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی

کی طرف دیکھتے ہوئے ناراضی سے بولے۔

”بھائی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں صبا! تم نے اپنی سوشل لائف بالکل ختم کر دی ہے۔ ذرا بھی سوشل نہیں رہی ہو تم۔ نہ ٹیلی میں کہیں جاتی ہو نہ اپنی فرینڈز میں۔ تمہاری دوست خود ہی بھولے بھٹکے فون کر لیں تو بات کر لو گی خود سے تو میرا خیال ہے تم نے عرصہ سے کسی دوست کو فون نہیں کیا۔ یہ یک طرفہ کارروائی بھی کب تک چلے گی۔ آخر کار ایک روز تنگ آکر وہ لوگ تمہیں فون کرنا بھی چھوڑ دیں گے۔“

ڈیڈی بھی بابا کی حمایت میں بولے تھے۔ ار تفضی خاموشی سے چائے پیٹے ہوئے صبا کو کی جانے والی نصیحتیں سن رہا تھا۔

”صبا آج تمہارے ساتھ جائے گی ار تفضی!“ بابا ار تفضی سے حکمیہ انداز میں بولے۔ وہ اب مزید کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی اس لیے خاموش ہو گئی تھی۔ اس کی تیاری کسی پارٹی یا ڈنر میں جانے والی تیاری نہیں تھی۔ اس نے نہ میک اپ کیا تھا اور نہ کسی قسم کی جیولری پہنی تھی۔ صرف بابا کے پہنائے ہوئے کنکین جو اس نے اتارے ہی نہیں تھے وہ پہنے ہوئے تھے اور گلے میں چین جو ہمیشہ ہی سے اس نے پہنی ہوئی تھی۔

معاذ گھر پر بابا اور ڈیڈی کے پاس رک گیا تھا۔ صرف وہ دونوں جا رہے تھے۔ ار تفضی نے گاڑی ریورس کر کے جیسے ہی گھر سے باہر نکالی وہ اس کی طرف دیکھے بغیر سیٹ سے انداز میں بولی۔

”مجھے ڈنر میں نہیں جانا۔ آپ مجھے میری فرینڈ کے گھر ڈراپ کر دیں۔ واپسی میں مجھے وہیں سے پک کر لیجئے گا۔“

”وہاں بہت اچھی گید رنگ ہو گی صبا! تم انجوائے کرو گی۔“ وہ اس کی بات پر حیران ہوئے بغیر متانت سے سمجھانے لگا۔

”آپ نے کہا تھا آپ مجھے کسی بات کے لیے مجبور



نہیں کریں گے۔ ”بہت تلخ لہجے میں وہ اسے اس کی  
کئی بات یاد دلانے لگی۔

”ایڈریس بتاؤ اپنی فریڈ کے گھر کا۔“ اس نے مزید  
بحث کیے بغیر فوراً ”نہی بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ پھر اسی  
خاموشی سے ارتضیٰ نے اسے اس کی دوست کے گھر پر  
اتار دیا تھا۔

صبا کی یہ حرکت اسے بہت بچکانہ اور اٹیچیور لگ  
رہی تھی۔ اور صرف یہی حرکت نہیں اسے صبا کے  
بہت سے رویے اٹیچیور لگا کرتے تھے۔ اس میں  
اٹیچیورٹی کی کمی تھی۔ لیکن اب وہ اسے کچھ  
سمجھانے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ وہ خود اپنے  
رویے میں تبدیلی لے آئے تو لے آئے ارتضیٰ اسے  
واقعی کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

\*\*\*

معاذ کی فرمائش پر وہ اس کے لیے چکن پاشا بنا رہی  
تھی اور وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے کچن میں  
اس کے پاس کھڑا تھا۔ اور کچھ نہ کچھ بولے جا رہا تھا۔  
”پنیر ضرور ڈالے گا۔“

”مرچیں بالکل نہیں۔“

”آپ بھی میرے ساتھ کھائے گا۔“

”معاذ! میں ڈسٹرب ہو رہی ہوں۔ تم اپنے کمرے  
میں جاؤ۔ مجھے سکون سے کام کرنے دو۔ جب بن جائے  
گا میں تمہیں بلاؤں گی۔“ اس کے الفاظ اتنے سخت  
نہیں تھے، لیکن اس کا لہجہ بہت سخت تھا۔ وہ اس کے  
انداز پر سہم کر فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ اسے اس کے غصے  
سے ڈر لگا تھا۔ وہ کچن سے نہیں گیا بلکہ دروازے سے  
ٹپک لگائے خاموشی سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی  
آنکھوں میں آنسو بھی آنے لگے تھے، مگر وہ انہیں  
روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے سب نظر آ رہا تھا۔ پھر  
بھی وہ بے حس سے انداز میں اپنا کام کیے جا رہی تھی۔  
غصے اور جھنجھلاہٹ میں کام کرتے ہوئے شاید بے  
دھیانی کے سبب چھری سے اس کی انگلی پر کٹ لگا تھا۔  
اس نے چھری پلیٹ میں رکھتے ہوئے اپنی انگلی کو

دیکھا۔ درمیان والی انگلی سے ایک دم ہی خون نکلنے لگا  
تھا۔

معاذ بہت گھبرایا ہوا تیزی سے اس کے پاس آیا تھا۔  
وہ اس کے آنے کو نظر انداز کر کے سنک کے آگے انگلی  
کر کے خوب تیز ٹھنڈے پانی سے اپنی انگلی دھوئے  
گئی۔

”آپ کے خون نکل رہا ہے ہالہ جانی۔“ وہ اس کے  
پاس کھڑا اچک اچک کر اس کی انگلی کو دیکھنے کی جدوجہد  
کر رہا تھا۔ وہ بغیر کوئی جواب دیے اپنی انگلی پانی سے  
دھوتی رہی۔ وہ بھاگتا ہوا کچن سے نکل کر پتا نہیں کہاں  
گیا تھا۔ وہ سنک کے آگے سے ہٹے ہوئے اس زخم پر  
ابھی بینڈیج لگانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ وہ فرسٹ ایڈ  
باکس اٹھا کر کچن میں واپس آگیا۔ وہ اس کے ہاتھ میں  
فرسٹ ایڈ باکس دیکھ کر ساکت رہ گئی تھی۔ وہ لاؤنج  
میں الماری کے اندر اتنا اوپر رکھا ہوا تھا۔ وہاں معاذ کا  
ہاتھ کیسے گیا۔ ندیم گھر پر نہیں تھا، ریشم حال اپنے کوارٹر  
میں تھی۔ یقیناً ”وہ خود کسی نہ کسی طرح اوپر چڑھا تھا  
تاکہ فرسٹ ایڈ باکس نکال سکے۔ اگر وہ وہاں سے گر  
جاتا پھر؟ اتنا بھاری سا فرسٹ ایڈ باکس اتنی اونچائی اور  
وہ چھوٹا سا بچہ۔ اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ فرسٹ ایڈ  
باکس زمین پر رکھ کر معاذ نے اسے جلدی سے کھولا اور  
پھر اپنی سمجھ کے حساب سے اس میں سے ایک مرہم  
نکالا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس  
کے سامنے زمین پر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے خود ہی اپنی  
انگلی اس کے سامنے کر دی۔ وہ اس کے زخم پر بڑے  
نرم اور ملائم سے انداز میں مرہم لگا رہا تھا۔

”آپ کو بہت تکلیف ہو رہی ہے۔“ اس نے فکر  
مندی سے پوچھا۔

”پہلے ہو رہی تھی۔ اب نہیں ہو رہی۔ تم نے  
آئمنٹ لگایا ہے ناں۔ اس سے ساری تکلیف ختم  
ہو گئی۔“ وہ بہت مطمئن ہو کر فخریہ انداز میں مسکرایا۔  
وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اب بڑے غلط سلاط  
انداز میں اس کی انگلی پر بینڈیج کر رہا تھا۔

”تمہارے لیے آئمنٹ لینے جا رہی ہوں۔ حد



ہے بے نیازی کی۔ اتنی گہری چوٹ ہے اور محترمہ سکون سے پھر رہی ہیں۔ ”اس کے کانوں کے پاس ایک بہت مانوس سی سرگوشی ہوئی۔ اس نے بے ساختہ معاذ کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ اسے پاگللوں کی طرح پیار کر رہی تھی۔ وہ اس کے سینے سے لگا ہری طرح حیران ہو رہا تھا۔ اتنی ناراضی کے بعد اچانک اتنا پیار؟ ”معاذ! تم اس دنیا کے سب سے پیارے بچے ہو۔ تم بالکل اپنی ماما جیسے ہو۔ تم بالکل ثمن جیسے ہو معاذ!“

چھوٹی چھوٹی عادتیں چاہے اس نے صبا کی لے لی ہوں۔ لیکن وہ مزاج میں پورا کا پورا ثمن جیسا تھا۔ ہو بہو اسی جیسا شکل اگر اس نے باپ کی لی تھی تو مزاج یاں کا۔ وہ پہلی مرتبہ اس بات سے آگاہ ہوئی تھی کہ ثمن کا بیٹا بالکل اسی جیسا ہے۔

”میری ماما بہت اچھی تھیں ہالہ جانی؟“ وہ اس کی بات سن کر بے اختیار پوچھ بیٹھا تھا۔

”ہاں، وہ بہت اچھی تھی۔ وہ اس دنیا کی سب سے اچھی لڑکی تھی۔ وہ بالکل تمہارے جیسی تھی معاذ!“

اس نے کبھی ثمن کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی، آج اس کے بیٹے سے کر رہی تھی۔

”وہ بالکل شہزادیوں جیسی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جنہیں دیکھ کر زندگی سے پیار ہو جایا کرتا ہے۔

جن سے مل کر خلوص، محبت، چاہت سب پر ایمان لانے کو دل چاہنے لگتا ہے۔“ وہ اس کی بات سمجھ نہیں

پارہا تھا۔ لیکن اسے اس کا یوں والہانہ انداز میں پیار کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کتنے عرصے بعد آج وہ اسے

اس طرح پیار کر رہی تھی۔ وہ اب اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی تھی، اس نے اسے جھڑکنا اور ڈانٹنا بھی

چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس کے پیار کرنے کا انداز وہ نہیں رہا تھا جس کا معاذ عادی تھا۔ جس کی وہ اس سے توقع کیا

کرتا تھا۔ پھر وہ وہاں سے اٹھی، اس نے جلدی جلدی پاشا تیار کیا۔ پاشا پلیٹ میں نکال کر وہ اس کے پاس بیٹھ

گئی۔ وہ کچن ٹیبل کے آگے رکھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ اسے اپنے ہاتھ سے کھلا رہی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ سے

اپنے ساتھ کمرے میں لے آئی۔

”آج تم میرے ساتھ سو جاؤ۔“ اس کے کئے بغیر اس نے خود اسے اپنے قریب لٹالیا۔ وہ اس کے ہاتھ پر سر رکھ کر خاموشی سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ وہ اسے کہانی سنارہی تھی۔ اس جنگل کی جس میں سب جانور مل جل کر رہتے تھے۔ اس سے کہانی سنتے سنتے معاذ کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔

”بانی کہانی کل سناؤں گی۔ اب تم سو جاؤ۔“ اس نے اس کے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

”اب میں آپ کو ماما بولوں گا تو آپ ناراض تو نہیں ہوں گی۔؟“ اس نے اپنی آنکھیں بمشکل کھولتے

ہوئے پوچھا۔ سونے سے پہلے شاید وہ اس سے یہ وعدہ لے لینا چاہتا تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں شام میں اس کا موڈ دوبارہ پہلے جیسا نہ ہو جائے۔

”تمہارا جو دل چاہے، تم مجھے بولو۔“ وہ دو تین

منٹوں ہی میں گہری نیند سو گیا۔ وہ اپنے بالکل پاس لیٹے معاذ کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔

”تم میں کیا ہے صبا! میں تم سے کچھ بھی چھپا ہی نہیں پاتی۔ میرا دل خود بخود تمہاری طرف کھینچتا ہے۔“

اس کے کان ایک پیار بھری آواز کو سن رہے تھے۔

”تمہاری ماں بھی تمہاری طرح مجھ سے پیار کرتی تھی معاذ! تم اسی کے وجود کا تو حصہ ہو۔ تم بالکل اسی کی

طرح مجھ سے پیار کرتے ہو معاذ! میں ڈانٹوں، جھڑکوں، اپنے پاس سے ہٹاؤں۔ بری طرح پیش آؤں، تم پھر بھی

میری طرف بھاگ کر آتے ہو۔ وہ بھی ایسا ہی کرتی تھی۔ وہ اپنے پیار کے صلے میں مجھ سے کچھ نہیں مانگتی

تھی۔ یہ بھی نہیں کہتی تھی کہ صبا تم بھی مجھ سے ایسا ہی پیار کرو۔ میں نے اس کے پیار کی قدر نہیں کی،

معاذ۔ لیکن میں تمہارے پیار کی قدر ضرور کروں گی۔ کیا ضروری ہے کہ صبا ہر محبت کے پھڑکانے کے بعد

ہی اس کی قدر کرے۔ تم جس نام سے چاہے مجھے بلاؤ معاذ۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔ میں تمہارے پیار کے آگے ہار گئی ہوں معاذ۔ اور ساری زندگی میں اس پیار



وہ معاذ کے لیے سراپا محبت بن گئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح اس پر چاہت لٹانے لگی تھی بلکہ شاید پہلے سے بھی زیادہ۔ معاذ اگر اسے ماما بول کر خوش ہوتا تھا تو پایا اور ڈیڈی بھی اس کے منہ سے صبا کے لیے یہ لفظ سن کر بہت خوش ہوتے تھے۔

\*\*\*

معاذ کے اسکول میں سالانہ فنکشن تھا۔ میں ڈرامہ میں بھی ہوں اور تقریر بھی کروں گا۔ ٹیچر نے کہا پرس تو بس معاذ بنے گا۔ کھانے کی میز پر اس نے گردن اونچی کر کے بتایا تھا۔ وہ سب ہی اس کے انداز پر ہنس پڑے تھے۔ ”پھر تو اب تمہیں پرس معاذ کہنا پڑا کرے گا۔“ ڈیڈی ہنستے ہوئے بولے۔ اس نے گردن ہلا دی تھی۔ جتنے دن اس فنکشن کی تیاریاں اس کے اسکول میں ہوتی رہیں۔ وہ گھر والوں سے صبح شام اسی کے بارے میں کچھ نہ کچھ باتیں کرتا رہا۔

وہ ار تضحیٰ اور صبا سے وعدہ لے چکا تھا کہ وہ دونوں فنکشن میں آئیں گے۔ صبا کے وعدہ گر لینے کے باوجود اسے جیسے بے اعتباری سی تھی وہ ہر روز اس سے نئے سرے سے وعدہ لیتا تھا۔

”آپ بہت اچھا ڈریس پہن کر آئیے گا آپ اسٹک بھی لگائیے گا اور بال بھی کھولیے گا۔“ اس کی اس معصومانہ سی فرمائش پر وہ ہنس پڑی تھی۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میک اپ کر کے آنا ہے۔ ”آپ ویسے بال بنائیے گا جیسے آپ نے پایا اور ماما کی شادی پر بنائے تھے۔“

اس نے ثمن اور ار تضحیٰ کی شادی کی تصویریں اور مودی اتنی بار دیکھی ہوئی تھی کہ اسے شادی کے دن کی گھر کے ہر فرد کی تیاری حفظ تھی۔

”معاذ! وہاں پر کوئی مجھے دیکھنے کے لیے نہیں آئے گا۔“ اس کے منہ سے تیاری کپڑوں اور میک اپ کی گردان سننے سننے وہ آخر کار کہہ بیٹھی تھی۔

”میں آپ کو اپنے فرینڈ سے بلواؤں گا اور اپنے

سب ٹیچرز سے بھی۔“ اس نے اس کی عقل پر افسوس کیا۔

”اگر میں اچھی طرح تیار ہو کر نہیں جاتی تو تمہاری انسلٹ ہو جائے گی۔ اپنے فرینڈز کے ساتھ۔“ اسے دوبارہ ہنسی آئی تھی۔ اس کی بات کو ہنسی میں اڑانے اور ذرا سی بھی سنجیدگی سے نہ لینے کے باوجود وہ جب فنکشن میں جانے کے لیے تیار ہونے لگی تو اس نے وہ سب کچھ کیا جو وہ اس سے چاہتا تھا۔ وہ جو اس نے اسے سمجھایا تھا وہ بھی اور وہ جو اسے سمجھا نہیں پایا تھا وہ بھی۔ سرخ رنگ کی بہت خوب صورت شلواری میس اور کپڑوں سے مناسبت رکھتی ہوئی نفیس سی جیولری پہنی تھی۔ اور میک اپ کیا تھا۔

اسے میک اپ کے بعد اپنا چہرہ خود ہی اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ بالوں کی بیچ کی مانگ نکال کر برش کرنے کے بعد اس نے انہیں کھلا چھوڑ دیا تھا۔ دوپٹہ شانوں پر سلیقے سے پھیلا کر وہ پوری طرح تیار تھی۔ اسے معاذ کی خوشی کا سوچ کر خوشی ہو رہی تھی۔ وہ اسے اس طرح تیار دیکھ کر کس قدر خوش ہو گا۔ صبح اسکول جاتے جاتے بھی وہ اس سے کتنے سارے وعدے لے کر گیا تھا۔

\*\*\*

ایک میٹنگ سے فارغ ہو کر وہ ابھی ابھی اپنے آفس میں آیا ہی تھا کہ اس کے موبائل پر صبا کا میسج آیا۔ ”معاذ کے اسکول جانا ہے۔“ بے ساختہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اسے ایسے یاد دلانے لگی جیسے اسے اس کے بھول جانے کا خدشہ تھا۔ وہ صبا کے ساتھ طے کیے ہوئے وقت سے پہلے ہی گھر آ گیا تو یہ دیکھ کر ذرا بھی حیران نہیں ہوا کہ وہ تیار بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن اس کی تیاری پر ضرور حیران ہوا تھا۔ معاذ کا اس کی تیاری کے بارے میں راک ضرور اس کے کانوں میں پڑا تھا، لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی بات مان بھی لے گی۔ اسے صبا کے اندر پیدا ہوئی یہ تبدیلی بہت اچھی لگی۔ وہ آہستہ



آہستہ زندگی کی طرف واپس آتی نظر آرہی تھی۔ اور اسے خوش دیکھنا اور تضحیٰ کو ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔

فنکشن بھی شاندار تھا اور معاذ کی پر فار منس بھی توقع کے عین مطابق شاندار تھی۔ اسٹیج پر آتے ہی اس نے اتنے لوگوں کے ہجوم میں بھی ار تضحیٰ اور صبا کو دیکھ لیا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی ہی خوشی بکھر گئی تھی۔ معاذ کی زیر دست پر فار منس پر اس کے لیے زور دار تالیاں بجی تھیں اور اس کے لیے بجنے والی وہ تالیاں اسے اپنے لیے لگ رہی تھیں جیسے اسے سراہا جا رہا ہو۔ فنکشن کے اختتام پر سال بھر غیر معمولی کارکردگی دکھانے والے بچوں میں انعامات، شیلڈز اور ٹرافیوں تقسیم کی گئی تھیں۔ اور ان انعامات کو پانے والے آؤٹ اسٹیڈنگ اسٹوڈنٹس میں وہ بھی شامل تھا۔ معاذ کے چہرے پر چھلکتی خوشی ان دونوں ہی کو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ فنکشن کے بعد وہ اسے اپنے پیچرز اور دوستوں سے ملوانے لگا۔ وہ جیسے اس کا سب سے قیمتی میڈل تھی۔ جسے وہ فخریہ ایک ایک سے ملوا رہا تھا۔

”یہ میری ماما ہیں۔“ ار تضحیٰ دور کھڑا اسے صبا کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر مختلف لوگوں کے پاس لے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کا بیٹا آج بہت خوش تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ واپسی میں گھر جانے کے بجائے وہ اسے شاپنگ سینٹر لے آیا تھا۔

”تم اپنا گفٹ ابھی لے لو۔ جو دل چاہے خرید لو۔“ اس نے بڑی فیاضی سے بیٹے سے کہا۔ اس نے آج معاذ کو خوشی دی تھی۔ ار تضحیٰ کے ساتھ فنکشن میں آکر اس کی مرضی کے مطابق تیار ہو کر۔ اس سب کے باوجود بھی وہ سچ سے خوش نہیں ہو پا رہی تھی۔ معاذ نے آج جتنے بھی لوگوں سے اسے اپنی ماں کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا وہ ان سب سے ملی تھی۔ بہت اچھی طرح بات چیت بھی کی تھی۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے اس کے دل پر کیا گزری تھی۔ یہ صرف وہی سمجھ سکتی تھی۔ اسے ان تمام لمحوں میں خود سے شرم آتی تھی۔ وہ جگہ کسی اور کی تھی۔ وہاں اسی کو

ہونا چاہیے تھا۔ اس جگہ پر وہی جیتی تھی۔ ار تضحیٰ صبح جگہ پر تھا معاذ صبح جگہ پر تھا۔ صرف وہ غلط جگہ پر تھی۔ لیکن وہ اس معصوم سے بچے کا کیا کرتی۔ وہ معاذ کی خوشی کی خاطر مسکراتے پر مجبور تھی۔ وہ ان دونوں کے ساتھ دوکانوں میں پھر بھی رہی تھی۔ معاذ جو چیزیں پسند کر رہا تھا ان کے بارے میں اپنے کنکشن بھی دے رہی تھی۔ لیکن اندر سے اس کا دل ایسا ہو رہا تھا جیسے دھڑکنے ہی نہ چاہتا ہو۔ وہ لوگ ابھی شاپنگ کر رہی رہے تھے کہ ار تضحیٰ کے موبائل پر ڈیڈی کی کال آئی۔ انہوں نے آفس سے فون کیا تھا۔ وہ معاذ کے اور اس کی کارکردگی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ جواباً ”مسکراتے ہوئے انہیں مختصر لفظوں میں سب کچھ بتانے لگا۔

”بس پھر تم شاپنگ کر کے سیدھے گھر آ جاؤ۔ میں اور بھائی بھی گھر آ رہے ہیں، معاذ کی کامیابی سب مل کر سیلبریت کریں گے۔“ انہوں نے ار تضحیٰ سے کہتے ہوئے نون بند کر دیا۔

وہ لوگ گھر پہنچے تو بابا اور ڈیڈی وہاں پہلے سے موجود تھے، کیک، آکس کریم، میز، مٹھائی اور بھی بہت سی معاذ کی پسند کی کھانے پینے کی چیزیں میز پر سجا کر وہ ان لوگوں کا انتظار کر رہے تھے۔ معاذ کی ٹرافی اور سرٹیفکیٹس کو ان دونوں نے بڑی محبت سے دیکھا۔

”دیکھنا ار تضحیٰ! تمہارا بیٹا تم سے بھی آگے جائے گا۔“ ڈیڈی نے ار تضحیٰ سے یہ سن کر کہ معاذ نے اتنے سارے لوگوں کے سامنے حد درجہ اعتماد کے ساتھ تقریر کی ہے، یہ کنکشن دیے تھے۔

”میں چاہتا ہوں ڈیڈی کہ یہ زندگی کے ہر میدان میں مجھے پیچھے چھوڑ دے۔ اسے اپنے سے آگے بلکہ بہت زیادہ آگے دیکھنے کی دعا کرتا ہوں میں۔“ ار تضحیٰ نے برملا اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ بابا، بھائی اور بیٹے کی گفتگو سے زیادہ اسے دیکھنے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ انہیں صبا کو دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”معاذ! جاؤ جا کر صبا کو توبلا کر لاؤ۔“ معاذ سے یہ بات کہتے وقت ان کے لبوں پر بڑی شریر سی مسکراہٹ



”میں اکیلا تھوڑی ہوں گا۔ آپ بھی تو ہوں گی۔“  
اس نے بڑے اطمینان سے اس کا لکھنؤ میں رہنے کا  
تھا۔ وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے یہ بات تو طے تھی کہ صبا اس  
کے ساتھ جائے گی، اس بارے میں سوچنے اور فکر  
کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

”بیبا کا کام ختم ہو جائے گا۔ پھر ہم لوگ خوب  
گھومیں گے۔“ وہ پلان بنا رہا تھا۔ معاذ بچہ تھا۔ اسے  
کسی نہ کسی طرح وہ بہلا ہی لیتی، لیکن یہاں تو مسئلہ بیبا  
کا آگیا تھا۔ یہ ایشو معاذ نے اٹھایا تھا اور اسے سب سے  
زیادہ بیبا نے پسند کیا تھا۔ وہ دل و جان سے چاہتے تھے کہ  
صبا اور معاذ بھی ار تفضی کے ساتھ جائیں۔

”ار تفضی! لاہور میں کام ختم کر کے فوراً کراچی  
آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شمالی علاقوں کی  
طرف نکل جانا۔ یہی تو موسم ہے وہاں کی سردیاں،  
بارشیں اور برف باری انجوائے کرنے کا۔“ انہوں نے  
ار تفضی سے حکمیہ انداز میں کہا۔ وہ ان لوگوں کو کل  
کے بھیتے آج بھیجنے کے لیے تلے بیٹھے تھے اور وہ سمجھ  
نہیں پا رہی تھی کہ بیبا کو کس طرح منع کرے۔ کافی دفعہ  
اس نے مختلف بہانے بنا کر دبے لفظوں میں منع کرنے  
کی کوشش کی، کبھی یہ کہہ کر آپ اور ڈیڈی اکیلے  
ہو جائیں گے۔ کبھی یہ کہہ کر کہہ پتا نہیں معاذ کا وہاں دل  
لگے گا کہ نہیں، اگر دل نہیں لگا تو وہ بہت تنگ کرے  
گا۔ لیکن اس کے تمام بہانوں کے ان کے پاس بنے  
بنائے تیار جواب رکھے تھے۔ ار تفضی دیکھ رہا تھا کہ وہ  
جاننا نہیں چاہتی۔ وہ اسے جانے کے لیے مجبور بھی  
نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اکیلے میں بیبا سے صبا پر  
بات رکھے بغیر گفتگو کی۔

”بیبا! فی الحال کہیں آؤٹنگ کے لیے میرے پاس  
ٹائم نہیں ہے۔ مجھے لاہور سے فوراً واپس آنا  
ہو گا۔ آپ جانتے تو ہیں کہ کوریا سے ڈیل گیشن آنے  
والا ہے۔ مجھے لاہور سے آتے ہی اس سلسلے میں بہت  
ساہوم ورک کر کے رکھنا ہے۔ میں صبا اور معاذ کو اس  
وقت تو بالکل ٹائم نہیں دے سکتا۔“ بیبا کو اس کی بات پر

تھی۔ معاذ کا کان کی شکل دیکھ رہا تھا۔  
”ماما یہ بیٹھی تو ہیں۔“ اس نے معصومیت سے  
انہیں بتانے کی کوشش کی۔ ار تفضی اور ڈیڈی ان کی  
شرارت پر مسکرا رہے تھے۔ جب کہ وہ ایک دم ہی  
جھپ سی گئی تھی۔

”یہ صبا ہے۔ ارے ہاں واقعی۔ صبا! تم اتنی خوب  
صورت ہو یہ بات آج مجھے پہلی دفعہ پتا چلی ہے۔“  
انہوں نے مصنوعی سے حیرت اور ستائش کا تاثر دیا۔  
”شفیق! تمہاری اس بگڑی ہوئی بیٹی کو میرا پوتا ہی  
ٹھیک کرے گا۔“ وہ ڈیڈی سے بولے۔

”بیبا! میں بگڑی ہوئی بیٹی ہوں۔“ اس نے روٹھے  
لہجے میں کہا۔

”آپ تو کہتے ہیں صبا! میری بہت پیاری اور اچھی  
بیٹی ہے۔“ اس نے انہیں خفگی سے یاد دلایا۔

”پیری اور اچھی بیٹی بیبا کی بات اتنی جلدی اور  
آسانی سے جو نہیں مانتی، جتنی آسانی سے معاذ کی مان  
لیتی ہے۔“ وہ صاف گوئی سے بولے۔ وہ سب ساتھ  
بیٹھ کر کھاتے اور باتیں کرتے ہوئے معاذ کی پہلی پہلی  
کامیابی کا جشن منا رہے تھے۔

\*\*\*

ار تفضی لاہور جا رہا تھا۔ اس کا لاہور جانا کوئی غیر  
معمولی واقعہ نہیں تھا۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں اس کا وہاں  
کا چکر لگا ہی کرتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھار کسی ضروری کام کی  
وجہ سے اس سے بھی جلدی وہاں جانا پڑ جاتا تھا۔  
اب کی بار یہ جانا غیر معمولی واقعہ یوں بن گیا تھا کہ معاذ  
کے اسکول کی چھٹیاں تھیں اور وہ ار تفضی کے ساتھ  
وہاں جانا چاہتا تھا۔ معاذ کے جانے کا مطلب تھا کہ وہ  
بھی اس کے ساتھ جائے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ  
اکیلا ار تفضی کے ساتھ چلا جائے۔ ار تفضی وہاں کام سے  
جا رہا تھا۔ معاذ اس کے بغیر گھر پر اکیلا کیسے رہ سکتا تھا۔  
”تم گھر پر اکیلے کیسے رہو گے معاذ! پاپا تو آفس میں  
بڑی دیر جا رہے گے۔“

وہ اسے سمجھانے کے بہن کر رہی تھی۔



”اپنی بیوی اور بیٹے کے لیے تمہارے پاس ٹائم نہیں ہے۔ بزنس رشتوں سے زیادہ اہم کب سے ہو گیا ہے۔ معاذ کے پاس یہی وقت ہے۔ پھر اس کے اسکول کھل جائیں گے۔ چاہے دو چار دن کے لیے ہی جاؤ لیکن تمہیں ان دونوں کو گھمانے پھرانے ضرور لے جانا چاہیے۔ کچھ وقت تمہیں اور صبا کو ایک ساتھ اور تنہا گزارنا چاہیے۔ اس سے تم دونوں کے درمیان بہتر انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہوگی۔ اس کا حق ہے کہ تم اسے وقت دو اسے اپنی زندگی میں سب سے اہم جگہ دو۔ تمہارے لیے بزنس اور دوسرے سب کاموں سے پہلے ہونا چاہیے صبا اور معاذ کو۔“ ار تضحیٰ انہیں یہ کیسے سمجھانا کہ وہ انکار ہی صبا کی وجہ سے کر رہا ہے۔

بابا سے یہ بات وہ کہہ نہیں سکتا تھا اور کسی دوسری ٹاویل سے انہوں نے قائل ہونا نہیں تھا۔ بابا اور ڈیڈی نے بڑے خوشی خوشی انہیں رخصت کیا تھا۔ جہاز میں سارا وقت وہ خاموش بیٹھی رہی۔ معاذ کی تمام باتوں کے وہ ہوں ہاں میں جوابات دے رہی تھی۔ ار تضحیٰ اس کا اضطراب اور ٹینشن دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے ہمیشہ سے زیادہ دلگرفتہ اور مایوس لگ رہی تھی۔ اس نے اس گھر میں قدم رکھا جس میں وہ زندگی میں دوبارہ کبھی آنا نہیں چاہتی تھی۔ پھولوں سے بھرا وہ خوب صورت لان بہت سونا اور خاموش لگا تھا اسے۔

”سنو وہ کہاں ہے؟“ اس نے پھولوں سے بے آواز پوچھا۔ وہ جواب میں بالکل خاموش رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی گھر کے اندر آگئی۔

”پہلے سارا گھر تو دیکھ لو، تم دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔ میں نے اسے اتنی اچھی طرح سجاایا ہے۔“ اس کے بالکل قریب ایک آواز ابھری۔ اس نے چونک کر اپنے دائیں بائیں دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

”ہمارے کمرے کی دیواروں پر آف وائٹ پینٹ ہے۔ اس کے ساتھ نیلے رنگ کے پردے اور کارپٹ کس قدر خوب صورت اور رو مینٹنگ سا تاثر دے رہے ہیں۔ کتنا حسن ہے اس رنگ میں، کتنا رو مینس ہے۔“ وہاں سب کچھ ویسا ہی تھا کہیں کوئی تبدیلی

نہیں تھی۔ ہر چیز اسی طرح اپنی جگہ پر موجود تھی۔ لیکن پھر بھی وہاں سب کچھ ویسا نہیں تھا۔

وہاں ایک کمی تھی، بہت بڑی کمی۔ سب سے بڑی کمی۔ وہ اپنے قدموں کو گھسیٹتے ہوئے لاؤنج سے نکل کر ڈائننگ روم میں آئی تو پیچھے لاؤنج سے ایک آواز آئی۔ ”کبھی کبھی مجھے ڈر لگنے لگتا ہے، محبت کے کھو جانے کا ڈر۔ اس کے چھن جانے کا ڈر۔ پتا نہیں محبت اتنی وہمی کیوں ہوتی ہے۔“ اس نے مڑ کر لاؤنج میں رکھے صوفے کی طرف دیکھا۔

”اور اوپر سے غصہ دکھا رہی ہو۔ اندر سے تو خوش ہو رہی ہو گی کہ جس بندے کے پیچھے اتنی لڑکیاں پڑی ہیں، وہ میرے پیچھے پڑا ہے۔“ اس نے زخمی نگاہوں سے اس خالی صوفے کی طرف دیکھا۔

پھر وہ ڈائننگ ٹیبل کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ ٹیبل کی سطح پر اس نے ہلکے سے ہاتھ پھیرا۔ ”پتا نہیں کس طرح یہ پیپر اور سبزیاں مکس کر کے اتنے مزے کی ڈش تیار کرتی ہے۔“ اس کے لیے یہ تعریفی جملہ جس نے کہا تھا وہ وجود آج اپنی مخصوص کرسی پر سے غائب تھا۔ اس کے دل میں اک ہوک سی انہمی۔ وہ فوراً ڈائننگ روم سے نکل گئی۔ سامنے نظر آتے کچن کی طرف خود بخود ہی اس کے قدم اٹھے تھے۔

”خود ہی بد تمیزی کرتی ہو۔ پھر مظلوم سی شکل بنا کر رونے بھی کھڑی ہو جاتی ہو۔“ جس جگہ پر کھڑے ہو کر یہ بات کہی گئی تھی وہ اسی جگہ پر آکر رک گئی۔

”زندگی میں بہت سی باتیں ہمیں ناگوار گزرتی ہیں۔ مگر کسی ناگوار بات پر اس طرح ری ایکٹ کرنا بالکل مناسب نہیں ہے۔ تمہارے کل کے رویے پر مجھے بہت دکھ ہوا۔“ وہ خاموشی سے اس جگہ کو تنگ رہی تھی۔ آج وہاں کوئی نہیں تھا جو اس سے کہتا۔

”نہیں ہوں بابا! میں تم سے ناراض اب کب تک یہ رونی صورت بنائے رکھو گی۔“ اس کے دل نے شدت سے دعا مانگی کہ کہیں سے بھی وہ آجائے بالکل اچانک وہ آئے اور آکر اسے حیران کر دے۔ وہ اٹنے قدموں چلتی ہوئی کچن کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی



ہو گئی۔ لیکن اس کی نگاہیں ابھی ابھی اسی جگہ پر جمی تھیں۔

”آج ہم دونوں نے بہت فلمی طریقے سے ایک دوسرے سے محبت کا اظہار نہیں کر دیا؟“ دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے وہ بہت گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ وہ رونا چاہتی تھی بہت شدت سے اور چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی۔ مگر برسوں سے آنکھوں کے اندر جمے ہوئے آنسو ایک بار پھر پھٹنے سے انکاری ہو گئے تھے۔ آنسوؤں کا یہ گیشیئر عمر بھر نہیں پگھلے گا وہ جانتی تھی پھر بھی رونے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ ایسے گھاؤ بھی ہوتے ہیں جنہیں زخمی آپ نہیں دھوتے۔

بن روئے ہوئے آنسو کی طرح سینے میں چھپا کر رکھتے ہیں۔

اور ساری عمر نہیں روتے۔  
نیندیں بھی مہیا ہوتی ہیں، سنے بھی دور نہیں ہوتے۔

کیوں پھر بھی جاگتے رہتے ہیں۔ کیوں ساری رات نہیں سوتے۔

اب کس سے کہیں اے جان وفا

یہ اہل وفا

کس آگ میں جلتے رہتے ہیں، کیوں بجھ کر راکھ نہیں ہوتے۔

”صبا!“ ار تضحیٰ نے اس کے پاس آکر بڑی آہستگی سے اسے پکارا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ اس کے قریب کھڑا بہت تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔ معاذ لان میں ہی کچھ دیکھنے لگا تھا۔ ار تضحیٰ اسے لان میں چھوڑ کر اس کے پیچھے اندر آیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ار تضحیٰ کی طرف دیکھا تو اسے اس کی آنکھوں سے بھانکتا ہوا کرب اور درد صاف نظر آیا۔ وہ کتنی نڈھال اور تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔

ار تضحیٰ خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ چوتھک کر وہ ایک دم دیوار سے ہٹی اور ار تضحیٰ پر نگاہ ڈالے بغیر کچھ سے نظر نہ اٹھا۔

وہ بھاگتی ہوئی اس کمرے میں آگئی تھی جس میں پہلی بار یہاں آنے پر ٹھہری تھی۔ بند پر دونوں ہاتھ لٹکائے وہ بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں آنے پر یہ سب کچھ ہو گا۔ اسی لیے اس نے یہاں آنے سے بچنے کی بہت کوششیں بھی کی تھیں۔ لیکن زندگی نے نہ پہلے کبھی اسے معاف کیا تھا اور نہ اب اسے معاف کرنے پر تیار تھی۔ زندگی اس کے لیے ایک کے بعد ایک آزمائش تیار رکھتی تھی۔

\*\*\*

”ماما کو کیا ہوا ہے پاپا؟“ ار تضحیٰ لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ معاذ بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔ ”بالکل چپ بیٹھی ہیں۔ مجھ سے بات بھی نہیں کر رہیں۔“ وہ یقیناً صبا کی تلاش میں کمرے تک گیا تھا اور اسے خاموش دیکھ کر مایوس ہو کر اس کے پاس آیا۔

”کچھ نہیں ہوا بیٹا۔“ اس نے جواب دینے کے ساتھ ہی اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔  
”میں ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں پاپا۔“ وہ طبیعت کا سن کر فوراً ”اسے ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دینے لگا تھا۔

”ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ویسے ہی تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائیں گی۔“ اس نے بیٹے کو تسلی دی۔

”تم لی وی دیکھو نا معاذ“ اس کا ذہن صبا کی طرف سے ہٹانے کے لیے اس نے جلدی سے لی وی آن کر کے اس کی پسند کا کارٹون چینل لگا دیا تھا۔ وہ خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر کارٹون دیکھنے لگا تھا۔

صبا کی حالت دیکھ کر اسے خود اپنی حالت یاد آئی تھی۔ ثمن کے مرنے کے بعد جب وہ پہلی مرتبہ لاہور آیا تھا۔ صبا تو اس طرح روئی نہیں، وہ تو اپنے بیڈ روم میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔ وہاں اسے رونا ہوا دیکھنے والا کوئی نہیں تھا، وہ تنہا تھا اس گھر میں اس کمرے میں اور ثمن کو یاد کر کے وہ اس دن کتنی دیر تک روتا رہا تھا۔ اس نے اس گھر کو اس نے کتنی حسرت



سے دیکھا تھا۔ یہ گھر جو اس نے اور ثمن نے مل کر سجایا تھا۔ یہاں کے دروازے اور ان تمام محبت بھرے لمحوں کے امین تھے جو اس نے اور ثمن نے یہاں بنائے تھے۔ اپنا وہ رونا اسے آج تک یاد تھا۔

وہ لوگ یہاں شام میں آئے تھے اور اب رات ہو چکی تھی۔ معاذ کو بھوک لگ رہی تھی۔ یہاں اب وہ مستقل تو رہتا نہیں تھا اس لیے گھر کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے بس ایک چوکیدار رکھا ہوا تھا۔ باقی کوئی ملازم نہیں تھا۔ وہ یہاں بہت سے بہت دو تین دن کے لیے آتا تھا بلکہ کبھی تو صرف صبح سے شام تک کے لیے ایسے میں یہاں اضافی ملازمین کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اگر دو تین دن کے لیے بھی آتا تو صرف ناشتہ ہی گھر پر کرتا تھا اپنا اتنا کام وہ خود ہی کر لیا کرتا تھا۔ پھر نہ سچ اس کا گھر پر ہوتا تھا اور نہ ڈنر۔ اگر کسی کاروباری سچ یا ڈنر میں جانا نہ ہوتا تو وہ کہیں بھی باہر ہی سچ اور ڈنر کر لیا کرتا تھا نہیں تو رضا کے گھر چلا جاتا تھا۔ اس وقت اسی لیے وہ معاذ کو ساتھ لے جا کر باہر سے کھانا لے آیا تھا۔ معاذ فاسٹ فوڈز کا شوقین تھا اسی لیے کھانے میں برگرز، سینڈویچز، فریج، فرائز اور پیسی موجود تھے۔

وہ سب چیزیں میز پر رکھ کر اسے بلانے کے لیے آیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ دو سری دستک پر دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے سارے جسم کا خون ہی نچوڑ لیا ہو۔ اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے بہت دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ار تفضی نے ایک دو منٹ خاموشی سے اسے دیکھا پھر جیسے سروں میں بولا۔

”آجائو کھانا کھاؤ۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے، آپ دونوں کھالیں۔“

اس نے منع بھی بہت شکست لہجے میں کیا۔

”تھوڑا سا کھاؤ۔ معاذ نیمل پر تمہارا انتظار کر رہا

ہے۔“ اس نے معاذ کا نام لے کر اصرار کیا تو وہ فوراً ہی بارمان لگی۔

”آپ جائیں، میں آرہی ہوں۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے پلٹ گیا تھا۔ پارچ منٹ بعد وہ ان دونوں کے پاس نیمل پر آگئی۔ معاذ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

”پاپا کے بیڈ روم میں میری بڑی تصویر لگی ہے۔ اتنا چھوٹا ہوں میں اس تصویر میں۔ ماما بھی ہیں اس میں اور پاپا بھی ہیں۔“ معاذ پورے گھر کا تفصیلی معائنہ کر چکا تھا۔ وہ اب اسے اس قسم کی اطلاعات فراہم کر رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کی بات سنی۔

”چلیں، میری تصویر دیکھیں۔“ وہ کھانا کھا چکا تھا۔ اب اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اپنی تصویر دکھاسکے۔

”میں بعد میں دیکھ لوں گی معاذ!“ اس نے انکار کیا تو وہ ضدی لہجے میں بولا۔

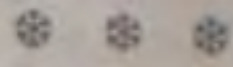
”نہیں، ابھی دیکھیں۔“

”معاذ!“ ار تفضی نے تیزی سے نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”اچھے بچے ضد نہیں کرتے، بیویوں کی بات فوراً“ مانتے ہیں۔“ وہ ار تفضی کے ٹوکنے پر خاموش ہو گیا، لیکن حسب عادت اس کا منہ پھول چکا تھا۔ ار تفضی اس کے منہ پھلانے کا نوٹس لیے بغیر نیمل سے اٹھ گیا تھا۔

وہ معاذ کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔ یہاں بابا اور ڈیڈی نہیں تھے جن کی وجہ سے اسے ار تفضی کے بیڈ روم میں جانا پڑتا۔ تھوڑی دیر وہ اس سے بھی ناراض رہا تھا پھر جب اس نے اسے اس کی پسند کی کہانی سنائی شروع کی تو کہانی سنتے سنتے ہی وہ اپنی ناراضی بھول گیا۔ کہانی ختم بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ سو گیا تھا۔ معاذ کا اپنے قریب ہونا اسے ان لمحوں میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ پر سر رکھ کر لٹا تھا اور وہ اس کے بازوؤں میں پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ معاذ جلدی سے بڑا ہو جائے۔ اتنا بڑا کہ اسے صبا کی پناہوں کی ضرورت نہ رہے بلکہ صبا اس کی پناہوں میں سکون ڈھونڈے۔



”جلدی سے بڑے ہو جاؤ معاذ! میں تم سے اپنے  
دل کی سب باتیں کہوں گی۔ بہت کھٹن ہے میرے  
اندر۔ کس سے کہوں ڈر لگتا ہے مجھے جسے بھی بتاؤں  
گی وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے گا۔ مجھے نفرتوں سے  
بہت ڈر لگتا ہے معاذ! تمہیں یہ بتاؤں گی کہ میں نے  
تمہاری ماں کی جگہ چھنی ہے تب بھی نفرت نہیں کرنا  
مجھ سے۔ تمہیں یہ بتاؤں گی کہ میں نے تمہاری ماں  
سے اس کا شوہر اور بیٹا چھینا ہے تب بھی نفرت نہیں  
کرنا مجھ سے۔ اگر تم نے اپنا پیار مجھ سے واپس لے لیا  
تو میں زندہ کس طرح رہوں گی۔“ وہ ٹکٹلی باندھے اس  
بچے کو دیکھ رہی تھی جسے اس نے جنم نہیں دیا تھا لیکن  
وہ اس سے پیار و سہاوی کرتی تھی جیسا ایک ماں اپنے  
بچے سے کرتی ہے۔



صبح اس کی آنکھ اپنے وقت پر کھل گئی۔ معاذ بڑی  
بے فکری سے گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ بھی کمرے سے  
نکلنے کے بجائے منہ دھو کر وہیں بیٹھی رہی۔ دروازے  
پر دستک ہوئی تھی وہ جانتی تھی باہر ار تفضی ہو گا۔ اس  
نے اٹھ کر فوراً ”دروازہ کھولا اور اسے دیکھتے ہی سلام  
بھی کیا۔ وہاں بابا اور ڈیڈی کے سامنے اس کے ساتھ  
بہت اچھی طرح بات چیت کرتے شاید وہ اس بات کی  
عادی ہو گئی تھی کہ اسے دیکھ کر سلام کرے“ سلام کا  
جواب دیتے ہوئے اس نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی  
اور پھر کمرے کے اندر آگیا۔

”معاذ سو رہا ہے۔“ معاذ کو سوتا دیکھ کر اس نے  
خود کلامی کی اور پھر اس کے پاس جا کر بہت آہستہ سے  
اس کے گل پر ہمار کیا۔

”تم دونوں ناشتہ کر لینا اور لچ کا یہ کرنا کہ رحمت کو  
بھیج کر جو چیز کھانے کا دل چاہے“ منگوا لینا۔“ وہ معاذ  
کے پاس سے ہٹتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔ وہ  
آفس جانے کے لیے تیار نظر آ رہا تھا۔ اس نے جواباً  
سر ہلادیا۔

صبح پانچ بجے کے لیے تو اس نے معاذ کو بھلا لیا تھا

لیکن گھڑی گھڑی اسے بھلانا آسان نہیں تھا اور پھر  
جب یہاں پر اپنا کمر تھا“ کچن میں تمام سہولتیں موجود  
تھیں تو وہ بلاوجہ اسے بھلانے کی کوشش کرتی بھی  
کیوں۔ وہ یہاں چھٹیاں انجوائے کرنے آیا تھا اور وہ ان  
چھٹیوں میں اسے ہر طرح سے انجوائے کرتے ہوئے  
اور خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ جو کیدار کو اس نے کچن  
سے متعلق سامان کی لسٹ بنا کر دی تھی۔ جب  
تک سامان آیا“ وہ معاذ کے ساتھ نیوی دیکھتی رہی۔  
جیسے ہی جو کیدار سامان لایا“ وہ کچن میں آگئی۔ معاذ بریانی  
شوق سے کھاتا تھا“ اس نے اس سے سچ میں بریانی  
پکانے کا پوچھا تو اس نے جھٹ گردن ہلا دی۔ اس نے  
بڑے اہتمام سے اس کے لیے بریانی پکائی“ راستہ بتایا۔  
وہ نیوی دیکھنے کے بعد کچھ دیر اس کا سر کھاتا رہا پھر یہ  
دیکھ کر کہ اس کا کام تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا“  
کمپیوٹر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ اسے کمپیوٹر پر  
مصروف دیکھ کر وہ کچن سے فارغ ہوتے ہی ظہر کی نماز  
پڑھنے کمرے میں آگئی۔ نماز پڑھ کر آئی تو معاذ کی کسی  
خبر کے ساتھ باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ بری طرح  
چونکتے ہوئے تیزی سے لاؤنج میں آئی تو معاذ کے برابر  
میں ار تفضی بیٹھا نظر آیا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی۔  
”تم دونوں کو لچ کے لیے لے جانے آیا تھا۔ میں  
نے سوچا تھا کہ لچ کہیں باہر کرنا چاہیے لیکن معاذ کہہ  
رہا ہے کہ گھر پر کھانا پک چکا ہے۔“ اس نے مسکراتے  
ہوئے اس سے کہا۔ گھر پر بابا اور ڈیڈی کی وجہ سے بات  
کرنا دوسری بات تھی“ یہاں اس سے بے تکلفانہ  
انداز میں گفتگو کرنا اسے بہت برا لگ رہا تھا پھر بھی وہ  
چپ تو نہیں رہ سکتی تھی“ اسے جواب دینا تھا۔

”ہاں“ وہ معاذ کی وجہ سے۔“ اس نے مختصراً کہا۔  
”جو معاذ کی وجہ سے پکایا ہے“ وہ مجھے بھی کھلا دو۔  
اب آفس جا کر اکیلا کیا لچ کروں گا۔“ وہ اس کے  
تاثرات انجوائے کرتے ہوئے بظاہر سنجیدگی سے بولا۔  
اس نے اپنی مرضی سے پکی گھر گھر ہستن کی طرح بازار  
سے کچھ منگوانے کے بجائے گھر پر کھانے پکایا تھا اور  
اب خود ہی اپنی اس کاوش پر جھنجھلائی ہوئی لگ رہی



تھی۔ اس کے چہرے کی اس جھنجھلاہٹ پر اسے ہنسی آرہی تھی۔

”میں سمجھ رہا تھا، معاذ پو نہی کہہ رہا ہے۔ یہ تو واقعی بریائی ہے۔“ وہ بریائی کی ڈش دیکھ کر حیرت سے بولا۔ معاذ اس کی بات پر برامانے ہوئے فوراً بولا۔

”ماما نے مجھ سے پوچھ کر بریائی پکائی ہے۔“ کوئی بچہ سمجھ کر اس کی بات کا یقین نہ کرتا تو اسے بہت غصہ آتا تھا۔ معاذ کی طرح وہ بھی بہت شوق سے کھانا کھا رہا تھا۔ ”پاپا ٹھیک کہہ رہے تھے، تم واقعی ماما جیسا کھانا پکانے لگی ہو۔ ایسی بریائی ماما پکاتی تھیں۔ اس کی خوشبو اور ذائقہ بالکل ویسا ہی ہے۔“ اس تعریف کے جواب میں اس کا ٹھیکس کہنے کو دل نہیں چاہا تھا لیکن پھر بھی اس نے بولا تھا۔ اپنے بچکانہ طریقوں میں کمی لانے کی وہ کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ کہتا ہے کہ مجھے پتا ہے تمہیں یہ رشتہ قبول نہیں ہے تو پھر واقعی اس بات کو بار بار اور چیخ چیخ کر دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کھانے کے فوراً بعد وہ واپس آفس چلا گیا۔

\* \* \*

رضانے اسے فون کر کے بہت اصرار سے بلایا تھا۔ وہ خود یہاں جب بھی آتا، رضا سے ملے بغیر نہیں جاتا تھا۔ اگر وہ صبا کے بغیر صرف معاذ کے ساتھ اس کے گھر جاتا تو وہ یقیناً برا مان جاتا۔ وہ لوگ اس کے گھر پہنچے تو رضا خود ان کے استقبال کے لیے گیٹ پر آیا۔ بڑے احترام اور خلوص سے اس نے اس سے سلام دعا کی اور اس کی خیریت دریافت کی پھر وہ معاذ کو جھک کر پیار کرنے لگا۔

”میں نے فائزہ کو بتایا کہ ار تفضی صبا اور معاذ کے ساتھ لاہور آیا ہے تو وہ آپ لوگوں سے ملنے کے لیے میرے پیچھے لگ گئی۔ ہم لوگ وہاں پہنچے تو جو کیدار سے بتا چکا کہ آپ لوگ ابھی ابھی گھر سے نکلے ہیں۔“ وہ ان لوگوں کو اندر لے کر آتے ہوئے اسے بتا رہا تھا۔ وہ یہاں آنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ اس کا ان لوگوں سے ملنے کا بھی کوئی دل نہیں چاہا تھا لیکن

پھر بھی اسے اخلاق نبھانے کو مسکراتا ہی تھا۔ بہت تکلیف دہ تھا اس کے لیے یہاں آنا۔ وہ اس گھر میں ایک بار پہلے بھی آئی تھی۔ تب کس حیثیت سے آئی تھی اور آج کس حیثیت سے۔ اس نے لان کے اس کونے کی طرف دیکھا جس پر وہ اور ٹمن سوفا ڈرنکس ہاتھوں میں لیے کرسیوں بیٹھی تھیں۔ ان لوگوں کی آوازیں سنتے ہی فائزہ کچن سے نکلی تھی۔

”بہت خوش ہو رہی ہے صبا! تمہیں یہاں دیکھ کر۔“ ار تفضی کو سلام کرتے ہوئے اس نے بڑی گرم جوشی سے اس کے ہاتھ تھامے۔ وہ سب صوفوں پر بیٹھ گئے۔

”معاذ ماشاء اللہ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ جب یہاں سے گیا تھا تو میرا خیال ہے پورے سال کا بھی نہیں تھا۔“ اس نے معاذ کو دیکھتے ہوئے محبت سے کہا۔ معاذ منہ پھلائے خاموش بیٹھا تھا لیکن اس کی یہ خاموشی اور ناراضی زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکی تھی۔ وہاں اپنا ہم عمر بچہ دیکھ کر اس کا موڈ بہت جلدی ٹھیک ہو گیا۔

”آجاؤ صبا! میں کچن میں ہوں، تم بھی وہیں آجاؤ۔“ فائزہ یقیناً ان لوگوں کے لیے کھانے کا اہتمام کرنے میں مصروف تھی، اس لیے مزید وہاں بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ وہ اٹھ کر اس کے ساتھ کچن میں آگئی۔

”آپ کو ہماری وجہ سے زحمت ہو رہی ہے، اس طرح اچانک زیادہ لوگوں کے ڈنر کی تیاری کرنی پڑ رہی ہے۔“ وہ چیپ تو نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے کوئی نہ کوئی بات تو کرنی ہی تھی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو صبا! ار تفضی بھائی مجھے سگے بھائیوں کی طرح پیارے ہیں۔ اگر اس وقت تم لوگ نہیں آتے تو مجھے بہت دکھ ہوتا۔ میں اور رضا تم لوگوں سے گھر پر ملنے بھی اس لیے گئے تھے کہ تم لوگوں کو باقاعدگی سے ڈنر انوائٹ کریں۔ اب اس وقت تو میں کچھ خاص اہتمام نہیں کر سکی ہوں لیکن تم لوگوں کی ایک شاندار سی دعوت مجھے لازمی کرنی ہے۔“ وہ اتنے برسوں میں ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔ فائزہ نے سلاہ میں مایو سنز رکس کرتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔



”تم بہت بدل گئی ہو صبا! پہلے سے بہت دلی اور کمزور لگ رہی ہو۔“ وہ جواباً خاموش رہی تو فائزہ خود ہی بولی۔

”ار ترضی بھائی سے تمہاری والدہ کے بارے میں پتا چلا تھا۔ اپنے دکھ کا اظہار لفظوں میں نہیں کر سکتی۔ پہلے ثمن اور اب تمہاری والدہ۔ آگے پیچھے کتنے حادثات ہوئے ہیں تم لوگوں کی فیملی میں۔ اتنے حادثات کے بعد انسان کچھ نہ کچھ تو بدل ہی جاتا ہے۔“ اسے پتا تھا وہ رسمی طور پر افسوس نہیں کر رہی لیکن پھر بھی وہ خاموش رہی۔

”ثمن کے بارے میں آج تک یقین نہیں آتا صبا! وہ ہنستی مسکراتی خوش اخلاق اور مہربان سی لڑکی اس طرح بالکل اچانک۔“ وہ بولتے بولتے خود ہی چپ ہو گئی۔ ”ساتھ گھومنے پھرنے کے پروگرام بنانے۔ ایک دوسرے کے گھر بے تکلف آنا جانا۔ اب تو وہ سب باتیں خواب جیسی لگتی ہیں۔“ وہ اپنا کام چھوڑ کر اس سے ثمن کے بارے میں بات کرتے ہوئے بے حد غمگین لگ رہی تھی۔

”بلاوجہ میں نے تمہیں ادا اس کر دیا۔“ چند سیکنڈز کی خاموشی کے بعد اسے خود ہی اس بات کا احساس ہوا کہ صبا اس کی باتوں سے بہت ادا ہو رہی ہوگی۔

”لائیں یہ کباب میں مل دیتی ہوں۔ آپ چاول دیکھ لیں۔“ وہ اس کی شرمندگی دور کرنے کے لیے مسکراتے ہوئے کوکنگ ریج کے پاس آئی۔ فائزہ نے پہلے ”تکلفاً منع کیا لیکن اس کے دوبارہ کہنے پر وہ فرائنگ پین اس کے حوالے کر کے چاولوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”بہت اچھا فیصلہ کیا ہے تم لوگوں کے پیر مٹس نے۔ ار ترضی بھائی نے تمہاری اور اپنی شادی کے بارے میں بتایا تو یقین کرو بہت خوشی ہوئی۔ تم تینوں کے حق میں اچھا ہے یہ فیصلہ۔“ اس نے عورتوں کی مخصوص فطرت کے تحت کریدنے والے انداز میں اس کے اور ار ترضی کے تعلقات کے بارے میں کوئی سوالات نہیں کیے تھے حالانکہ وہ یہ بات جانتی تھی کہ

ثمن اور ار ترضی کی پسند کی شادی تھی۔ اس کی شادی کے بارے میں بس اس قدر بھروسہ کر کے اس نے موضوع تبدیل کر دیا تھا۔

کھانے کے بعد وہ لوگ وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرے تھے۔ ار ترضی کو اندازہ تھا کہ صبا یہاں زبردستی آئی بلکہ لائی گئی ہے اسی لیے اس نے کھانے کے کچھ ہی دیر بعد جانے کا شور مچا کر رضا کے مزید رکنے کے اصرار کو دبا دیا تھا۔ ان سے رخصت ہو کر وہ لوگ گاڑی میں بیٹھے تو ار ترضی نے دیکھا کہ گاڑی میں بیٹھے ہی صبا نے چہرے پر سے وہ خوش اخلاقی کا تاثر دیتی مسکراہٹ ہٹا لی تھی۔

گھر آتے ہی وہ سیدھی اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ معاذ اور ار ترضی گھر کے اندر ابھی داخل ہوئے تھے اور وہ ان سے پہلے ہی تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔



ار ترضی نے معاذ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے لچ کرانے لے جائے گا۔ معاذ بہت خوش تھا دو بچے ار ترضی نے فون کر کے بتایا کہ مصروفیت کی وجہ سے وہ نہیں آ سکے گا۔ تو معاذ پر اس پر گئی۔ صبا نے اسے اس کا پسندیدہ پراٹھا بنا کر دیا تو وہ بہل گیا۔ اب وہ بے چینی سے شام کا انتظار کر رہا تھا۔ ار ترضی نے ڈنر باہر کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن ار ترضی کی واپسی پر اس کے ساتھ ایک اور گاڑی اور اس میں سے اترتے دو افراد کو دیکھ کر معاذ کی ساری خوشی ختم ہو گئی۔ غالباً وہ اس کے بزنس سے متعلق ہی کوئی جاننے والے تھے۔ وہ معاذ کے لیے کھانے کا بندوبست کرنے کچن میں آگئی، لیکن اس نے ڈرائنگ روم میں چائے یا کافی بھجوانے کے بارے میں ذرا بھی نہیں سوچا تھا۔

وہ کچن میں اپنا کام مکمل کر کے معاذ کے پاس کمرے میں آگئی۔ اس کا موڈ آف تھا۔ اس وقت وہ ار ترضی کے ساتھ ساتھ صبا سے بھی ناراض تھا۔ اسے نظر انداز کر کے وہ پیپر، پنسلیں اور کلرز اپنے گروپ پیسے کوئی



ڈرائنگ بنانے میں مصروف تھا۔ وہ اسے منانے کی کوشش کرنے لگی۔

”ایک تو آفس سے اتنی دیر سے آئے ہیں بیبا پھر اب گھر پر بھی آفس کا کام کر رہے ہیں۔ میں بات نہیں کروں گا بیبا۔ ماما! ہم واپس کراچی چلتے ہیں بیبا کو یہاں اکیلا چھوڑ کر۔“ وہ باپ سے سخت ناراض تھا۔ اس سے اچھا تو وہ کراچی میں تھا۔ وہاں بیبا تھے ڈیڈی تھے۔ یہاں تو ماما کے علاوہ اس سے بات کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ منہ پھلا کر بڑی ناراضی سے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر وہ معاذ کے ساتھ باتیں کرتی رہی پھر اٹھ کر اس کے لیے کھانا لینے کچن میں آگئی۔ وہاں چائے بنائے جانے کے آثار نظر آئے تھے۔ یقیناً ار تفضی خود اپنے مہمانوں کے لیے چائے بنا کر لے گیا تھا۔

وہ ایک سرسری نگاہ سے اس چیز کا جائزہ لیتے ہوئے ٹرے میں چکن پائی، اسپرائٹ کی بول اور گلاس رکھنے لگی۔ آج اس نے معاذ کے لیے بڑے اہتمام سے چکن پائی بنائی تھی۔ وہ ٹرے لے کر کمرے ہی میں آگئی۔ معاذ کھانے میں اپنے لیے اتنا اہتمام دیکھ کر کسی قدر بہل گیا تھا۔ ان دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ معاذ کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے اس کی پسند کی باتیں کرتی رہی تھی۔ کھانے کے بعد وہ دوبارہ ڈرائنگ بنانے بیٹھ گیا تو وہ بھی اس کے ساتھ ڈرائنگ میں رنگ بھرنے لگی۔ معاذ کو نیند آرہی تھی لیکن وہ نیند بھگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ باپ سے ناراض تھا اور اسے یہ بات بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے ناراض ہے مگر زبردستی جاگنے کی کوششیں کرنے کے باوجود بھی وہ دس بجے سے زیادہ نہیں جاگ سکا تھا۔ دن میں بالکل نہیں لیٹا تھا۔ وہ ڈرائنگ بناتے بناتے اس کی گود میں سر رکھے سو گیا تھا۔ اس کے سونے کے بعد اس نے بڑے آرام سے اسے گود میں اٹھا کر بیڈ پر لٹایا اور خود بھی اس کے پاس لیٹ گئی۔ خاصی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اسے پتا تھا یہ ار تفضی ہو گا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

”معاذ سو گیا۔“ اس کے دروازہ کھولتے ہی اس نے

پوچھا۔ وہ بغیر جواب دیے سامنے سے ہٹ گئی تو وہ فوراً ہی اندر آیا۔

”ابھی سویا ہے۔“ معاذ کے پاس جاتے ہوئے اس نے صبا سے پوچھا۔ اس نے گردن ہلا دی۔ وہ اس پر جھکا آہستہ سے اس کے گال پر پیار کر رہا تھا۔

”مجھ سے بہت ناراض ہو گا۔“ اسے پیار کر کے پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے مزید پوچھا۔ یقیناً اسے بیٹے کی ناراضی کی بہت فکر تھی۔ وہ جواب میں ہاں یا نہیں کہنے کے بجائے خاموش رہی۔ ار تفضی نے ایک پل کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خاموشی سے دروازے کے پاس کھڑی اس کے کمرے سے نکل جانے کی منتظر تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ کل رضا کے گھر جانے والی بات پر اسے اب تک غصہ ہے۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی وہ دوبارہ معاذ کے برابر میں لیٹ گئی تھی۔ صبح اس کی آنکھ کچھ تاخیر سے کھلی۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے اپنے برابر میں دیکھا۔ معاذ وہاں نہیں تھا۔ وہ ایک دم ہی بستر سے اٹھی تھی۔ حالانکہ پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ جاگ کر یقیناً ار تفضی کے پاس لان میں چلا گیا ہو گا لیکن وہ پھر بھی بڑی تیزی سے باہر آئی تھی۔ باہر نکلتے ہی اس کے کانوں میں معاذ کی آوازیں آئی تھیں۔ وہ ار تفضی کے کمرے کی طرف آگئی۔

”میں آپ سے پکا ناراض ہوں، کبھی بھی دوستی نہیں کروں گا۔“ بیڈ پر آٹھی پالتی مار کر بیٹھا وہ اپنی ناراضی کا شدت سے اظہار کر رہا تھا۔ وہ کمرے کے دروازے پر رک کر اسے دیکھنے لگی۔ ار تفضی اس کے پاس بیٹھا بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ آفس جانے کے لیے مکمل طور پر تیار نظر آرہا تھا۔ آج شاید اسے کسی خاص میٹنگ یا میٹج میں شرکت کرنا تھی جس کی وجہ سے وہ اتنے زبردست طریقے سے تیار ہوا تھا۔ بلیک ٹوپس سوٹ، وائٹ شرٹ۔

”بیبا سوری بولیں گے پھر بھی دوستی نہیں کروں گے؟“ وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”پھر بھی دوستی نہیں کروں گا۔ کبھی بھی نہیں کروں



گاہ۔ ”وہ پر زور انداز میں بولا۔ ار تفضی اس کی بات سن کر  
زیر لب مسکرایا۔  
”اگر آج آؤنگ کے لیے چلیں، بہت سارا  
گھومیں پھر بھی دوستی نہیں ہوگی۔“ وہ اپنی مسکراہٹ  
دہاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔  
”مجھے پتا ہے، آپ نے کڑی نہیں جاتیں گے۔“  
وہ ماننے سے انکار کرنے لگا۔ ار تفضی نے ہبے ساختہ  
اسے اپنی گود میں بٹھالیا۔

”میں ار تفضی غنفر آج ۲۹ دسمبر کو صبح ساڑھے آٹھ  
بجے اپنے پارے معاذ سے یہ وعدہ کر رہا ہوں کہ آج  
شام ٹھیک پانچ بجے گھر آجاؤں گا اور اس کے بعد کا سارا  
وقت معاذ کا ہوگا۔ جہاں معاذ کے گا، ہم وہاں چلیں  
گے۔ جب تک اس کا گھر واپس آنے کو دل نہیں  
چاہے گا، واپس نہیں آئیں گے۔ جہاں معاذ کے گا،  
وہاں ڈنر کریں گے۔“ اسے اپنے بالکل قریب کیے وہ  
بڑی سنجیدگی سے وعدہ کر رہا تھا۔ معاذ نے بے یقینی سے  
اسے دیکھا۔

”پرامس کریں۔“

”پرامس“ بالکل پکا پرامس۔ ادھر گھڑی پانچ بجائے  
گی، ادھر پایا گھر میں موجود ہوں گے اور معاذ کے پایا کبھی  
جھوٹ نہیں بولتے، کبھی جھوٹا پرامس نہیں کرتے۔“  
شاید کل کی اس کی ناراضی نے ار تفضی کو ڈسٹرب کیا تھا،  
اسی لیے اس وقت وہ اس طرح اس سے وعدہ کر رہا تھا۔  
معاذ کی آنکھوں میں بڑی پیاری سی چمک تھی۔ اس کی  
ساری ناراضی یک دم ہی دور ہو گئی تھی۔

”اب تو پایا سے لڑائی نہیں ہے نا۔“ وہ اس کے  
گالوں پر پیار کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔ معاذ نے نفی میں  
سر ہلا دیا تھا۔

”پاپا تم سے بہت پیار کرتے ہیں معاذ! کل رات  
ناراض ہو کر سوئے تھے تو پایا کو ساری رات نیند نہیں  
آئی تھی۔“ معاذ حیرت اور خوشی سے اس کی طرف  
دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس درجہ شدت سے کبھی اس  
کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اس پر اپنا  
تھوڑا سا رعب رکھتا تھا۔ کبھی کبھار اس کی ضدوں پر

ڈانٹ ڈپٹ بھی کر لیا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ بالکل  
مختلف انداز میں بیٹے سے باتیں کر رہا تھا۔ صبا کو اس بل  
ان دونوں کو دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے پلٹنے  
کے بجائے دروازے پر ہی رکی رہ گئی تھی۔

”اب پایا جاتیں؟“ اس کے چہرے کو ہاتھوں میں  
تھام کر اس نے پوچھا تو معاذ نے فوراً ”گردن ہلا دی۔ وہ  
اسے گود سے اتار کر بیڈ پر بٹھاتے ہوئے خود اٹھ کھڑا  
ہوا تھا۔

”تیار رہنا، ٹھیک پانچ بجے۔“ اس نے گویا معاذ کو  
یاد دہانی کروائی۔ اس نے بڑے زور و شور سے جھوم کر  
گردن ہلا دی تھی۔ ار تفضی ایک پیار بھری نگاہ اس پر  
ڈال کر بریف کیس اور موبائل اٹھاتے ہوئے  
دروازے کی طرف گھوما۔ صبا نے دیکھا کہ اس کے  
کوٹ پر اچھی خاصی شکنیں پڑ گئی تھیں۔ اپنے سوٹ  
کی پروا کیے بغیر اس نے جس طرح معاذ کو گود میں بٹھا کر  
پیار کیا تھا، اس نے اس کی تیاری کو تھوڑا سا خراب  
کر دیا تھا لیکن وہ اس بات سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔  
اس نے ہاتھوں سے بھی ان شکنوں کو ٹھیک کرنے  
کی کوشش نہیں کی تھی۔ مڑتے ہی اس کی نگاہ صبا پر  
پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”چکن پائی بہت مزے کی تھی صبا!“ وہ دروازے پر  
آکر اس کے پاس ٹھہر گیا۔

”رات اتنی زبردست بھوک لگ رہی تھی، کچن  
میں جھانکا تو چکن پائی دیکھ کر مزہ آگیا۔“ وہ ہولے سے  
ہنسا۔ جیسے اپنی بھوک اور ندیدے پن کو انجوائے کر رہا  
ہو۔ وہ جواباً ”خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

ناشتے کے بعد معاذ اکیلا ہی فٹ بال کھیلنے لگا۔ وہ  
آج بہت خوش تھا۔ ساتھ کھیلنے کے لیے اس کے پیچھے  
بھی نہیں لگا تھا۔ وہ کچن سمیٹنے میں لگی ہوئی تھی۔  
ار تفضی ناشتہ کیے بغیر چلا گیا تھا۔ کچن میں آتے ہی وہاں  
صرف رات کے برتنوں کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا  
تھا۔ صبح معاذ کو منانے میں یقیناً اس کا بہت وقت صرف  
ہو گیا تھا اور پھر شاید اس کے پاس اپنے لیے ناشتہ بنانے  
اور کرنے کا وقت نہیں بچا تھا۔



وہ بچن سے فارغ ہو کر معاذ کے پاس لان میں آئی۔  
 باہر نکلتے ہی سرد ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔ سردی  
 کی شدت کا اندازہ تو اندر بھی ہو رہا تھا لیکن باہر نکل کر  
 وہ اسے اپنے اندازے سے بھی زیادہ لگی۔ اسے  
 سردیاں اچھی لگتی تھیں۔ سردیوں کا موسم سردیوں کی  
 بارش اس نے ہمیشہ انجوائے کی تھی مگر معاذ کے لیے  
 اسے یہ موسم ذرا زیادہ ہی سرد لگا۔

”معاذ! باہر بہت ٹھنڈ ہے“ اندر آ کر کھیل بو۔ ”وہ  
 اس کی بات مان کر فوراً“ اندر آ گیا۔ وہ اب لاؤنج میں  
 فرش پر فٹ بال کھیلتا پھر رہا تھا۔

ڈھائی بجے سے وہ اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔  
 ”ماما! چلیں نا تیار ہوتے ہیں۔ آپ میرے کپڑے  
 نکال دیں۔“ وہ اس کی بے قراری پر ملاحظہ ہوتی ہنس  
 رہی تھی۔

”ابھی پانچ بجنے میں بہت دیر ہے جانو! اتنی جلدی  
 تیار ہو کر کیا کرو گے۔ تھوڑی دیر سو جاؤ میں تمہیں  
 ساڑھے چار بجے اٹھا دوں گی۔ تیاری کے لیے آدھا  
 گھنٹہ بہت ہے۔“ ہنسی روکتے ہوئے اس نے اسے  
 پیار سے سمجھایا لیکن وہ سونے کے لیے تو ہرگز آمادہ  
 نہیں تھا۔ اس کے بہت پیچھے لگنے پر صبا کو اس کے  
 کپڑے نکالنے کے لیے کمرے میں آنا پڑا۔ جتنی دیر  
 میں اس نے کپڑے نکالے اتنی دیر میں وہ ہاتھ روم  
 جا کر خوب اچھی طرح رگڑ رگڑ کر منہ ہاتھ دھو کر آ گیا۔  
 جو کپڑے اس نے نکالے تھے وہ اس نے بخوشی پہن  
 لیے۔ سوٹر پہننے میں بھی اپنی عادت کے مطابق کوئی  
 ٹخنے نہیں کیے۔

”اب آپ بھی تیار ہو جائیں۔“ وہ اب صبا کے  
 پیچھے لگا تھا کہ وہ تیار ہو۔ اس کا نہیں جانے کا کوئی موڈ  
 نہیں تھا لیکن وہ معاذ کی معصومانہ سی خوشی کو ختم نہیں  
 کرنا چاہتی تھی۔

”معاذ! اگر تم اور پیپا چلے جاؤ۔ میں گھر رہ لوں۔“  
 اس نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا۔

”جی نہیں“ آپ بھی جائیں گی۔ ”وہ کچھ خفا سا ہوتا  
 الماری کی طرف بھاگا۔ اس کے جو کپڑے اس کے

ہاتھ میں آتے جا رہے تھے وہ انہیں کھینچ کھینچ کر باہر  
 نکال رہا تھا۔

”تم ساری الماری کا حلیہ بگاڑ دو گے۔ ہٹو میں خود  
 نکال لیتی ہوں۔“ وہ اس کے بغیر جانے کے لیے کبھی  
 نہیں مانے گا وہ جانتی تھی اسی لیے مزید کچھ کہے بغیر خود  
 ہی کپڑے نکالنے لگی۔

وہ ہلکی پھلکی تیاری کے ساتھ اس کے سامنے آئی تو  
 وہ بے اختیار بولا۔

”ماما! آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔“ اس نے  
 بڑی سچائی سے اس کی تعریف کی۔

”تم بہت حسن پرست ہو معاذ!“ بے ساختہ اس  
 نے معاذ سے یہ بات کہی اور پھر خود ہی چونک کر بالکل  
 خاموش ہو گئی۔ معاذ کے بارے میں یہ رائے وہ ایک  
 مرتبہ پہلے بھی دے چکی ہے۔ اسے اچانک ہی اپنی کہی  
 وہ پرانی بات یاد آئی تو وہ بالکل خاموش ہو گئی۔

”یہ کیا ہوتا ہے؟“ معاذ حسن پرست کا مطلب  
 نہیں سمجھا تھا۔ وہ حیرت سے اس سے اس بات کا  
 مطلب پوچھ رہا تھا۔

”یہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔“ ایک گہری سانس لے کر  
 وہ سیدھی ہوئی اور ہولے سے اس کے سرخ گالوں کو  
 چھوا۔ سوٹ کے ساتھ کا دوپٹہ اوڑھنے کے بجائے اس  
 نے سیاہ کشمیری کڑھائی والی گرم شال اوڑھ لی۔ وہ  
 دونوں کمرے سے نکل کر واپس لاؤنج میں آئے تو موسم  
 کچھ اور بدلا ہوا لگا۔ ہلکی ہلکی سی پھوار بارش میں بدلتی  
 نظر آرہی تھی۔

”لگتا ہے“ خوب زوردار بارش ہوگی۔ اگر بارش  
 ہوئی تو کیسے جاؤ گے معاذ!“ بڑی شرارتی مسکان چہرے  
 پر لیے وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔

”بارش ہوگی تو بھی جائیں گے۔“ اس نے پر زور  
 انداز میں کہا۔ ساڑھے چار بج رہے تھے۔ وہ بی وی آن  
 کر کے وقت گزارنے لگی۔

معاذ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھڑکی میں جا کر پوریج  
 میں جھانک رہا تھا۔

پانچ بجنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے انتظار



کی گھڑیاں بس ختم ہونے ہی والی تھیں اور پھر گھڑی نے پانچ بجادے لیکن وہ نہیں آیا۔  
 ”پاپا ابھی تک کیوں نہیں آئے؟“ سوپانچ ہو رہے تھے اور پچھلے پندرہ منٹوں میں وہ پندرہ ہی مرتبہ اس سے یہ سوال کر چکا تھا۔

”آنے والے ہوں گے بیٹا! دیکھو بارش بھی تو کتنی تیز ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ راستے میں کہیں پھنس گئے ہوں۔“ وہ مسلسل اس سے یہی کہہ رہی تھی۔

”آنے والے ہیں“ آنے والے ہیں“ آپ کتنی دیر سے یہی کہہ رہی ہیں۔“ ساڑھے پانچ بجے اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ اب اسے فون کر رہا تھا۔ صبا نے اسے ٹوکا نہیں تھا۔ ریسپور کان سے لگائے وہ دوسری طرف سے کال ریسپو کیے جانے کا منتظر تھا۔ کافی دیر تک ریسپور کان سے لگائے رکھنے کے بعد اس نے مایوس ہو کر ریسپور واپس رکھ دیا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے اس سے پوچھا۔

”پاپا کال ریسپو نہیں کر رہے۔“ وہ بہت مایوس اور اداس نظر آنے لگا تھا۔

”لاؤ“ میں ٹرائی کروں۔“ وہ اٹھی اور ار تفضی کا موبائل نمبر ملایا۔ اس کا موبائل آف نہیں تھا۔ ڈائل ٹون بھی بالکل ٹھیک تھی پھر وہ کال کیوں نہیں ریسپو کر رہا تھا۔ اس نے تین مرتبہ ٹرائی کیا۔

”میرا خیال ہے وہ راستے میں ہوں گے۔ یہ دیکھ کر کہ گھر سے فون کیا جا رہا ہے، جان کر بات نہیں کر رہے۔ سوچ رہے ہوں گے اب تو میں گھر پہنچنے ہی والا ہوں۔“ ریسپور کریڈل پر رکھتے ہوئے اس نے معاذ کو تسلی دی۔ وہ بغیر کوئی جواب دیے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔

”کیا ہوا معاذ!“ وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”پاپا نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ جھوٹا پراس کیا۔“ وہ باپ کی وعدہ خلافی پر سخت غصے میں تھا۔

گھڑی ساڑھے چھ بج رہی تھی اور وہ اس چھوٹے سے بچے کو کسی بھی طرح یہ بات سمجھا نہیں پا رہی تھی

کہ معاذ تمہارے پاپا جھوٹ نہیں بولتے اور کسی کے ساتھ وہ ”مسلحہ“ جھوٹ بول بھی لیں، تمہارے ساتھ کبھی نہیں بول سکتے۔ وہ معاذ کو نہیں سمجھا سکتی تھی لیکن خود بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ ار تفضی غصہ جھوٹ نہیں بولتا اور اپنے بیٹے کے ساتھ تو وہ کبھی جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ وہ اچھی اور ایک مرتبہ پھر فون ملانے لگی۔ اب کی بار وہ اس کے آفس فون کر رہی تھی۔ دوسری طرف اس کی سیکریٹری نے فون اٹینڈ کیا تھا۔

”سر تو تین بجے آفس سے چلے گئے تھے۔“ ار تفضی سے متعلق اس کے استفسار کے جواب میں اس نے بتایا۔

”وہ آفس سے کہاں گئے تھے؟“ اس نے خود محسوس کیا کہ اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ ہے۔

”میں کچھ کہہ نہیں سکتی میڈم! انہوں نے آج صبح آفس آتے ہی اپنی سب لپاٹمنٹس کینسل کروادی تھیں۔ شام چار بجے ایک میٹنگ تھی، انہوں نے اسے بھی ملتوی کر دیا تھا۔ کہہ رہے تھے

کہ آج انہیں اپنا کچھ پر سٹل اور بہت ضروری کام ہے۔ وہ آفس سے جلدی چلے جائیں گے۔ سچ بھی نہیں کیا تھا انہوں نے۔ جلدی جلدی ضروری کام نمٹا کر وہ تین بجے آفس سے اٹھ گئے تھے۔“ وہ شاید اس کی پریشانی کو محسوس کر گئی تھی، اسی لیے بہت تفصیل سے بتایا تھا۔ وہ فون بند کر کے واپس معاذ کے پاس آگئی۔ وہ ابھی بھی رو رہا تھا۔

”چلے گئے ہوں گے اپنی کسی میٹنگ میں۔“ وہ روتے ہوئے غصے سے بولا۔

معاذ روتے روتے خود ہی چپ ہو گیا تھا۔ باہر بارش پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ موسلا دھار اور گرج چمک والی بارش۔ بادلوں کی گرج چمک ان کے بیچ موجود خاموشی کو بڑے خوفناک انداز میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد توڑ رہی تھی۔ اسے بادلوں کی گرج چمک کبھی اچھی نہیں لگی تھی۔ عجیب سا خوف اور دہشت پیدا ہو جاتی تھی بادلوں کے گرجنے سے اور آج تو یہ شور



اسے ہمیشہ سے بھی زیادہ برا لگ رہا تھا۔ گھڑی میں ساڑھے سات بجتے دیکھ کر معاذ نے ایک مرتبہ پھر رونا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا۔

”معاذ! پیپا آنے والے ہوں گے۔ تم دیکھ لیتا، ان کی گاڑی خراب ہو گئی ہوگی۔“ اس سے یہ بات کہتے وقت اسے ایسا لگا جیسے وہ معاذ سے زیادہ خود اپنے آپ کو تسلی دے رہی ہے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ کہیں جھبی تھا، چاہے گاڑی خراب ہو گئی تھی یا جو بھی مسئلہ تھا، وہ گھر پر فون کیوں نہیں کر رہا تھا۔ وہ اتنا غیر ذمہ دار اور لاپرواہ بھی نہیں رہا تھا اور پھر وہ موبائل پر کال کیوں ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ وہ انٹھی اور اٹھ کر ایک مرتبہ پھر اس کے موبائل پر کال کرنے لگی۔ چار مرتبہ اس نے کوشش کی، بہت دیر تک بیل جانے دی مگر وہ جیسے بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے رضا کے گھر کا فون نمبر ڈھونڈا۔ فون اس کے ملازم نے اٹھایا۔ رضا اور فائرہ گھر پر نہیں تھے وہیں رکھے ٹیلی فون انڈکس میں اسے رضا کے علاوہ ار ترضی کے کچھ اور جاننے والوں کے فون نمبرز بھی مل گئے۔ ان میں سے کسی کو بھی اس کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔

ریسیور واپس رکھ کر وہ گم صم سی فون کے پاس کھڑی تھی۔ وہ یہاں رضا کی فیملی کے علاوہ کسی کو بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ اس طوفانی بارش میں کس کے پاس جائے، کس سے کہے کہ ار ترضی غصہ فر کو ڈھونڈ کر لے آؤ۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے نو بج چکے تھے۔ معاذ روتے روتے صوفے پر ہی سو گیا تھا۔

وہ کمرے سے اس کے لیے کپل اٹھا کر لے آئی۔ اس پر کپل ڈالتے ہوئے اس نے جھک کر اس کے گالوں پر ٹھہرے آنسو صاف کیے پھر اس کے ماتھے پر بکھرے بالوں کو پیار سے سنوارتے ہوئے اسے پیار کرنا چاہا۔ وہ اسے پیار کرنے کے لیے اس کے گال پر جھکی ہی تھی کہ ایک دم ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ اتنا تڑپ کر اتنا والہانہ انداز میں اپنے پیار کرنے پر اسے اچانک ار ترضی کا صبح کا وہ والہانہ انداز یاد آیا تھا۔

پانچ سال پہلے ایک خوبصورت سی شام کسی نے اسی والہانہ انداز میں بڑی شدت کے ساتھ معاذ کو پیار کیا تھا۔ آخری بار پیار کیا تھا۔

”تم تو اسے ایسے پیار کر رہی ہو ثمن! جیسے یہ تم سے کہیں دور جانے والا ہے۔“

”اللہ نہ کرے جو کبھی معاذ مجھ سے دور ہو۔“ پانچ سال پہلے کی وہ شام زندہ ہو کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

”ہونے دو خراب، میرا بیٹا میری گود میں آکر خوش ہو رہا ہے۔ اور میں یہ سوچ کر اسے خود سے دور کروں کہ کہیں میری ساڑھی نہ خراب ہو جائے۔“

”پیپا تم سے بہت پیار کرتے ہیں معاذ، کل رات ناراض ہو کر سوئے تھے تو پیپا کو ساری رات نیند نہیں آئی تھی۔“ وہ خوف سے کاپٹی مسلسل معاذ سے دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔

”اور معاذ کے پیپا کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ کبھی جھوٹا برا مس نہیں کرتے۔“ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے ٹکرا کر رک گئی تھی۔

بہت زور سے بادل گرجے تھے اور ساتھ ہی فون کی بیل بھی بجی تھی۔ آج یہ آسمانی بجلی کہاں گرنے والی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ لیکن اس کا دل؟ وہ کیوں اس طرح تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ اس نے خوف سے اپنے سے چند قدم کے فاصلے پر رکھے ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف دیکھا۔ اس کے قدموں نے اٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ یہ فون نہیں سنے گی۔ فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔

کہاں سے تھا یہ فون؟ کون اس سے بات کرنا چاہتا تھا؟ اسے کیا خبر سنائی جانی تھی۔

”تم میرے ساتھ ایسا مت کرنا، ار ترضی غصہ فر۔ ایسا مت کرنا جیسا ثمن نے کیا تھا، جیسا ممانے کیا تھا۔“ فون کی بیل بج بج کر خود ہی خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے کانوں پر سے ہاتھ ہٹائے اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ سوادس ہو رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے سوادس بجے ایسا لگ رہا تھا جیسے آدھی رات گزر چکی ہو۔ لاؤنج کے



علاوہ پر راکھ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔  
باہر بجلی ویسے ہی چمک رہی تھی۔ پائل ویسے ہی  
خوفناک انداز میں گرج رہے تھے۔ بارش اسی شدت  
سے برس رہی تھی۔

سردیوں کی بارش اسے کتنی پسند تھی۔ وہ اس موسم  
کو گھر آکر انجوائے کیوں نہیں کر رہا۔

”چکن پانی بہت مزے کی تھی صبا؟“ اس کے کانوں  
میں اس کا صبح کا وہ جملہ گونجا۔ اسے یاد آ رہا تھا، صبح وہ  
ناشتہ کیے بغیر چلا گیا تھا۔ اس کی سیکریٹری کہہ رہی تھی  
کہ اس نے سچ بھی نہیں کیا اور کل رات؟ چکن پانی کی  
تعریف اس نے یونی کی تھی۔ کھایا تو بہت تھوڑا سا  
تھا۔ ”مجھے اس کے لیے ناشتہ بنانا چاہیے تھا۔ اب بھی  
پتا نہیں اس نے کھانا کھایا ہو گا یا نہیں۔“

وہ اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔  
”جلدی سے واپس آ جاؤ میں تمہارے لیے خود کھانا  
بناؤں گی۔ تمہیں اس دن میرے ہاتھ کی بریانی اچھی  
لگی تھی ناں۔ میں اس دن سے بھی اچھی بریانی پکاؤں  
گی۔ تمہیں میرے ہاتھ کی کافی پسند ہے نا۔ میں  
تمہارے لیے اپنے ہاتھ سے کافی بناؤں گی۔“

اچانک بجنے والی فون کی بیل نے اس کی ساری  
سوچوں کو درہم برہم کر دیا۔ یہ فون کیوں بار بار بج رہا  
ہے۔ وہ کوئی فون نہیں سنے گی۔ اس نے فون کا تار بڑی  
بے دردی سے کھینچتے ہوئے فون اٹھا کر دور پھینک دیا  
تھا۔ اب یہ بیل نہیں بجے گی۔ اس نے سکون کا سانس  
لیا۔ وہ پھر دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے کھڑی  
ہو گئی۔

”صبا! ہمارے پاس گنوانے کے لیے بہت کچھ اب  
بچا ہی نہیں ہے۔“ وہ جیسے اسی دیوار سے ٹیک لگائے  
اس کے برابر کھڑا تھا۔

”میرے پاس تو واقعی اب گنوانے کے لیے کچھ بھی  
نہیں بچا۔“ اس نے آہستہ سے شکستہ لہجے میں اس  
سے کہا۔ لیکن وہ وہاں ہوتا تو اس کی بات کا کوئی جواب  
دیتا۔

وہ اس کی بد تمیزی پر اسے تھپڑ مارنے کے بعد خود

میں معافی مانگنے آیا تھا۔ اس نے اپنے بائیں مٹک پر  
ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی زندگی میں اس شخص کے علاوہ  
دوسرا ایسا کوئی نہیں تھا۔ جو اس کی غلطیوں کو اتنی آسانی  
سے نظر انداز کر دیتا ہو۔ جو اس کی بد تمیزی پر اس سے  
ناراض ہونے کے بجائے الٹا خود اسے منانا ہو۔ اور جو  
اسے تکلیف دینے والے سے انتہائی حدوں تک  
نفرت کرتا ہو۔

”واپس آ جاؤ ار تھنی! پلیز واپس آ جاؤ۔“ اس نے  
بڑی شدت سے اسے پکارا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے  
تھے۔ وہ کب سے گھڑی پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

”مما! آپ نے کہا تھا کہ آپ کو اپنے سکے بیٹے پر  
بھی اتنا بھروسہ نہیں ہے جتنا ار تھنی پر ہے۔ آپ کو  
یقین تھا کہ وہ مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا ہمیشہ  
میری حفاظت کرے گا۔ مجھے ہر دکھ اور ہر تکلیف سے  
بچائے گا۔ پھر آج میں تنہا کیوں ہوں ممما؟ وہ میرے  
ساتھ کیوں نہیں ہے؟ وہ میرے پاس کیوں نہیں ہے؟  
آپ نے مجھے دعا دی تھی ممما! کہا تھا کہ صبا زندگی تم پر  
ہمیشہ ماں کی گود کی طرح مہربان رہے گی، اس کا دامن  
کبھی تمہارے لیے تنگ نہیں پڑے گا۔ لیکن زندگی  
کبھی مجھ پر ماں کی گود کی طرح مہربان نہیں ہوئی ممما۔  
اس نے قدم قدم پر مجھے آزمایا ہے۔ قدم قدم پر مجھے  
تکلیفیں دی ہیں۔ دیکھیں ممما! آج اس طوفانی بارش  
اور اجنبی شہر میں آپ کی صبا بالکل تنہا ہے۔“ اچانک  
اس کے دل میں شدت سے یہاں سے بھاگ جانے کی  
خواہش ابھری تھی۔

باہر سڑک پر بھی مکمل اندھیرا پھیلا ہوا تھا، صرف  
بجلی کے چمکنے سے لمحہ بھر کے لیے روشنی ہوتی اور پھر  
اندھیرا۔ اس نے اپنے گھر کے گیٹ سے باہر ایک  
گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتی دیکھیں۔

وہ بے ساختہ دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ وہ اس لمحہ  
سب کچھ بھول گئی تھی۔ یہاں تک کہ معاذ کو بھی۔  
اسے بس یہ یاد تھا کہ اسے اس گھر سے کہیں چلے جانا  
چاہیے۔ کہیں دور، بہت دور۔ وہ اب زندگی کو بھی یہ  
موقع نہیں دے گی کہ وہ صبا شفیق کو آزمائے۔



آنے والے نے بجائے گیٹ پر ٹپل کرنے کے چالی سے خود ہی گیٹ کھول لیا تھا۔ گیٹ کھلنے کی آواز پر چوکیدار فوراً باہر نکلا اور پھر آنے والے کو دیکھ کر مطمئن ہوتا واپس اندر چلا گیا۔ اس نے گیٹ کے اندر قدم رکھنے والے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتی بھی نہیں تھی۔ وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے اس اندر آنے والے کو نظر انداز کرتی گیٹ کھولنے لگی۔

”کیا ہوا صبا؟“ اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے گیٹ سے نکلنے سے روکا تھا۔ اس نے چونک کر اس آنے والے کو دیکھا۔ اسے یقین تھا یہ اس کا دام ہے وہ کسی اور کی شکل میں اس کی شکل دیکھ رہی ہے۔ اس کے سامنے کوئی اور کھڑا ہے۔ شاید رضایا پھر شاید اس کا کوئی اور دوست۔ وہ تیزی سے اس کے پاس آگیا۔

”صبا“ یہ آواز اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی یہ شکل اس کا الوژن ہو سکتی تھی لیکن یہ آواز بے ساختہ وہ اس کے قریب ہوئی۔

”تم پریشان ہو رہی تھیں صبا؟“ وہ بہت تشویش سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اوپر آہستہ سے ہاتھ رکھا تھا۔ وہ جیسے اچانک ہی کسی خواب سے جاگی تھی۔

”کہاں گئے تھے؟“ وہ بہت زور سے چیختی تھی۔

”وعدہ کر کے گئے تھے پانچ بجے آؤں گا۔ کیوں نہیں آئے؟ یہ بھی نہیں سوچا کہ صبا اور معاذ اکیلے ہیں۔“ وہ اس کے بازوؤں کو جھجھوڑتے ہوئے اور تیز آواز میں چلائی۔

”صبا! میں۔۔۔“ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر وہ کچھ سننے پر آمادہ نہیں تھی۔

”مما کتنی تھیں۔“ صبا! ار تفضی تمہارا بہت خیال رکھے گا۔“ یہ خیال رکھا ہے میرا؟ اس انجان شہر میں مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔“ اس پر ایک جنون سا سوار تھا وہ اسی طرح اسے جھجھوڑتے ہوئے چلا رہی تھی۔

”صبا! میں گھر پر فون کر رہا تھا، تم فون سن ہی نہیں رہی تھیں“ اس کی تیز آواز نے پھر ار تفضی کو بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

”سب مرجائیں گے صرف صبا زندہ رہے گی۔“ اسے کوئی قبول نہیں کرتا۔ اسے موت بھی قبول نہیں کرتی۔ صبا زندہ رہے گی سب کو مرنا دیکھنے کے لیے۔ ثمن کی اماں کی ماما کی اور اب آپ۔ اب آپ کی باری ہے۔ مرنا چاہتے ہیں۔ صبا کو اکیلا چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔“ وہ اس کے سینے پر مکے مار رہی تھی۔

”صبا! مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ دیکھو میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔“ اس نے ذرا سختی سے کہتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

”دیکھو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں کہیں بھی نہیں گیا۔ میں تمہارے پاس ہوں۔ میں نہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جا رہا۔“ اس نے بہت نرم لہجے میں اسے یقین دلایا۔ اس نے ایک پل کے لیے اس کی طرف دیکھا اور پھر پتا نہیں اسے کیا ہوا تھا اس نے ایک دم ہی اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔

”مجھے اسیا لگا کہ ثمن، اماں اور ماما کی طرح آپ بھی۔ آپ نے کہا تھا ہمارے پاس گنوانے کے لیے کچھ نہیں بچا۔ میرے پاس تو واقعی اب گنوانے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا ہے۔“ وہ رو رہی تھی۔ ار تفضی نے اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے کے گرد رکھا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ابھی بھی اس کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ وہ منہ سے کچھ بھی نہیں بول رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔

”ثمن اور ماما کی طرح مجھے چھوڑ کر مت جائے گا۔ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔ میں نے آپ سے محبت کی ہے۔ آپ کو کچھ ہوا تو میں بھی مر جاؤں گی۔“ وہ اسی طرح روتے ہوئے بولی۔ اسے یوں روتے روتے پتا نہیں کتنے پل گزر گئے تھے۔

ار تفضی نے اسے رونے سے منع نہیں کیا، لیکن اسے خود ہی روتے روتے نہ جانے کیا ہوا تھا۔ اس نے اس کے پاس سے ہٹنے کی کوشش کی۔ اپنے کندھے پر



سے اس کا ہاتھ ہٹانا چاہا۔ ار تفضی نے اس کے کندھے پر سے ہاتھ ہٹالیا اور اس کے ہاتھ بھی چھوڑ دیے۔ وہ فوراً "سیدھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ پھیرنے کے بعد اسے اپنے سامنے کیا۔ اس کے ہاتھ پر اس کے آنسو تھے۔ وہ بے یقینی سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ رو رہی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے ہیں۔

پانچ سال بعد وہ روئی تھی۔ اور یہ تو طے تھا کہ اگر کبھی اس کی آنکھیں رونے کے قابل ہو سکیں تو سب سے پہلے انہیں کس بات پر رونا ہے۔ اسی بات پر جس بات کے بعد ان آنکھوں نے رونے سے انکار کر دیا تھا۔

اس کی بہن پانچ سال پہلے مری تھی۔ لیکن اس کے مرنے کا تم اسے آج منانا تھا۔

"شمن!" وہ بہت زور سے چلائی تھی۔ ار تفضی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اب اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

"شمن! شمن!" پکارتے وہ زور زور سے رو رہی تھی۔ روتے روتے وہ بارش کے پانی سے بھری ٹھنڈی بج گھاس پر بیٹھ گئی۔ لان میں بارش کی وجہ سے ہر طرف پانی ہی پانی ہو رہا تھا۔

"تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں شمن!" اس نے روتے روتے گھاس پر اپنا چہرہ رکھ دیا تھا۔ وہ اب مزید خاموشی سے اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"صبا! اٹھو۔ اندر چلو۔ دیکھو بارش کتنی تیز ہو رہی ہے۔ کتنی ٹھنڈ ہے یہاں پر۔" اس نے اس کا چہرہ اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔

"مجھے تمہارا آنا برا نہیں لگا تھا شمن! میں نے کبھی تم سے نفرت نہیں کی۔ تم سے تو میں بہت پیار کرتی ہوں بہت پیار کرتی ہوں۔ میں تم سے شمن۔" ار تفضی اس کا سر اوپر نہیں اٹھا سکا تھا۔ وہ خود بھی اس کے پاس گھاس پر بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح ہڈیانی انداز میں چلاتے ہوئے رو رہی تھی۔

بارش کا شور اس کی چیخوں کو دبانے میں ناکام تھا۔

"دیکھا آپ نے، شمن چلی گئی مجھے چھوڑ کر۔ کتنا روکا میں نے اسے اس نے میری بات نہیں سنی۔" اس نے اپنے برابر میں بیٹھے ار تفضی کی طرف دیکھا۔ وہ زندہ رہتی۔ آپ کے ساتھ رہتی۔ کچھ وقت تو دیتی مجھے۔ اتنا وقت کہ میں ماما کا سمجھایا ہوا محبت کا مقصوم سمجھ لیتی۔ مجھے محبت میں ضد کے بجائے صبر کرنا آ جاتا۔ "وہ اب اس کے کندھے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اسے نہ سردی کا احساس ہو رہا تھا اور نہ بارش میں بھینکنے سے کوئی تکلیف، وہ بس روئے چلی جا رہی تھی۔

"صبا! اندر چلو، یہاں بہت سردی ہو رہی ہے۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھر کے اندر لایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اسی کے سہارے چلتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔ لاؤنج میں سوئے ہوئے معاذ پر ایک نظر ڈالتا وہ اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ اسے بیڈ پر بٹھا کر وہ ہیٹر آن کرنے لگا تھا۔ وہ ابھی بھی چپ نہیں ہوئی تھی۔ اس کے رونے کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بس صرف اتنا فرق تھا کہ اب وہ روتے ہوئے چیخ نہیں رہی تھی۔ اس کے لبوں پر اب بھی یہی جملہ تھا۔

"شمن کو میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ جیسے خود ہی سے مخاطب تھی۔

"وہ میری زندگی کے سترہ سال تھے۔ سترہ دن یا سترہ مہینے نہیں۔ سترہ سالوں کی محبت تھی میری۔ میں اتنی جلدی کیسے بھول جاتی اپنی محبت کو۔ اتنی جلدی کیسے قبول کر لیتی۔ اس بات کو کہ سترہ سال تک جس شخص سے میں نے محبت کی، وہ مجھے نہیں شمن کو مل گیا ہے۔ سترہ سال کی محبت کو بھلانے میں کچھ وقت لگنا تھا۔ اسے مجھے تھوڑا سا وقت دینا چاہیے تھا۔ وہ مجھے کچھ وقت دیتی، اتنا کہ میں تقدیر کے اس فیصلے کو قبول کر لیتی۔

میں اس کی بہن تھی۔ کیا اتنی کمینہ ہو سکتی تھی کہ ساری زندگی اس سے حسد کرتی رہتی۔ مجھے تو بس تھوڑا سا وقت چاہیے تھا۔

اس نے مجھے سمجھانے کا وقت نہیں دیا۔ تھوڑی سی



مہلت نہیں دی۔ اس نے صرف مجھے سزا سنائی۔ اس نے مجھے آنکھوں میں خود میری اپنی بد صورت اور کرمہ شکل دکھائی ایسی بد صورت کہ میں خود سے نفرت کرنے لگی۔ خود اپنی نظروں میں گر گئی۔ "وہ اسی طرح سر جھکا کر روتے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی پھر روتے روتے اس نے ار تفضی کی طرف دیکھا وہ ایک ٹک خاموشی سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ سب روئے تھے اس کے مرنے پر۔ اماں کی پوتی مری تھی وہ روتی تھیں۔ ماما اور ڈیڈی کی بیٹی مری تھی وہ روئے تھے۔ بابا کی بیٹی اور بہو مری تھی وہ روئے تھے۔ آپ کی بیوی مری تھی آپ کے بیٹے کی ماں مری تھی آپ روئے تھے۔ ظفر بھائی کی بہن مری تھی وہ روئے تھے۔ لیکن اس نے مجھے اپنی موت پر رونے بھی نہیں دیا تھا۔ اس نے مجھ سے سارے حق چھین لیے تھے۔

وہ ہنسی تھی مجھ پر۔ کس منہ سے تم میرے مرنے پر روو گی صبا؟ تم نے میرے مرنے کی دعائیں مانگی تھیں۔ تمہاری تو آج دعائیں قبول ہوئی ہیں۔ تمہارے لیے تو آج جشن کا دن ہے۔ وہ کتنی ظالم ہو گئی تھی۔ کتنی کٹھور وہ خود مر گئی اور صبا کو اس نے جیتے جی مار ڈالا۔ میرے اتنے سارے رشتے مجھ سے پھڑے۔ میں نہ رو سکی۔ اس نے میری آنسو چھین لیے تھے۔

کیا واقعی محبت اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس پر انسان کو کبھی معافی ملے ہی نہ؟ اور وہ محبت میں نے کیوں کی تھی؟ کب کی تھی؟ مجھے تو ڈھنگ سے یاد بھی نہیں میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ میں نے ہوش سنبھالتے ہی ایک شخص کو خود سے بہت قریب دیکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ اتنا غیر معمولی سلوک کیوں کرتا تھا؟ شاید کزن سمجھ کر؟ شاید چھوٹی بہن سمجھ کر؟ مگر اس توجہ کے میرے دل نے بہت چھوٹی عمر میں ہی بہت مختلف معنی نکال لیے تھے۔ مجھے محبت کے معنی بھی نہیں پتا تھے اور میں ار تفضی غصہ و نفرت سے محبت کرتی تھی بہت چھوٹی عمر میں میرے دل نے مجھے یہ بات سمجھا دی تھی۔

"صبا یہ شخص جو تمہارا اتنا خیال رکھتا ہے۔ تمہاری اتنی پروا کرتا ہے۔ یہ صرف اور صرف تمہارا ہے۔" میں ار تفضی سے محبت کرتی تھی۔ اسے اپنی ملکیت سمجھتی تھی۔ "وہ اسی طرح اس کے چہرے پر نظریں جمائے روتے ہوئے بول رہی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے اسے کوئی کہانی سنار ہی ہو۔ پھر کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہوئی اس پر سے نظریں بھی ہٹا لیں لیکن پھر اچانک ہی جیسے اسے کوئی بات یاد آئی تھی۔ اس نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا اتنی دیر میں اب وہ پہلی بار براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"کیوں رکھتے تھے میرا اتنا خیال؟ کیوں کرتے تھے میری اتنی پروا؟ کیوں دیتے تھے مجھے اتنی اہمیت؟ کیوں ہر جگہ صرف صبا کی خاطر جیت کر آتے تھے؟ دیکھاناں کتنا نقصان ہوا میرا۔ اسی وقت مجھے بتا دیتے کہہ دیتے کہ صبا میں یونہی تمہاری پروا کرتا ہوں۔ مجھے تم سے ویسی محبت نہیں جیسی تم سمجھتی ہو۔ اسی وقت میری غلط فہمی دور ہو جاتی۔ تب ہماری زندگی میں دشمن نہیں آئی تھی اسی وقت میری محبت کو رد کر دیتے تو میں اس کا ذمہ دار دشمن کو نہیں سمجھتی۔ پھر میں یہ کبھی نہیں سوچتی کہ دشمن کی وجہ سے میری محبت مجھ سے چھینی ہے۔

بولنے اور رونے کے ساتھ ساتھ وہ اس کے بازو کو بھی جھنجھوڑنے لگی تھی۔ جیسے اسے اس کی غلطی کا احساس دلانا چاہ رہی ہو۔ وہ ہنوز خاموش تھا۔ "آپ نے میری غلط فہمی دور نہیں کی۔ لیکن دشمن نے کر دی۔ اس کے آنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ وہ شخص جسے میں بچپن سے صرف اپنا سمجھتی تھی وہ میرا نہیں تھا۔ وہ دشمن کا تھا۔ میری بچپن کی محبت ایک جھٹکے میں دشمن نے مجھ سے چھین لی۔ وہ محبت جو میری تھی ہی نہیں میں اس کے نہ ملنے کا ذمہ دار دشمن کو سمجھنے لگی۔

میں اندر ہی اندر اس سے نفرت کرنے لگی۔ اس سے حسد کرنے لگی۔ مگر میری نفرت اور حسد بھی اسے آپ کی زندگی میں شامل ہونے سے روک نہیں



پائی۔ میں اپنی شکست اور بربادی پر سوائے رونے اور  
 تمن کو بددعا میں دینے کے کچھ کر نہیں سکتی تھی۔  
 بہت دعا میں مانگی تھیں میں نے آپ کو پانے کے  
 لیے۔ میری کوئی دعا قبول نہیں ہوئی۔

میری دعاؤں میں اثر نہیں تھا مگر میری بددعاؤں میں  
 بہت اثر تھا۔ جس رات آپ دونوں نے نئی زندگی  
 شروع کی میں ساری رات تمن کو بددعا میں دیتی رہی  
 تھی۔ اپنی بہن کے مرجانے کی دعا میں مانگی تھی میں  
 نے بڑے بچے دل سے۔

پھر میری بددعاؤں نے قبر تک اس کا پیچھا کیا۔ اسے  
 قبر تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ میں بھول چکی تھی اپنی ان  
 بددعاؤں کو۔ مجھے وہ اس روز یاد آئیں جب تمن نے  
 پریل ساڑھی کی جگہ سفید کفن پہن لیا۔ میں نے تو  
 یونہی بے سوچے سمجھے غصے میں اسے بددعا دے دی  
 تھی۔ کیا پتا تھا وہ اسے لگ بھی جائے گی۔ "وہ دوبارہ  
 زور زور سے رونے لگی تھی۔ بہت دیر تک وہ اس  
 طرح چیخ چیخ کر روتی رہی۔

"آپ سے اگر یہ کہوں کہ میں تمن سے بہت پیار  
 کرتی تھی تو آپ یقین نہیں کریں گے۔ اب تو کبھی  
 بھی نہیں کریں گے۔ لیکن میں اس سے پیار کرتی  
 تھی۔ وہ میری بہن تھی۔ آپ بھی نہ مانیں، تمن بھی  
 نہ مانے۔ چاہے کوئی بھی نہ مانے، مجھے تمن سے محبت  
 تھی۔ میں صرف اس لڑکی سے نفرت کرتی تھی جس  
 نے ار ترضی غنفر کو مجھ سے چھینا تھا۔"

مسلل رونے اور چیخنے سے اس کی آواز بیٹھ گئی  
 تھی۔ اس کے منہ سے لفظ پورے نہیں نکل رہے  
 تھے۔ لیکن وہ پھر بھی چپ نہیں ہوئی تھی۔ وہ سب  
 کچھ کہہ دینا چاہتی تھی۔ اسے اس بات کا نہ کوئی ہوش  
 تھا نہ پروا کہ ار ترضی یہ سب باتیں سن کر اس کے  
 متعلق کیا سوچے گا۔ وہ ہر بات سے بے نیاز ہو چکی  
 تھی۔

"بڑی خوش تھی میں اس روز جب مم اور ڈیڈی  
 نے مجھے سفیر فیروز کے سنگ رخصت کیا تھا۔ میں اپنے  
 تصور میں تمن کا چہرہ لاتے ہوئے مسکراتی تھی۔ میں

نے اسے بتایا تھا کہ اس کی سب سوچیں غلط تھیں۔  
 میں نے اس کی کسی چیز پر قبضہ نہیں کیا۔ میں تو اس گھر  
 سے یہ ہمیشہ ہمیش کے لیے دور جا رہی ہوں۔ کتنا سکون  
 ملا تھا مجھے اس روز۔ میں تمن کی نظموں میں سرخرو  
 ہو گئی تھی۔ مگر تقدیر نے میرے ساتھ کتنا بھیانک  
 کھیل کھیلا۔ شادی کی پہلی رات میرے شوہر نے مجھے  
 قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ "وہ اب اپنے ہاتھوں میں  
 چہرہ چھپا کر رو رہی تھی۔

"تمن نے ایک روز مجھ سے کہا تھا کہ وہ میرے لیے  
 دعا کرتی ہے کہ مجھے ار ترضی غنفر جیسا محبت کرنے  
 والا شوہر ملے، مجھے اس کی وہ بات بہت بری لگی تھی۔  
 کیوں دے رہی تھی وہ مجھے یہ دعا۔ ار ترضی غنفر کے  
 بعد نہ پھر مجھے محبت چاہیے تھی اور نہ محبت کرنے والا  
 کوئی شخص۔ میں نے خود اپنے لیے دعا مانگی تھی کہ  
 جب میں ار ترضی کو اچھی نہیں لگی تو پھر کبھی کسی کو  
 اچھی نہ لگوں۔ جب اسے مجھ سے محبت نہیں ہوئی تو  
 پھر کبھی کسی کو مجھ سے محبت نہ ہو۔ مجھے کسی کی  
 محبت نہیں چاہیے، مجھے کسی کی توجہ نہیں چاہیے۔"  
 اس نے یک دم ہی اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا دیے  
 تھے۔

"بڑے بچے دل سے میں نے خود کو بددعا دی تھی۔  
 صبا کو زندگی میں سب کچھ ملا، بس محبت ہی نہیں ملی۔"  
 اس نے اپنی ہتھیلیاں سامنے پھیلانی ہوئی کھیں۔  
 جیسے ان میں محبت کی لکیر ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی  
 ہو۔ اس کے آنسو اب اس کی ہتھیلیوں پر گر رہے  
 تھے۔

"دیکھیں، نہیں ہے محبت کی لکیر میرے ہاتھ میں۔  
 میں نے سفیر سے بھیک مانگی تھی اس رشتے کو قائم  
 رکھنے کے لیے۔ مجھے کسی بے عزتی کا احساس نہیں  
 ہوا تھا۔ آپ کو لگا تھا مجھ میں عزت نفس اور غیرت  
 بالکل ختم ہو گئی ہے۔ ہاں ہو گئی تھی مجھ میں عزت  
 نفس ختم۔ میں اس رشتے کو ختم کر کے واپس اپنے گھر  
 آجاتی۔ پھر سے تمن کے سامنے شرمسار ہونے کے  
 لیے۔ اب کم از کم میں تمن کی تصویر کے آگے سر اٹھا



اے اپنے کام سے فون کیا تھا۔ ان کی بی فیکٹری کی تعمیر کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ وہ ارنلڈ کو اپنی فیکٹری کی سائٹ پر لے جانا چاہتے تھے۔ اے انیس انکل کو منع کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔ پھر آج کی اپنی باقی تمام مصروفیات تو وہ ملتوی کر ہی چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ آفس سے بجائے ساڑھے چار کے تین بجے اٹھ جائے گا۔

وہ آفس سے تین بجے اٹھ گیا، انیس انکل کو اس نے ان کے گھر سے پک اپ کیا، سارا راستہ وہ ان سے ان کی فیکٹری کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ وہ دونوں سائٹ پر پہنچے تو گاڑی سے اترتے ہوئے اے اپنے موبائل کا خیال آیا۔ وہ موبائل اپنے آفس میں بھول آیا تھا۔ اب یہاں پہنچ کر موبائل کو بھول آنے پر سوائے افسوس کے کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ انیس انکل کے ساتھ سائٹ کا معائنہ کرنے لگا۔ لیکن اچانک ہی پتا نہیں انہیں کیا ہوا، ان کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے، یوں جیسے وہ بڑی تکلیف میں ہوں۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ اس نے انہیں سہارا دے کر بٹھایا، انہوں نے خود اپنی جیب سے ایبلٹ نکال کر زبان کے نیچے رکھ لی تھی۔ وہ بہت پرانے ہارٹ پینٹ تھے یہ وہ جانتا تھا۔ لینے کے باوجود بھی ان کی حالت نہیں سنبھلی تھی۔ ایک طرف ان کی اچانک طبیعت خراب ہوئی تھی۔ دوسری طرف زوردار بارش اس نے جلدی سے انہیں گاڑی میں بٹھایا۔ فوراً کسی قریبی ہاسپٹل پہنچ سکے۔ وہ وہاں سے کچھ ہی دور گیا تھا کہ راستے میں اس کی گاڑی خراب ہو گئی۔ بہت کوشش کے باوجود بھی گاڑی اشارت نہیں ہو رہی تھی۔

تنگ آکر اس نے گاڑی کو اس کے حال پر چھوڑا اور جلدی سے باہر نکل کر ٹیکسی ڈھونڈنے لگا۔ گاڑی خراب ایسی سڑک پر ہوئی تھی جو بالکل سنسان تھی۔ بارش کے بعد تو وہاں اور بھی سناٹا ہو گیا تھا۔ اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ مگر کسی ٹیکسی کا کہیں کوئی وجود نظر نہیں آ رہا تھا۔

کر تو کھڑی ہو سکتی تھی۔ میں کوششیں کرتی رہی اس رشتے کو جوڑے رکھنے کی۔ اور اس رشتے کو تو ختم ہونا ہی تھا۔ زندگی نے مجھ سے کہا، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تم خمن کی جگہ لینا چاہتی تھیں تو لو اب۔ یہ لو یہ خمن کا شوہر تمہارا، یہ اس کا بیٹا تمہارا، یہ اس کی جگہ تمہاری۔ اس کی ہر چیز تمہاری ہے۔ اب تم بل بل جینا بل بل مرنے بنالیا میں نے اپنی بہن کی قبر پر اپنی محبت کا محل۔ چھین لی اس سے اس کی ہر چیز۔ خود کو کوڑے ماروں، اپنے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ مٹا دوں خود کو، پھر بھی اس سچائی سے منہ نہیں چھپا سکتی کہ جو زندگی میں کبھی چاہا تھا وہ آخر کار پایا ہے۔ میرا زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن موت مجھے قبول نہیں کرتی۔ لوگ اتنی آسانی سے مر جاتے ہیں، مجھے تو موت بھی نہیں آتی۔“

\*\*\*

ڈاکٹر کے دیے ہوئے انجکشن کی وجہ سے بڑی اور گہری نیند سو رہی تھی۔

سج کے پانچ بج رہے تھے اور نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اس کے پاس سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ہٹا تھا۔ رات جو طوفان آیا وہ اب کھم چکا تھا۔ بارش بالکل رک چکی تھی۔ موسم کل سے زیادہ سرد ہو گیا تھا۔ وہ اس پر نظریں جمائے گزرے کل کی ساری باتیں ایک ایک کر کے سوچتا چلا جا رہا تھا۔ کل کا دن اس کی زندگی کا کیسا دن تھا، کل کی رات اس کی زندگی کی کیسی رات تھی۔ آفس میں اسے بہت کام تھے۔ ایک بہت اہم میٹنگ تھی۔ لیکن اس کا کوئی کام اس کے بیٹے سے زیادہ اہم نہیں تھا، اس نے آفس میں اپنی اس روز کی سب مصروفیات منسوخ کر دی تھیں۔ وہ جلدی جلدی اپنے ضروری کام نمٹانے میں لگا ہوا تھا۔ صبح دس بجے اس کے پاس انیس انکل کا فون آیا۔ وہ بابا کے کالج کے دنوں کے بہت اچھے دوست تھے۔ بابا کے حوالے سے ارنلڈ کی بھی ان سے بہت اچھی اندر امیدنگ تھی۔ اس سچ بھی انہوں نے



اس نے ایک دوپڑا سوٹ گاڑوں کو ہاتھ کے اشارے سے روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں رکیں۔ ادھر گاڑی میں انیس انگل کی حالت خراب تھی۔ ادھر وہ سڑک کے آخری کونے تک ٹیکسی کی تلاش میں بھاگتا پھر رہا تھا۔ بڑی بدوجہد کے بعد وہ ٹیکسی لے کر آنے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہ لوگ ہاسپٹل پہنچے انیس انگل کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ انیس فوری طور پر آئی سی یو میں داخل کیا گیا تھا۔ وہ آئی سی یو میں لے جائے گئے اور وہ باہر کھڑا رہا۔ تب پہلی مرتبہ اسے گھڑی دیکھنے کا خیال آیا۔ گھڑی ساڑھے سات بج رہی تھی۔ اسے معاذ کا خیال آیا۔ انیس انگل کی طبیعت بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ ان کی بیوی اور بیٹی امریکہ گئی ہوئی تھیں وہ آج کل یہاں بالکل تنہا رہے تھے۔ ان کے کسی قریبی عزیز کی غیر موجودگی میں اس حالت میں انیس اکیلا چھوڑ کر آنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے صبا کی فکر تھی۔ اسے معاذ کی فکر تھی۔ اسے معاذ کی ناراضی کی فکر تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اسے انیس انگل کی فکر تھی۔ وہ گھڑی کرنے آیا تاکہ صبا اور معاذ اس کے لیے پریشان نہ ہوں۔ شام پانچ بجے آنے کا وعدہ کرنے والا اگر ساڑھے سات آٹھ بجے تک نہ آئے اور اپنے بارے میں کوئی اطلاع بھی نہ دے تو گھر والوں کی پریشانی لازمی ہے۔

ریسپشن پر آکر اس نے گھڑی کی لائن انگیج تھی۔ اس نے دوبارہ کیا دوبارہ بھی انگیج تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب صبا، رضا اور پھر اس کے بعد ار ترضی کے تمام جاننے والوں کو فون کر رہی تھی۔ اس نے کتنی مرتبہ ٹرائی کیا۔ ہر بار لائن انگیج ملی۔ وہ واپس آئی سی یو کے باہر آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ سوچ کر کہ تھوڑی دیر میں پھر ٹرائی کروں گا۔ پھر جب اس نے جا کر ٹرائی کیا تو لائن مل گئی۔ ٹیل بالکل ٹھیک جا رہی تھی وہ مطمئن ہو گیا۔ اس کے حساب سے تو پہلی ہی ٹیل پر کال ریسیو کی جانی چاہیے تھی۔ اس کی پریشانی میں وہ یقیناً "فون کے بالکل پاس ہی بیٹھی ہوگی۔ مگر وہاں تو ٹیل پر ٹیل جا رہی تھی۔ اور کوئی فون سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بہت دیر

تک اس نے ٹیل ہونے دی لیکن کوئی فائدہ نہیں وہ وہیں ریسپشن پر کھڑا رہا۔ اس نے دوبارہ ٹرائی کیا۔ اس بار بھی ٹیل جا رہی تھی اور کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ وہ تنگ آیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ کیا بارش کی وجہ سے گھر کا فون خراب ہو گیا تھا۔ وہ اس حالت میں انیس انگل کو اکیلا چھوڑ کر با نہیں سکتا تھا۔ اور گھر پر اس کا رابطہ ہو نہیں رہا تھا۔ وہ کیا کرے وہ حقیقتاً مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

رضا اور فاترہ کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ دونوں آج دوپہر کسی ضروری کام سے اسلام آباد چلے گئے ہیں۔ اگر وہ ہوتے تو وہ رضا سے ہی کانٹیکٹ کر لیتا۔ اللہ اللہ کر کے انیس انگل کی طبیعت سنبھلی تھی۔ وہ اب مزید ان کے پاس نہیں رک سکتا تھا۔ پہلی فرصت میں وہ ٹیکسی سے گھر واپس آیا تھا۔ اس نے صبا کی پریشانی کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا۔ وہ اسے کتنا بھی اگور کرتی تھی کتنا بھی مس لی ہو کرتی تھی اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ سب باتیں بھول کر اس وقت وہ صرف اس کے لیے پریشان ہو رہی ہوگی۔ وہاں آکر جو اس نے دیکھا وہ اس کی توقعات سے جی زیادہ سنگین تھا۔

وہ اب سوچ رہا تھا کہ کل جو جو کچھ بھی ہوا وہ سب محض اتفاق نہیں تھا۔ تقدیر نے کل کے دن کے واقعات اسی ترتیب سے رقم کیے تھے اتنے سارے اتفاقات۔ اسے مان لینا پڑا کہ جب تقدیر کو کسی کام کو انجام دلوانا ہوتا ہے تو وہ اس کے لیے اسباب بھی خود ہی پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ کل رات جو کچھ ہوا وہ ہونا چاہیے تھا اور اسے ضرور ہونا چاہیے تھا۔

زندگی ایک ہی رات میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اسے صبا کی کسی بات پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ پہلے سے جانتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور اب اس محبت کو چھپانے کے لیے نفرت کا اعلان کرتی ہے۔ باقی باتیں وہ نہیں جانتا تھا۔ صبا کے دشمن کے لیے جذبات اس کا ارتضیٰ اور دشمن کی شادی پر رد عمل دشمن کے مرنے کے بعد کی اس کی سوچیں اس کی ندامت اس



بے تکلفی سے اس کے برابر میں بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔  
اسے اس کا وہ انداز بڑا کیوٹ لگتا تھا۔ اسے معلوم تھا  
اس کا صرف قد لمبا ہوا ہے۔ اندر سے وہ اتنی ہی چھوٹی  
ہے جتنی پہلے تھی۔ وہ ویسی ہی شرارتی تھی۔ وہ ویسی ہی  
ضدی تھی۔ وہ کتنی بھی بڑی ہو جاتی ار تفضی کے لیے  
اسے ہمیشہ بھی رہتا تھا۔

پھر اس کی زندگی میں ثمن آئی۔ ار تفضی کو وہ بہت  
اچھی لگی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگا۔ اس نے ثمن  
سے شادی کا فیصلہ کیا۔ کتنا خوش تھا وہ ثمن کے ساتھ  
مٹگنی ہونے پر، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی زندگی  
میں صبا کی اہمیت میں بھی کوئی کمی نہیں آئی۔ ثمن کے  
لیے وہ وہ تحفہ خریدتا جو اس کا دل چاہتا کہ وہ ثمن کو  
دے۔ اور صبا کے لیے وہ وہ چیز خریدتا جو صبا کو پسند  
ہوتی۔ بعض دفعہ صبا کی پسند کی چیز اسے بڑی مشکل  
سے ملتی۔ اس کی پسند کی چیزیں کتنی بچکانہ سی ہوتی  
تھیں۔ لیکن انہیں ڈھونڈتے اور خریدتے ہوئے کبھی  
اسے یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک بے کار اور  
احتمالاً کام میں اپنا وقت برباد کر رہا ہے۔ سیدھے  
سیدھے اپنی مرضی سے کوئی بھی چیز خرید لے اسے  
تحفے میں دینے کے لیے۔

صبا کی شادی ناکام نہ ہوتی تو شاید وہ کبھی اس بات کو  
جان ہی نہ پاتا کہ صبا حقیقت میں اس کے لیے ہے کیا۔  
صبا کے ساتھ اس کا انوکھا بندھن تھا۔ اس میں نہ  
ہجر تھا نہ وصال، اس میں نہ پانے کی خواہش تھی نہ  
کھودینے کا ملال، اس کی صرف ایک خواہش تھی صبا  
ہمیشہ خوش رہے۔ اسے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اس  
نے زندگی میں کبھی کسی شخص سے اتنی نفرت نہیں کی  
جتنی سفیر فیروز سے کی۔ وہ ہر اس شخص سے انتہائی  
حدوں تک نفرت کرتا تھا۔ جو صبا کو تکلیف دے۔

صبا کو یاد نہیں کہ اسے ار تفضی غنغنفر سے پہلی بار  
محبت کب ہوئی۔ لیکن اسے یاد تھا۔ وہ آٹھ اپریل  
تھی۔ شام کا وقت تھا۔ جب اس نے پہلی بار صبا کو  
دیکھا تھا۔ سات سال کی عمر میں اس نے اس لڑکی سے  
محبت کرنا شروع کر دی تھی۔

اس نے صبا سے شادی کی خواہش کا اظہار صرف  
مما کے آنسوؤں اور ڈیڈی کی اداسیوں کو دیکھتے ہوئے  
کیا۔

لیکن صبا اس شادی کو ماننے کے لیے تیار نہیں  
تھی۔ وہ اس رشتے سے نفرت کرتی تھی۔ وہ صبا کے  
اس رد عمل کی وجہ ڈھونڈنے میں لگا رہا۔

وہ کم عمر اور جذباتی سی لڑکی جسے وہ چھوٹی سی بچی  
سمجھتا تھا اس کے ساتھ آخر اس کا رشتہ تھا کیا؟ اس  
کے بہت اندر چھپی تھی یہ بات۔ اتنے اندر کہ کبھی خود  
اس پر ہی منکشف نہ ہو سکی۔ صبا کے اعتراف نے  
اسے ہلا دیا تھا۔ اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے زندگی  
میں کبھی بھی کسی عورت کے آنسوؤں سے اتنی  
تکلیف نہیں ہوتی تھی جتنی صبا کے آنسوؤں سے  
ہوتی تھی۔ اور اس وقت بھی وہ اسی تکلیف سے  
گزر رہا تھا۔ اس وقت جب وہ اس کے کندھے پر سر  
رکھ کر رو رہی تھی۔

اس نے ایک پل کے لیے بھی نہیں سوچا۔ وہ صحیح  
تھی یا غلط، وہ اچھی تھی یا بری۔ وہ صبا تھی۔ اس نے  
زندگی میں جو کچھ کیا، وہ سب غلط تھا۔ تب بھی وہ اس  
کے لیے وہی صبا تھی۔ وہ اس کے بارے میں اپنے  
سوچنے کا انداز تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔

صبا کی طرف دیکھتے دیکھتے اس نے اپنی اور ثمن کی  
تصویر کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بیڈ روم جو اس نے  
ثمن کے لیے بڑی محبت سے سجایا تھا۔ اس میں لگی  
اپنے ہنسی میون کے دنوں کی یہ یادگار تصویر اسے کس  
قدر پسند تھی۔ وہ کرسی پر سے ایک دم ہی اٹھا تھا۔  
آہستہ قدموں سے چلتا ہوا وہ اب اس تصویر کے  
سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہیں ثمن کے  
چہرے پر جمی تھیں۔

”ثمن! میں نے نہ زندگی میں کل تم سے جھوٹ  
بولتا تھا اور نہ آج بولوں گا۔ تم میری زندگی میں آنے  
والی سب سے اچھی لڑکی تھیں۔ تم اس دنیا کی لگتی ہی  
نہیں تھیں۔ تم کسی اور دنیا کی لگتی تھیں۔ کسی  
پریوں کے دیس کی شہزادی، جو رستہ بھول کر ہم انسانوں



کی دنیا میں آگئی تھی۔ ثمن! آج مجھے یہ اعتراف کر لینے دو کہ میں نے تم سے تمہاری خوبیوں کی وجہ سے محبت کی تھی۔

اگر تم میں یہ تمام خوبیاں نہ ہوتیں تو میں کبھی تمہاری محبت میں مبتلا نہ ہوتا اور صبا؟ صبا میرے لیے کیا ہے؟

صبا مجھے اس لیے اچھی لگتی ہے کیونکہ وہ صبا ہے۔ وہ اچھی ہے یا بری۔ اس میں خوبیاں ہیں یا خامیاں، وہ صحیح ہے یا غلط، میں پھر بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارے ساتھ دل کا رشتہ تھا ثمن، تو صبا کے ساتھ میرا روح کا رشتہ ہے۔ یہ محبت کا کون سا انداز ہے میں نہیں جانتا۔ یہ عشق ہے، یہ جنون ہے۔ یہ کیا ہے، مجھے نہیں معلوم۔

\*\*\*

ار تفضی کو کمرے میں آتا دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔  
”کیسی طبیعت ہے صبا؟“ وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب آیا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے بہت آہستہ آواز میں اسے جواب دیا۔

”یہ دیکھو چیز سینڈوچز بنائے ہیں، میں نے تمہارے لیے کھا کر بناؤ کیسے بنے ہیں۔“ وہ ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے اس کے برابر میں بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموشی سے ٹرے کی طرف دیکھنے لگی۔

”لو ناں صبا! میں نے اتنی محنت سے تمہارے لیے سینڈوچز بنائے ہیں اور میرا دعویٰ ہے کہ یہ سینڈوچز تمہیں بہت پسند آئیں گے۔“ اس نے پلیٹ میں سے سینڈوچ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں پکڑایا۔ اس نے کھانا شروع کر دیا۔

”کو مزے کا ہے کہ نہیں۔“ اس سے جواب میں کچھ بھی نہیں بولا گیا۔ نوالہ اس کے حلق میں پھنسنے لگا تھا۔ حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا لگنے لگا تھا۔

”یہ کافی بھی تو ہو، تمہارے جیسی مزے کی کافی تو میں کبھی نہیں بنا سکتا۔ بہر حال یہ کافی بھی اتنی بری

نہیں ہے۔ میرے حساب سے یہ میری بہترین کاوش ہے۔“

وہ اس کی کیفیت سے انجان بنا کافی کا ٹک اٹھا کر اسے دینے لگا۔ اس شخص کے سامنے وہ اپنی اصلیت اس پر ظاہر کر کے پشیمان نہیں تھی۔ وہ ایسا سکون محسوس کر رہی تھی جیسے ایک باضمیر مجرم اعترافِ جرم کے بعد کرتا ہے۔

لیکن یہ شخص... وہ اس شخص کو کیا کہے۔ اس کی سب باتوں کو سننے کے بعد بھی اس کا اس کے ساتھ وہی انداز تھا۔ وہی نرم اور شیریں لہجہ، وہی چہرے پر مسکراہٹ۔

اس نے اپنے برابر میں بیٹھے اس شخص کی طرف دیکھا۔

”میری یاں اگر تم پر اندھا اعتماد کرتی تھی تو بالکل ٹھیک کرتی تھی۔ تم واقعی میرے لیے ایک سالیہ دار شجر کی مانند ہو۔ تم نے میرے اتنے بڑے گناہ کو معاف کر دیا۔“

”اتنے اچھے کیوں ہو ار تفضی غصہ؟ تمہیں میری کوئی بات بری کیوں نہیں لگتی؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ اس نے ار تفضی پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔

”معاذ کو زبردستی لیج کر آئے ہو۔ بہت ناراض ہے مجھ سے۔ بالکل بات نہیں کر رہا۔ تم اپنی طبیعت جلدی سے ٹھیک کر لو نا کہ پھر ہم کہیں باہر جا سکیں اور معاذ کا موڈ ٹھیک ہو۔“ وہ اس کی سوچوں سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔ اسے صبا کے چہرے پر جیسے کچھ نظر آ رہی نہیں رہا تھا۔ اس نے ار تفضی پر سے نظریں ہٹالیں۔ وہ اب خاموشی سے سینڈوچ کھا رہی تھی۔ سینڈوچ ختم کر کے اس نے کافی کا ٹک بھی پورا خالی کر دیا تھا۔

”بس ایک سینڈوچ؟ اور لو نا۔“

”میں کھا چکی۔“ اس نے پہلے سے بھی ہلکی آواز میں جواب دیا۔

اس نے مزید اصرار کیے بغیر ٹرے سامنے سے ہٹا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف



دیکھنے لگا تھا۔ وہ اس کی نظریں محسوس کر رہی تھی لیکن اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا نہیں تھا۔

”تم ثمن سے بہت محبت کرتی ہو۔ تمہارے یقین والے بغیر بھی ہر بات مجھے معلوم ہے۔ تم نے خود کو سزا دی اس بات پر کہ جس سے تمہیں اتنی محبت تھی اس کے بارے میں لمحہ بھر کے لیے بھی تمہارے دل میں برے خیال کیوں آئے تھے۔“ صبا نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ثمن تمہاری وجہ سے نہیں مری تھی صبا! یہ کاتب تقدیر کا فیصلہ تھا۔ وہ حادثہ تمہاری وجہ سے نہیں ہوا تھا۔ اور نہ تم کوئی بہت پہنچی ہوئی اور بزرگ ہستی ہو کہ کسی کو بددعا دو اور وہ اسے لگ بھی جائے۔ تمہیں صرف ہماری شادی ہونا اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن اسے ہونے سے روکنے کے لیے تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ تم ہم دونوں کے بیچ غلط فہمیاں پیدا کروا سکتی تھیں۔ تم مجھ سے بھی ثمن کے خلاف بہت کچھ کہہ سکتی تھیں۔ تم بڑی آسانی سے ہمارے درمیان لڑائی کروا سکتی تھیں۔ لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔

صرف محبت کرنا جرم نہیں ہاں اپنی محبت کے حصول کے لیے غلط راستہ اختیار کرنا ضرور جرم ہے۔ اور تم اس جرم کی مدد تکب نہیں ہوئی ہو۔ تم نے کچھ غلط نہیں کیا ہے صبا! تم نے ثمن سے کچھ نہیں چھینا۔ تمہاری مجھ سے شادی ہونا ہماری قسمت میں لکھا تھا۔“

اس کا اسے سمجھانے کا وہی انداز تھا جو ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔ وہ اب خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند سیکنڈز کی خاموشی ان کے درمیان آئی تھی۔ پھر اس خاموشی کو ارتعاش ہی نے توڑا۔

”کل تم نے مجھ سے کچھ سوالات کیے تھے۔“ بولتے ہوئے اس نے بڑی آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

”تمہارے ان سوالوں کا جواب دینا چاہتا ہوں صبا! اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ مضبوط سچ بولا۔ وہ ٹمکنی باندھے اسے دیکھ رہی تھی۔

میں تمہارا خیال اس لیے رکھتا تھا کیونکہ تمہارا خیال ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا۔ تمہیں اہمیت اس لیے دیتا تھا کیونکہ تم میرے لیے بہت اہم تھیں۔ تمہارے لیے اس وجہ سے جیتتا تھا کیونکہ تم میرے جیتنے سے خوش ہوتی تھیں۔ تمہاری خوشی مجھے اپنی خوشی لگتی تھی۔

جس توجہ جس خیال کرنے کو تم محبت سمجھتی تھیں وہ محبت تھی وہ بالکل ویسی ہی محبت تھی جیسا تم اسے سمجھتی تھیں۔“

وہ ایک ایسی بات اسے بتا رہا تھا کہ وہ آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی لیے پلکیں جھپکائے بنا اسے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اس نے اس کی آنکھوں کی حیرت اور بے یقینی کو فوراً پڑھ لیا تھا۔

”تم جانتی ہو صبا کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اگر مجھے تم سے محبت تھی تو میں نے ثمن سے شادی کیوں کی؟ میں یہ بات تمہیں نہیں سمجھا سکتا۔“

محبت ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کی ہے۔ مگر ہماری محبت کا انداز بہت مختلف تھا۔ تمہاری محبت حق جتانے والی تھی ملکیت سمجھنے والی تھی۔

اور میں چاہتا تھا کہ تم سے ہر کوئی محبت کرے۔ بالکل ویسی جیسی میں کرتا ہوں۔ کتنی دعا میں مانگی تھیں میں نے کہ سفیر تمہارا اسی طرح خیال رکھے جیسا میں رکھتا ہوں۔ وہ تم سے محبت کرتا، تم اس کے ساتھ خوش رہتیں تو مجھے ایک پل کے لیے بھی افسوس نہ ہوتا۔ ہمارے محبت کرنے کا انداز مختلف تھا صبا لیکن ایک دوسرے سے محبت ہم ایک جتنی ہی کرتے تھے۔ میری زندگی کے تمام سالوں میں سے صرف سات سال نکال دو۔ ان شروع کے سات سالوں کے بعد پھر ساری زندگی میں نے تم سے محبت کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔

تمہارے ساتھ جو میرا رشتہ ہے صبا! وہ بہت ہی عجیب رشتہ ہے۔ اسے میں کوئی نام دے نہیں پا رہا۔ وہ اپنے دل کی تمام تر سچائیوں اور گہرائیوں کے ساتھ اس سے مخاطب تھا۔ صبا کی آنکھوں کی بے یقینی



تم ہو چکی تھی۔ وہاں اب صرف حیرت تھی۔  
 "ایک بار ایسا ہوا تھا صرف ایک بار۔ جب میں  
 تمہارے لیے نہیں جیتا تھا۔ کیونکہ میرے ہارنے سے  
 شمن خوش ہوئی تھی۔ بڑا خوش تھا میں ہار کر لیکن  
 تمہارے آنسوؤں نے میری اس خوشی کو بہت جلد  
 اسی میں بدل دیا تھا۔

اور ایسا زندگی میں ہمیشہ ہوا ہے صبا، وہ خوشی جس  
 کے راتے میں صبا کے آنسو آتے ہوں۔ وہ خوشی پھر  
 مجھے کبھی بھی خوشی نہیں دے سکتی۔ یہ سچ ہے کہ شمن  
 کبھی میرے دل سے نہیں نکل سکتی لیکن اس سے  
 بھی بڑا سچ یہ ہے کہ میری زندگی میں جو جگہ اور جو مقام  
 تمہارا ہے وہ کسی کا بھی نہیں۔

تمہارے لیے میرے دل نے کبھی کوئی منطق نہیں  
 مانی۔ تم برے سے برا اور غلط سے غلط کام بھی کرو گی تو  
 میں اسے غلط سمجھنے کے باوجود بھی تمہارا ساتھ دینے پر  
 خود کو مجبور پاؤں گا۔"

وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بڑے یقین سے بول  
 رہا تھا۔ اور صبا کو کیا ہوا تھا اس پل وہ ہار گئی تھی خود  
 سے۔

ار تفضی کہہ رہا تھا کہ وہ اپنا دل نہیں بدل سکتا۔ اور  
 صبا پر اچانک ہی انکشاف ہوا کہ وہ بھی اپنا دل نہیں بدل  
 سکتی۔ وہ خود سے کچھ بھی کہے۔ کتنے بھی جھوٹ  
 بولے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ آج بھی اسی شخص سے محبت  
 کرتی ہے۔ جو چیز اس کے بس میں نہیں تھی۔ اس  
 کے لیے وہ خود پر گرفت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی  
 آنکھوں سے یک دم ہی آنسو بہنے لگے تھے۔ اپنی  
 برسوں کی تھکن اتارنے کے لیے اسے وہ کندھا میسر تھا  
 جس پر سر رکھ کر وہ اپنے سارے آنسو بہا سکتی تھی۔  
 اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

بابا اور ڈیڈی ان لوگوں کی اتنی جلد واپسی پر بہت  
 حیران تھے۔

"بس آپ دونوں مجھے بہت یاد آرہے تھے۔ اس  
 لیے ہم واپس آ گئے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے بابا سے کہا۔

"خیر، تم لوگ جلدی آ گئے تو ایک طرح اچھا ہی  
 ہوا۔ برسوں رات ظفر کا فون آیا تھا۔ وہ لوگ پاکستان  
 آرہے ہیں۔" بابا نے ان لوگوں کو اطلاع دی۔  
 "واقعی؟" وہ ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"ہاں ظفر واپس آ رہا ہے۔ ہمیشہ کے لیے۔ اس گھر  
 کے کلین واپس اپنے گھر آرہے ہیں۔ یہ گھر پھر سے آباد  
 ہونے والا ہے۔" ڈیڈی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی،  
 خوشی تھی اطمینان تھا۔ زندگی جس طرح ایک روز  
 اچانک اس گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ اسی طرح  
 اچانک واپس بھی آ گئی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد سب اپنے کمروں میں  
 چلے گئے تھے۔ وہ ار تفضی کے لیے کافی بنانے کچن میں  
 آئی تھی۔ کافی بنا کر وہ کچن سے نکلی تو اس کی نگاہ لاؤنج  
 میں لگی اس تصویر پر پڑی۔ وہ اس تصویر سے نگاہیں  
 چرانے کے بجائے بڑی بے ساختگی میں اس کے قریب  
 آ گئی۔

اس نے اپنی نگاہیں شمن کے چہرے پر جمادی  
 تھیں۔

"مجھے بتا ہے تم مجھ سے ناراض نہیں ہو۔ پھر بھی  
 میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" وہ ایک قدم مزید بڑھا  
 کہ اس تصویر کے بالکل نزدیک آ گئی۔

"محبت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی شمن! میں  
 ار تفضی غصہ منہ سے محبت کرتی ہوں شمن! میں معاذ  
 ار تفضی سے محبت کرتی ہوں شمن! لیکن میں ان سے  
 صرف محبت کرتی ہوں۔ ان پر اپنا کوئی حق نہیں  
 سمجھتی۔ تمہارا شوہر اور تمہارا بیٹا میرے پاس تمہاری  
 امانت ہیں۔ اور اگر قیامت کے دن ایسا کرنا ہم انسانوں  
 کے بس میں ہوا، تو تمہاری یہ امانت میں خوشی خوشی  
 تمہیں لوٹا دوں گی۔"

اس تصویر کے پاس سے ہٹ کر اس نے اپنے قدم  
 سیڑھیوں کی طرف بڑھا دیے تھے۔ اس کے یہ قدم  
 اس کمرے کی طرف جانے کے لیے اٹھ رہے تھے  
 جہاں جاتے ہوئے آج اسے کوئی ندامت نہیں تھی۔